نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے

اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

احترامِ آدمیت

مرتب

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

صدر مرکز تحقیق

ناشر فیض رضا پبلیکیشنز جامعہ قادریہ رضویہ (ٹرسٹ) مصطفےٰ آباد سرگودھا روڈ فیصل آباد

PH:041-8860777

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ
مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

(بنی اسرائیل:۷۰)

ترجمہ

اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی اور ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کو ستھری چیزیں روزی دیں اور ان کو اپنی بہت مخلوق سے افضل کیا۔

(کنزالایمان)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے

اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

احترامِ آدمیت

مرتب

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

صدر مرکزِ تحقیق

ناشر: فیض رضا پبلیکیشنز جامعہ قادریہ رضویہ مصطفےٰ آباد سرگودھا روڈ فیصل آباد

PH:041-8860777

اِنتساب

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کے

اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

احترامِ آدمیت کے مخلص علمبرداروں کے نام

کتاب: نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں احترام آدمیت

مرتب: پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

تعداد: 1000 2008ء

مطبع: البغداد پرنٹرز فیصل آباد فون:41-2602723

سرورق محمد اجمل (خطاط القرآن) عدیل الرحمٰن اطہر

کمپوزنگ: ملک مون شہزاد

اہتمام: صاحبزادہ عطاء المصطفیٰ نوری

(مہتمم جامعہ قادریہ رضویہ ٹرسٹ فیصل آباد)

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ نمبر
1	حرف سپاس	ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی	9
2	احترام آدمیت کی قرآنی بنیادیں	ڈاکٹر ظہور احمد اظہر	31
3	احترام آدمیت' تقاضے' حدود' معاشرتی رویے۔ عصر حاضر کے خصوصی تناظر میں	ڈاکٹر محفوظ احمد	45
4	احترام انسانیت' صوفیاء کے افکار و تعلیمات کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس	65
5	احترام آدمیت' اسوۂ رسول اکرم ﷺ کی روشنی میں	محمد واصل اویسی	89
6	طبقاتی تعصبات اور ان کا حل	پروفیسر محمد یوسف صابر	107
7	طبقاتی اور لسانی تعصبات کا حل	پروفیسر ڈاکٹر سید قمر علی زیدی	131
8	رواداری' اسوہ حسنہ کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد طفیل	145
9	علاقائی' نسلی' طبقاتی اور لسانی تعصبات کا حل۔ انسان دوستی اور باہمی رواداری کے حوالے سے علماء و صوفیاء کا کردار	مولانا محمد صدیق ہزاروی	159
10	علاقائی' نسلی' طبقاتی اور لسانی تعصبات۔ نبی اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی	171
11	مسلم معاشرے کے خدوخال	پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین آزاد	193
12	مسلم اور غیر مسلم شہریوں کا حق اول۔ جان کی حرمت و حفاظت	پروفیسر قاری محمد اقبال	279
13	عالمی سطح پر مسلمانوں کو درپیش تہذیبی مسائل اور ان کا حل سیرت طیبہ کی روشنی میں	محمد اسلم الوری	299

14	باہمی تعلقات کے لئے بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت 'اہمیت' ترجیحات اور تقاضے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں	محمد اکرم ورک	319
15	بین المذاہب مکالمہ	ڈاکٹر محمد طفیل	353
16	بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت واہمیت	ڈاکٹر محمد عبداللہ صالح	377
17	مکالمہ بین المسالک	ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس	389
18	معاشرتی زندگی میں عورت کا مقام ومرتبہ	محمد اکرم ساجد	409
19	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں عورتوں کے مسائل اور ان کا حل	قاضی محمد غوث	425
20	سیرت طیبہ کی روشنی میں عورت کا مقام اور دائرہ کار	پروفیسر شہباز احمد قاضی	441
21	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں عورتوں کے حقوق	پروفیسر بشیر احمد رضوی	467
22	عورتوں کے مسائل اور ان کا حل	ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج	499
23	سماجی برائیوں کے انسداد کے لئے خواتین کا کردار (تعلیمات نبوی کی روشنی میں)	ڈاکٹر محمد سجاد	531

حرف سپاس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

حرف سپاس

اللہ تعالیٰ کا ہزار بار شکر ہے کہ اُس مُدبّر کائنات نے ہم ایسے کوتاہ فہم اور دوں ہمت احباب کو پھر سے توفیق بخشی کہ ہم مرکز تحقیق فیصل آباد کے مقرر اہداف کی طرف ایک اور پیش قدمی کر سکیں۔ ہم نے مرکز تحقیق فیصل آباد کی ابتداء ان نیک تمناؤں سے کی تھی کہ ہم ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کے حل میں مقدور بھر خدمت ضرور انجام دیں گے ہم نے اس وقت عرض کیا تھا۔

"اسلامی تعلیمات کی روشنی اور سیرت طیبہ کی راہنمائی میں پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرنا ہر صاحبِ علم و دانش پر لازم ہے اس لئے کہ یہ یقین ہر ایمان والے میں ودیعت ہے کہ اسلام ہر دور کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے یہ یقین ہی پرورشِ خیر کا محرک اور اصلاح کا ضامن ہے ضرورت اس پر عمل کرنے اور اس کو بروئے کار لانے کی ہے یہ تب ہی ممکن ہو گا جب ماخذ تک رسائی کا ولولہ اور استخراج کی صلاحیت کی قوت نمایاں ہو گی۔ حیرت ہے کہ مادی سرفرازی اور آسائشوں کی بہتات سے فیض یاب ہونے والا بھی سماجی ہم آہنگی حاصل نہیں کر سکا۔ اس اضطراب نے ایک میلان کو جنم دیا ہے مجبوراً ہی سہی قافلۂ انسانیت ایک مضبوط تصور کے ساتھ اسلام کی آفاقی تعلیمات کی طرف بڑھ رہا ہے، آثار ہویدا ہو رہے ہیں، حساس نوعیت کے لیے دعوتِ فکر و عمل دے رہے ہیں اس موقع پر احتیاط لازم ہے کیونکہ ذرا سی غفلت معمولی سی بے اعتدالی اور ہلکی سی خام خیالی مہلک ہو سکتی ہے اور اسلام کی راحت بخش تعلیمات سے دور لے جا سکتی ہے۔ غور کیجئے کیا تشدد پسندی کے موجودہ رجحان نے اسلام کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک نہیں لئے؟ اور کیا مومن کی

امن پسندی اور مسلمان کی سلامت روی کا تابندہ چہرہ دھندلا نہیں رہا؟ اصحابِ درد پر واجب ہے کہ دین اسلام کے حوالے سے بہبودِ انسانیت کا روّیہ سامنے لائیں اور امن عالم کی کفالت کا حق ادا کریں۔اس سلسلے میں علمی افق پر محبت و یگانگت کے فانوس روشن کرنا ضروری ہے اسلامی تعلیمات کو سیرت مطہرہ کے اُجلے حوالوں کے ساتھ نقد و تحقیق کے اعلیٰ معیار کے ساتھ پیش کرنا لازم ہے۔یاد رہے کہ کوتاہی صرف پیش کش کی ہے تعلیمات کی پختگی اور ضوابط کی ہمہ جہتی کی نہیں ہے۔ادائے فرض کے اسی جذبہ نے تحریک دی کہ ارباب تحقیق کو ایک مرکز مہیا کیا جائے۔چند دردمند اہل علم مدّت سے اس مرکز کے حوالے سے کوشاں رہے، غور و فکر جب ایقان کی حدّت سے منور ہوا تو مرکز تحقیق کی تشکیل کا فیصلہ کر لیا گیا۔مرکز تحقیق کے قیام کا مقصد صرف یہی ہے کہ ارباب فکر و حکمت اور اصحاب نقد و تحقیق کو اشتراکِ عمل کی دعوت دی جائے تا کہ پیغامِ رحمت کے عملی نفاذ کی راہیں تلاش کی جاسکیں یہ اشتراکِ عمل اس لئے ضروری ہے کہ مجموعی فکر بہر صورت زیادہ نتیجہ خیز اور آثر آفریں ہوتا ہے۔مرکز تحقیق اسی اشتراک کیلئے جدوجہد کرے گا۔

مرکز تحقیق کے اہداف میں یہ مرکزی خیال موجود ہے کہ علمی موضوعات، درپیش مسائل اور تحقیق طلب مواد پر علمی و تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی جائے اس مطلوب ہدف کو حاصل کرنے کیلئے فکری نشستوں اور علمی مباحثوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لئے 23 اور 24 مئی 2004ء کو ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔یہ مرکز تحقیق کا پہلا علمی سیمینار تھا جس کے دوروز کے چار اجلاسوں کے لئے چار موضوعات کا انتخاب کیا گیا اور سیرت مطہرہ کے سایوں میں عصر حاضر کے بعض سلگتے ہوئے مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے الحمدللہ یہ سیمینار نہایت کامیاب رہا۔ارباب علم و دانش اور اصحاب وقار و مرتبہ نے بھرپور تعاون فرمایا۔چار نشستوں میں اکیس مقالات پیش کئے گئے اور خوش گوار حیرت

ہوئی کہ سامعین کثیر مقدار میں شریک ہوئے اور انہوں نے نہایت توجہ سے علمی مقالات کو سماعت فرمایا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ علمی حلقوں میں ایسے سیمینار کا ذوق موجود ہے۔ یہ سب مقالات کتابی شکل میں شائع کیے گئے جس پر علم دوست احباب نے دلی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ ضرورت تھی کہ ترویج دانش کا یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہتا مگر بعض مجبوریوں نے اس تیز رفتاری کا مظاہرہ نہ کرنے دیا جو ہمارا مطلوب تھا۔

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں شکر اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمہ گیر رحمت نے کچھ تاخیر کے باوجود ایک بار پھر میدان تحقیق میں آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اراکین مرکز نے مصمم ارادہ کرلیا کہ حالات کی ناسازگاری کا عزم کے ساتھ مقابلہ کریں گے اس عزم کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہوا۔ تین اور چار جون 2006ء کو مرکز تحقیق فیصل آباد دوسرے دو روزہ قومی سرت سیمینار کے انعقاد کا اہل ٹھہرا۔ چناب کلب فیصل آباد کے وسیع اور پُر وقار لائل پور ہال میں سیمینار کی چار نشستیں سامعین کرام کی توجہ کا ایک بار پھر مرکز بنیں۔

تین اور چار جون 2006ء کو منعقد ہونے والے سیمنار کا اساسی موضوع تھا۔

"نبی اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں احترام آدمیت"

اس مرکزی موضوع کی روشنی میں چار ضمنی عنوانات قائم کیے گئے اور مختلف نشستوں میں مقالہ نگار اصحاب علم نے ان کے حوالے سے گفتگو فرمائی جس کی مختصر ترتیب یہ ہے:۔

پہلا اجلاس (تین جون 2006ء بروز ہفتہ 10 بجے صبح تا 1:00 بجے دوپہر)

موضوع تھا "احترامِ آدمیت، تقاضے، حدود، معاشرتی روّیے، معاشی روابط، عصر حاضر کے خصوصی تناظر میں"

دوسرا اجلاس (تین جون 2006ء بروز ہفتہ 3 بجے تا 6 بجے شام)

موضوع تھا "علاقائی، نسلی، طبقاتی اور لسانی تعصبات کا حل، انسان دوستی اور

باہمی رواداری کے حوالے سے علماء وصوفیاء علیہم الرحمۃ کا کردار

تیسرا اجلاس (چار جون 2006ء بروز اتوار 10 بجے صبح تا 1:00 بجے دوپہر)

موضوع تھا "مسلم معاشرہ کے خدوخال، مسلم اور غیر مسلم شہریوں کے حقوق، مسلم ریاست کے غیر مسلم ریاستوں سے تعلق، تعلقات باہمی کے لیے بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت واہمیت"

چوتھا اجلاس (چار جون 2006ء بروز اتوار 3 بجے تا 6 بجے شام)

موضوع تھا "عورتوں کے حقوق، معاشرتی زندگی میں عورت کا مقام ومرتبہ، معاشی پیش رفت میں عورتوں کا کردار، تعلیمی کاوشوں میں عورتوں کے فرائض، عصری تقاضوں کے حوالے سے عورتوں کے مسائل اوران کا حل"

دوروزہ سیمینار کی چار نشستوں میں چوبیس مقالات پیش کئے گئے مقالہ نگاروں میں ملک پاکستان کے لائق احترام دانش وراور قابل اعتماد اہل قلم شامل ہوئے جن کی اجمالی فہرست کچھ اس طرح سے ہے:۔

پہلا اجلاس چھ مقالات پیش کئے گئے مگر چار شاملِ اشاعت ہیں مقالہ نگاروں کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

1	ڈاکٹر ظہور احمد اظہر	ڈین علوم اسلامیہ وعربیہ فیصل آباد یونیورسٹی فیصل آباد
2	ڈاکٹر محفوظ احمد	ایسوسی ایٹ پروفیسر اسلامیات جی۔سی یونیورسٹی فیصل آباد
3	ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس	شعبہ اسلامیات جی۔سی یونیورسٹی فیصل آباد
4	جناب محمد واصل اویسی	شعبہ اسلامیات مدرسۃ العقیق الباکستانیۃ بالمدینۃ المنورۃ

ان کے علاوہ ڈاکٹر خالق داد چیئرمین شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر محمد شریف سیالوی چیئرمین شعبہ عربی بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

بھی مقالہ نگاروں میں شامل تھے مگر ان دونوں حضرات کے مقالے اشاعت کیلئے موصول نہیں ہوئے اس لیے اوّل الذکر چار مقالہ نگاروں کے مقالہ جات ہی شاملِ اشاعت ہیں۔

دوسرا اجلاس پانچ مقالات کتاب میں شامل ہیں راقم الحروف نے مقالہ اجلاس میں نہیں پڑھا تھا کہ وقت میں گنجائش نہ تھی مگر شائع کیا جا رہا ہے۔

مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

1 پروفیسر محمد یوسف صابر گورنمنٹ اسلامیہ کالج فیصل آباد

2 پروفیسر ڈاکٹر قمر علی زیدی شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور

3 پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد

4 مولانا محمد صدیق ہزاروی جامعہ نظامیہ اندرون لوہاری گیٹ لاہور

5 ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی صدر مرکز تحقیق فیصل آباد

تیسرا اجلاس سات مقالات پیش کئے گئے مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں:۔

1 ڈاکٹر محمد حسین آزاد القادری سیکرٹری بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن ملتان

2 پروفیسر قاری محمد اقبال صدر شعبہ علوم اسلامیہ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد

3 جناب محمد اسلم الوری ڈائریکٹر ایڈمن پاکستان ایگری کلچر ریسرچ کونسل اسلام آباد

4 پروفیسر محمد اکرم ورک گورنمنٹ ڈگری کالج قلعہ دیدار سنگھ گوجرانوالہ

5 پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد

6 ڈاکٹر محمد عبداللہ صالح شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

7 ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس شعبہ اسلامیات جی۔سی یونیورسٹی فیصل آباد

چوتھا اجلاس چھ مقالات پیش کئے گئے مقالہ نگاروں کے اسماء گرامی یہ ہیں:۔

1 جناب محمد اکرم ساجد جامعہ شیخ الاسلام لاہور

2 قاضی محمد غوث چیف ایڈیٹر ماہنامہ زمزم بہاول پور

3 پروفیسر شہباز احمد چشتی چیف ایڈیٹر ماہنامہ وائس آف ضیاء الاسلام گجرات

4 پروفیسر بشیر احمد رضوی گورنمنٹ کالج پنڈی گھیب ضلع اٹک

ان کے علاوہ دو مقالے موصول ہوئے مگر ناگزیر وجوہ کی بنا پر مقالہ نگار تشریف نہ لا سکے۔ ان مقالات کو شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔

5 ڈاکٹر محمد شکیل اوج استاذ الفقہ والتفسیر شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ کراچی

6 ڈاکٹر محمد سجاد شعبہ اسلامی فکر، تاریخ وتہذیب علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

ان فکری نشستوں کی صدارت کیلئے وطن عزیز کی نامور اور محترم شخصیات تشریف لائیں جن سے ان علمی محفلوں کو وقار حاصل ہوا مثلاً:۔

پہلی نشست کی صدارت جناب پیر طریقت سید محمد انور شاہ گیلانی زیب سجادہ سدرہ شریف نے فرمائی آپ کی موجودگی سے اس علمی فضا کو روحانی تقدس بھی حاصل ہوا۔ پیر صاحب نے مسلسل سرپرستی کی نوید بھی سنائی۔

دوسری نشست کی صدرات وطن عزیز کے عظیم صوفی گھرانے کے چشم و چراغ جناب صاحبزادہ سید سعید الحسن شاہ وزیر مذہبی امور و اوقاف حکومت پنجاب لاہور نے فرمائی۔ آپ نے مرکز تحقیق کے مقاصد سے بھرپور یک جہتی کا اظہار فرمایا اور مسلسل تعاون کا یقین بھی دلایا۔

تیسری نشست کی صدارت کیلئے جماعت اہل سنت کے بطل جلیل، مسند محدث اعظم پاکستان علیہ الرحمۃ کے وارث جناب صاحبزادہ حاجی فضل کریم ایم۔این۔اے، ومہتمم جامعہ رضویہ فیصل آباد تشریف لائے۔ آپ نے اپنے تفصیلی بیان میں مرکز تحقیق کی کارکردگی کو سراہا اور اس مرکز کی مزید کامیابی کیلئے سرپرستی کا اعلان بھی فرمایا۔

چوتھی اور آخری نشست کی صدارت جناب حاجی محمد حنیف طیب سابق وفاقی وزیر نے فرمائی۔ حاجی صاحب کا وجود ملت کے نوجوانوں کیلئے ایک سایہ رحمت ہے۔ آپ نے مسلسل تعاون کا یقین دلایا۔

ان علمی وفکری محافل میں بہت سے اہل علم، صاحب حیثیت اور معزز حضرات نے بطور مہمانان اعزاز اپنی موجودگی کو یقینی بنایا۔ اس سے مرکز تحقیق کو اخلاقی قوت حاصل ہوئی اور وسائل کی فراہمی میں سہولت حاصل ہوئی۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

مہمانان اعزاز:

پہلی نشست	حضرت مفتی منیب الرحمٰن	چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
	ڈاکٹر ظہور احمد اظہر	ڈین علوم اسلامیہ وعربیہ فیصل آباد یونیورسٹی فیصل آباد
	ڈاکٹر رانا محمد اشفاق	ڈین زرعی یونیورسٹی فیصل آباد
	میاں شوکت علی	چیئرمین ستارہ لیبلز فیصل آباد
دوسری نشست	حضرت خواجہ غلام قطب الدین	زیب سجادہ گڑھی شریف
	حضرت مفتی منیب الرحمٰن	چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
	حضرت مفتی محمد خان قادری	جامعہ اسلامیہ ٹھوکر نیاز بیگ لاہور
	ڈاکٹر محمد طاہر رضا بخاری	ڈائریکٹر مذہبی امور حکومت پنجاب لاہور
	جناب شیخ محمد ارشد اچھی	چیئرمین الحمراء ٹیکسٹائلز فیصل آباد

تیسری نشست	ڈاکٹر محمد شریف سیالوی	چیئرمین شعبہ عربی بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان
	جناب میاں محمد رفیع	شمع فیبرکس فیصل آباد
	جناب میاں محمد زبیر	چیئرمین حمزہ ٹیکسٹائل فیصل آباد
چوتھی نشست	جناب حاجی محمد اکبر	چیئرمین شمع ایکسپورٹس فیصل آباد
	ڈاکٹر رحیق احمد عباسی	مرکزی ناظم اعلیٰ ادارہ منہاج القرآن پاکستان لاہور
	سید ہدایت الرسول	مہتمم جامعہ نوریہ رضویہ گلبرگ فیصل آباد
	ڈاکٹر محمد اظہر نعیم	رجسٹرار بارانی یونیورسٹی راولپنڈی
	جناب حاجی بشیر احمد	چیئرمین النور پرنٹ فیصل آباد

سیمینار کی نقابت مرکز تحقیق کے سیکرٹری جنرل جناب ڈاکٹر عبدالشکور انصاری نے فرمائی اور اپنی مہارت سے نظم سیمینار کا خوب خیال رکھا۔

سیمینار کے ہر اجلاس کی ابتداء تلاوت قرآن مجید سے ہوتی رہی مندرجہ ذیل قراء حضرات نے تلاوت کی سعادت حاصل کی۔

1۔ زینت القراء قاری غلام رسول نے پہلے اور افتتاحی اجلاس کا آغاز نہایت پرسوز تلاوت سے کیا۔

قاری غلام رسول وطن عزیز کے ان قراء میں سے ہیں جن سے تلاوت کا ذوق فروغ پایا۔ آپ کی آواز اور ترتیلی پختگی نے نصف صدی سے خراج محبت وصول کیا ہے۔

2۔ دوسرے اجلاس کی ابتداء فیصل آباد کے نامور قاری کرامت علی نعیمی کی پرتاثیر تلاوت سے ہوئی۔ قاری کرامت علی نعیمی عصر حاضر کا معتبر نام ہے جن کی شہرت پاکستان سے باہر تک پھیل چکی ہے۔

3۔ تیسری نشست میں نوجوان مگر پختہ مشق قاری غلام مصطفیٰ نعیمی نے تلاوت کی

سعادت حاصل کی۔

قاری غلام مصطفیٰ نعیمی جامعہ رضویہ کے شعبہ قرأت کے استاد ہیں اور نوجوان نسل میں تلاوت کے ذوق کو پروان چڑھانے کیلئے پُر خلوص محنت کر رہے ہیں۔

4۔ آخری نشست میں تلاوت قرآن پاک کا شرف نوخیز قاری حبیب احمد نعیمی نے پایا۔ قاری حبیب احمد نعیمی فیصل آباد کے استاد قاری جناب قاری منظور احمد کے صاحبزادے ہیں اور بڑی ہمت سے یہ خاندانی شرف برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

سیمینار کی چاروں نشستوں میں قصیدہ بردہ پیش کرنے کی سعادت مرکز تحقیق کے سینئر نائب صدر، مہتمم جامعہ قادریہ رضویہ فیصل آباد جناب صاحبزادہ عطاء المصطفیٰ نوری نے حاصل کی۔ صاحبزادہ نوری کی آواز میں سوز بھی ہے اور سامعین کو اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت بھی ہے۔

سیمینار کی تمام نشستوں میں نعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھرپور اہتمام تھا نعت پڑھنے کی سعادت بالترتیب درج ذیل نعت خواں حضرات کو حاصل ہوئی۔

1۔ شیخ عبدالسلام نقشبندی جن کے محبت بھرے نغمات سے فیصل آباد ہی نہیں پورا ملک فیض یاب ہو رہا ہے نعت کا پڑھنے کا ذوق بھی رکھتے ہیں اور کسی مادی احتیاج کے اسیر بھی نہیں ہیں۔

2۔ پروفیسر عبدالرؤف روفی کا نام تو وطن عزیز کی فضاؤں پر تیرتا ہوا دیگر ممالک تک بھی جا پہنچا ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں نعت پڑھنے کا اثر آفریں سلیقہ آپ کو حاصل ہے۔

3۔ جناب صاحبزادہ فضل الرحمٰن نوری پر کیف اور باادب نعت پڑھنے کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔

4۔ محمد سعد اللہ قریشی ابھی نوخیز ہے مگر معیاری نعت پیش کرنے کا با اعتماد سلیقہ رکھتا ہے۔

سیمینار کے ہر اجلاس سے پہلے مقالہ نگاری کے آغاز سے قبل ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی صدر مرکز تحقیق فیصل آباد نے سیمینار کے انعقاد کے حوالے سے اور موضوع بحث کی مناسبت سے خطبہ استقبالیہ پیش کیا تا کہ سیمینار کے موضوعات کی حدود متعین رہیں اور موضوع کی اہمیت اور ضرورت قائم رہے۔ تلاوت، قصیدہ بردہ، نعت اور خطبہ استقبالیہ کی ترتیب ہر نشست میں قائم رہی اور اس کے بعد مقالہ جات پیش کیے جاتے رہے۔ اس طرح یہ دو روزہ سیمینار عصر حاضر کے اہم تقاضوں اور ملّت اسلامیہ کے درپیش مسائل کے حل کیلئے اہم پیش رفت ثابت ہوا۔ حاضرین و سامعین نے اس علمی و فکری کاوش کو بہت پسند کیا اور اکثر احباب نے اس سلسلے کو مسلسل جاری رکھنے کیلئے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ بعض اہل رائے اور صاحب فکر حضرات نے اس حوالے سے تحریری تاثرات کا بھی اظہار کیا۔ ان تاثرات میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد عبد الحکیم شرف قادری مدظلہ بوجہ علالت سیمینار میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ سابقہ سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کو مرکز تحقیق نے کتابی شکل میں مرتب کیا تھا اور آپ کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ اس پر آپ نے بے حد نقاہت کے باوجود ان لائق احترام کلمات سے نوازا، فرماتے ہیں۔

"آپ کی کوشش اور سرپرستی میں تیار ہونے والا یہ مجموعہ مقالات اللہ تعالیٰ کرے مسلم اُمت کیلئے روشنی کا مینار ثابت ہو اور مرکز تحقیق ایسے ہی جواہر پارے ملت اسلامیہ میں تقسیم کرتا رہے۔"

محترم مفتی منیب الرحمٰن چیئرمین مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی پاکستان قومی سیرت

سیمینار میں تشریف لائے پہلے روز کی دونوں نشستوں میں بطور مہمان اعزاز شریک رہے۔ مفتی صاحب پاکستان کے دینی حلقوں ہی میں نہیں علمی و تحقیقی حلقوں میں بھی لائق احترام وجود کے حامل ہیں۔آپ نے مرکز تحقیق کی کارکردگی کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔آپ نے فرمایا۔

''مرکز تحقیق فیصل آباد کے زیر اہتمام دوروزہ قومی سیرت سیمینار میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔اس علمی، فکری اور نظریاتی سیمینار کی دو نشستوں میں شریک رہا اور اظہار خیال کا موقع بھی ملا اور عالی مرتبت اہل علم کے افکار عالی سے استفادہ کا شرف بھی نصیب ہوا۔ اس سے قبل اہل سنت و جماعت اس طرز سے متعارف نہیں تھے۔محترم ڈاکٹر صاحب نے قبرستان میں اذان دی ہے اور ریگستان و بیابان میں ایک نئی قابل رشک روایت کا پہلا بیج بویا ہے اور پہلا پودا لگایا ہے۔اگر ڈاکٹر صاحب اور ان کے مخلص رفقاء اسی اخلاص، جذبہ عمل، عزیمت و استقامت اور جہد مسلسل کے ساتھ اس پاکیزہ مشن میں جُتے رہے تو امید ہے ان شاء اللہ العزیز یہ سعی مخلصانہ جلد ثمر آور ہوگی اور اس کی خوشبو چہار سو پھیلے گی۔اہل سنت کو ایک ہمہ جہت سعی پیہم اور محنت شاقہ کی ضرورت ہے ہر شعبہ میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء جیسے مردانِ اخلاص کی ضرورت ہے۔ایک انقلابی تحریک کی ضرورت ہے جس میں بے جان نعروں سے زیادہ عمل پر زور دیا جائے، فن کاری نہ ہو بلکہ حقیقت نگاری ہو۔قطرہ قطرہ جمع ہو کر سمندر بن جاتا ہے۔تنکا تنکا جمع ہو کر آشیانہ بن جاتا ہے اور افراد کی ایک پُرعزم جمعیت تیار کر کے انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ میں اللہ عزوجل کی بارگاہ میں ڈاکٹر صاحب کیلئے صحت وسلامتی، ان کی اور اُن کے مخلص احباب کی سعی کے بار آور ہونے کی دعا کرتا ہوں۔اللہ کرے یہ فکر عام ہو، اس روش کو قبول عام ملے، یہ جذبہ بکمال سرعت لوگوں کے قلوب اور اذہان میں جاگزیں ہو۔

سیرت مصطفوی کی یہ شمع انسانی زندگی کے تمام طبقات اور تمام شعبہ ہائے حیات میں ضوفشاں رہے۔ اللہ ان کی سعی جمیل کو مقبول و ماجور اور مشکور فرمائے۔"

جہانِ رضا کے مدیر اعلیٰ اور مکتبہ نبویہ کے مہتمم مشہور اہل قلم اور صاحب دانش محترم اقبال احمد فاروقی کے تاثرات تھے۔

"آپ نے جن مقاصد کو سامنے رکھ کر کام شروع کیا وہ نہایت اہم ہیں۔ ہمارے طبقہ میں اس چیز کی بڑی کمی ہے۔ آپ نے سیمینار کے انعقاد سے اہل علم و فضل کا متعارف کرایا ہے پھر آپ نے جن موضوعات کو سامنے رکھتے ہوئے کام کرنے کا آغاز کیا ہے ان کی اہمیت اس زمانہ میں مسلم ہے۔ اگرچہ ہمارے علماء کا طبقہ ایسے موضوعات کو دلچسپی سے نہیں پڑھے گا مگر آہستہ آہستہ انہیں ان موضوعات سے مانوس کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ آپ نے اچھا قدم اٹھایا ہے۔ میں آپ کو اور آپ کے معاونین کو ہدیہ تحسین پیش کرتا ہوں اور خود ایک معاون و مدّاح کی حیثیت سے آپ کے مشن میں ادنیٰ سا غلام تصور کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر محمد عبداللہ صالح شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور رقمطراز ہیں۔

"قریشی صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صدقے ہماری نجات کا سامان کر دے۔ آپ نے بہت منظم، بھرپور اور خوبصورت سیمینار کیا، اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں علمی فضا ہے۔ یہاں پر سرکاری غیر سرکاری سطح پر سیمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ اب تک ہماری نظر میں فیصل آباد کی شہرت ایک صنعتی اور تجارتی شہر کی تھی لیکن آپ نے دو روزہ قومی سیرت سیمینار کا اہتمام کر کے ثابت کر دیا کہ یہ اہل محبت کا شہر ہے اور یہاں بھی علمی سرگرمیاں فروغ پا رہی ہیں پھر یہ کہ آپ نے علماء و مشائخ کے امتزاج کے ساتھ جدید اہل علم و فکر کو بھی جمع کر دیا اور ملک بھر سے محققین

کو بلا کر ان سے استفادہ کا موقع بہم پہنچایا۔ آپ نے جس طرح سیمینار کے انتظامات کیئے اہل علم کی قدر و منزلت کی اور ہر ایک سے جس طرح محبت سے پیش آئے یہ ہمارا سرمایہ ہے اور اعزاز ہے۔ مدّتوں اس کی یاد دلوں کو منور کرتی رہے گی۔ اس پر مرکز تحقیق کے جملہ اراکین، معاونین مبارک باد کے مستحق ہیں، ہمارے جذبات ان تک پہنچا دیجئے اور سلام بھی عرض کر دیجئے۔"

میاں عبدالعزیز قریشی بہاول پور سے تحریر فرماتے ہیں۔

(شرکاء سیمینار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا) یہ نام کیا ہیں، یہ تو چاند تارے ہیں، آسمان علم و دانش اور تاریخ و سیرت کے ماہ و آفتاب ہیں جو آپ کے ایماء اور آپ کی مقناطیسی، پر وقار اور دلآویز شخصیت کی محبت کے باعث مرکز تحقیق فیصل آباد کے افق دین و دانش پر طلوع ہوئے ہیں اور آپ کے نیک دل رفقاء اس سیمینار کے کامیاب انعقاد پر بے حد تحسین و آفرین اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔"

ان محترم احباب کے علاوہ بہت سے کرم فرماؤں نے بالمشافہ اور فون پر حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں تمام اراکین مرکز تحقیق کی جانب سے سب کا شکر گزار ہوں۔ یقیناً یہ کلمات تحسین ہمارے ارادوں کو مزید ولولہ عطا کریں گے اور مستقل پیش رفت کیلئے راہنما بنیں گے۔

حرف سپاس

دو روزہ قومی سیرت سیمینار کا کامیاب انعقاد کسی ایک فرد کی محنت کا ثمر نہیں، اس کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کیلئے بہت سے اہل محبت کی مساعی کو دخل ہے مثلاً

قراء حضرات نے لحن داؤدی کے وہ مظاہر پیش کیئے کہ ہر نشست کا آغاز رحمت آشنا ہوا۔ پاکیزگی کی ایسی فضا سے ابتداء ہوتی رہی جو پوری نشست کو روحانیت کے سایوں میں لئے رہی۔

نعت خواں احباب نے انتخاب نعت میں بھی ذہنی بالیدگی کا ثبوت دیا اور ادائیگی کا ایسا منظر پیش کیا کہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا برملا اظہار ہوتا رہا۔

صاحبزادہ عطاء المصطفیٰ نوری کی سحر انگیز آواز نے قصیدہ بردہ کے محبت بھرے اشعار کو اس طرح پیش کیا کہ تقدیس کی ایک چادر تنی رہی۔

ڈاکٹر عبدالشکور انصاری نے نظم محفل عمدگی سے قائم رکھا۔

محترم ومکرم احباب علم وایقان نے کرسی صدارت کو زینت بخش کر پورے پنڈال کو حصار یقین وعافیت میں رکھا اور محفل کو بالفعل وقار آشنا کیا۔

مہمانان اعزاز میں ایسے محترم افراد تھے جن میں سے ایک ایک اپنی ذات میں انجمن ہے۔ان معزز مہمانوں میں معاشرے پر فراخ دلی، نیک نفسی اور راست قدمی کے انمٹ اثرات چھوڑے ہیں۔

یہ تمام محسنین ہماری سپاس گزاری کا حق رکھتے ہیں۔مرکز تحقیق ان تمام معاونین کیلئے ہمیشہ چشم براہ رہے گا تاکہ علم و دانش کا یہ چراغ روشن رہے اور ملّت کے درد کا درماں ہوتا رہے۔سب کا تہہ دل سے شکریہ، سب کیلئے نیک دعائیں اور سب کی خوشگوار زندگی کی تمنائیں۔

دو روزہ قومی سیرت سیمینار کے انعقاد میں وہ احباب اور کرم فرما بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جن کا دست تعاون بہر حال ہمارا شریک سفر رہا۔مادی احتیاج کے اس دور میں وسائل کی فراہمی، نہ صرف یہ کہ مشکل مرحلہ ہے بلکہ بسا اوقات راستے کا وہ پتھر بھی ہے جو اٹھتے ہوئے چشموں کی راہ بھی کاٹ لیتا ہے۔مرکز تحقیق فیصل آباد کو مادی وسائل کے حوالے سے کبھی کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ ہمارے احباب میں ایسے کشادہ دست کرم فرما بھی شامل ہیں جو اُمید سے بڑھ کر تعاون فرماتے ہیں اور خواہش سے زیادہ نوازتے ہیں۔ان احباب میں چند کا تذکرہ ضروری ہے۔

جناب الحاج میاں محمد طیب چیئر مین طیب گروپ آف انڈسٹریز فیصل آباد ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ آپ کی معاونت مرکز تحقیق فیصل آباد کو قدم قدم پر حاصل رہی ہے۔ حاجی محمد رفیق مرحوم (مدفون جنت البقیع مدینہ منورہ) کا نام اہل فیصل آباد ہی نہیں وطن عزیز کے ہر طبقے اور ہر علاقے میں لائق احترام ہے کہ آپ نے عشق رسول ﷺ کی وہ شمع، کاروباری وتجارتی حلقوں میں فروزاں کی کہ جس کی روشنی آج تک لو دے رہی ہے۔ محترم میاں طیب صاحب نے اپنے والد گرامی کے مقدس مشن کو حرزِ جاں بنایا ہے اور محبت وعقیدت کا ایک جہاں آباد کیے ہوئے ہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ یہ سیمینار کے مقالوں پر مشتمل یہ کتاب آپ کے تعاون سے ہی شائع ہو رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ میاں طیب صاحب کی یہ محبت مرکزِ تحقیق کے علمی و تحقیقی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمیں ہمیشہ حاصل رہے گی۔

حاجی محمد اکبر چیئر مین شمع ایکسپورٹس فیصل آباد ایک نیک نفس، متواضع اور سراپا محبت بزرگ ہیں۔ دینِ متین کو عملی شکل میں اپنے وجود پر طاری کیے ہوئے ہیں۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت تو حاجی صاحب کی پہچان ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ حاجی صاحب مرکز تحقیق سے ایک گونہ تعلق رکھتے ہیں آپ کے سامنے ضرورت کی وضاحت نہیں کرنا پڑتی۔ حقیقت میں آپ کا وجود مسلسل رابطے میں رہتا ہے اور ان کا دست تعاون کشادہ بھی ہے اور منّ واحسان کے بوجھ سے ناآشنا بھی سیمینار کے بیشتر مصارف حاجی صاحب کی محبتوں سے ہی پورے ہوئے ہیں۔

حاجی میاں محمد حنیف چیئر مین بورڈ آف گورنرز فیصل آباد یونیورسٹی فیصل آباد جو اپنے صنعتی حوالے کسان گھی کی مناسبت سے بھی شہرت رکھتے ہیں ایک سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ہر لحظہ درود مست رہنے والا وجود وطن عزیز کے ہر گوشے میں

درود خوانی کا محرک بھی ہے، صحرا ہو یا پہاڑ، شہر ہو یا بستی جہاں بھی الصلوۃ والسلام علیک یا سیدی یا رسول اللہ کا نظر نواز بورڈ موجود ہے وہ آپ کے حسن عقیدت کا مظہر ہے۔ میاں صاحب کا میلان، علمی سرفرازیوں کی طرف بڑا نمایاں ہے۔ ایک خوبصورت اور لائق حوالہ یونیورسٹی میاں صاحب کے ذوق علم کی بنیاد ہے۔ مرکز تحقیق کو یہ فخر حاصل ہے کہ میاں صاحب ہمہ وقت اس کی سرپرستی فرماتے ہیں۔

مرکز تحقیق کے اراکین میں سے الحاج محمد ارشد اچھی صاحب اس لئے نمایاں ہیں کہ ہر کار خیر میں پیش قدمی فرمانے کا ذوق بھی رکھتے ہیں اور حوصلہ بھی۔ مرکز تحقیق کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں جب اس سیمینار کا فیصلہ کیا جا رہا تھا اور ابھی وسائل کی فراہمی کا مرحلہ درپیش بھی نہ تھا کہ آپ نے ایک گراں قدر پیشکش سے اراکین کے حوصلوں کو مہمیز لگائی۔

محترم حاجی محمد رفیع چیئرمین سمیع فیبرکس فیصل آباد ہمارے ان ساتھیوں میں سے ہیں جن پر مرکز تحقیق اپنا حق رکھتا ہے۔ خاموش مگر مستعد دوست جو ہر کار خیر کیلئے ہر لحظہ مضطرب۔

برادر مکرم حاجی میاں شوکت علی چیئرمین ستارہ لیبلز فیصل آباد سدرہ شریف کے ان خلفاء میں سے ہیں جن پر ان کے آقائے نعمت کا بڑا کرم ہے۔ نوجوان ہیں مگر صاحب رائے اور متین، ان سے مرکز تحقیق کا تعلق اس قدر قریبی اور گہرا ہے کہ تکلفات کا کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد اعظم بخاری شعبہ طب کا ایک معتبر نام ہے۔ اپنی محکمانہ مصروفیت کے باوجود ان میں مرکز تحقیق سے تعاون کا جذبہ بے مثال ہے۔ اہم انتظامات کیلئے ڈاکٹر صاحب کا وجود ہمارا بہت بڑا سہارا ہے۔

ان بزرگ معاونین کے علاوہ بہت سے احباب نے ہر قدم پر ساتھ دیا۔ ان میں

وہ نوجوان ساتھی بھی ہیں جو مرکز سے ہمیشہ سے وابستہ ہیں۔ ان میں کارکنانِ مرکز بھی شامل ہیں۔ صاحبزادہ عطاء المصطفیٰ نوری کے ادارے کے اکثر احباب اور طلباء بھی ہر لحہ اعانت کیلئے تیار رہے سید مقصود گیلانی، مولانا محمد اشرف شاد، محمد ہارون رشید اور کئی دیگر طلبہ مرکز تحقیق کا سرمایہ ہیں

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ربّ کریم اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے ان تمام کرم فرماؤں اور معاونین کو اپنی رحمت کے حصار میں رکھے۔ حسنات کا پاسدار بنائے اور ترویج خیر کیلئے ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔ (آمین)

آخر میں ان ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے مرکز تحقیق کے اراکین کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کی ہیں اور پوری دلجمعی کے ساتھ ہمہ وقت شریک عمل رہے ہیں اور رہنے کا عزم رکھتے ہیں۔ مرکز تحقیق کی مجلس انتظامیہ میں درج ذیل احباب شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی	صدر
صاحبزادہ عطاء المصطفیٰ نوری	سینئر نائب صدر
مولانا رضاء الدین صدیقی	نائب صدر
ڈاکٹر عبد الشکور ساجد	جنرل سیکرٹری
ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس	سیکرٹری نشر و اشاعت
پروفیسر محمد ریاض قریشی	خازن

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل احباب مرکز تحقیق کے معزز ممبران کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں

الحاج محمد ارشد اچھی	محمد صابر مرتضائی
میاں مقبول احمد	ڈاکٹر محمد اعظم بخاری
سید مقصود گیلانی	محمد رضوان

ڈاکٹر غلام قادر فیاض　　　　مفتی محمد سلیم　　　　محمد ہارون رشید

مجلس انتظامیہ کے تمام اراکین نے سیمینار کی تیاری اور انعقاد میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ ان احباب کی محنت شاقہ کا ثمر تھا کہ دوروزہ قومی سیرت سیمینار منعقدہ 3-4 جون 2006ء کے چاروں اجلاس نہایت کامیاب رہے۔ مہمانان گرامی کا پرخلوص اظہارِ محبت ان کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ رحیم و کریم رب رحمت عالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین حق پر خلوص نیت کی ساتھ قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مرکز تحقیق فیصل آباد جن اہداف کے پیش نظر تشکیل دیا گیا ہے ان کے حصول کیلئے ہر رکن کو محنت کرنے کا حوصلہ دے اور ہم سب کو تحقیق و تجسس کا وہ سلیقہ عطا کرے جو پوری انسانیت کیلئے کا آمد اور مفید ہو۔ (آمین)

اللھم صل وسلم دائماً ابداً علیٰ حبیبک خیر الخلق کلھم

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی
صدر مرکز تحقیق فیصل آباد

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں
احترام آدمیت

احترام آدمیت، تقاضے، حدود، معاشرتی رویے، معاشی روابط
عصر حاضر کے خصوصی تناظر میں

احترام آدمیت کی قرآنی بنیادیں

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر
ڈین علوم اسلامیہ و عربیہ
فیصل آباد یونیورسٹی فیصل آباد

احترام آدمیت کی قرآنی بنیادیں

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

انسان، اللہ قادر مطلق کی قدرت کاملہ کا منفرد تخلیقی کرشمہ ہے اس بارے میں تا حال کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا اور کسی دوسری رائے کی کسی نے بھی آج تک جسارت نہیں کی۔ اس کے برعکس علمائے ادیان، قدیم و جدید سائنسدان اور تمام اہل فکر و دانش کا اس بات پر اتفاق و اجماع ہے کہ اس پوری کائنات کے کسی بھی گوشے میں کوئی بھی ایسی مخلوق دیکھنے سننے میں نہیں آئی جو حضرت انسان سے افضل و برتر تو کیا ہوگی اس جیسی، ہم پلہ اور مماثل ہی قرار پا سکے۔ علم و فکر کی ہر آواز نے یہی کہا اور یہی کہہ رہی ہے کہ یہ آدم زاد اللہ جل شانہٗ کی بے نظیر و بے مثال مخلوق ہے حتیٰ کہ ملائکہ اور جناتی مخلوق کو بھی خود کو دکھانے اور نمایاں کرنے کے لئے کوئی قالب، کوئی لباس اور کوئی بناوٹ انسان سے بہتر و برتر میسر نہیں آئی۔ فرشتوں کو بھی قبول صورت بننے کے لئے صرف انسانی شکل و صورت گوارا محسوس ہوئی اور پریوں کو پرکشش اور دل آویز بننے کے لئے حواء کی بیٹی کا پیکر حسن و جمال ہی پسند آیا، اسی لئے تو خالق کل نے بھی انسانی سانچے کی تخلیق پر فخر و مباہات کے اظہار کے لئے یوں اعلان فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التین:4)

ترجمہ: ہم نے ہی انسان کو سب سے خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

اللہ رب العزت کا یہی اعلان احترام آدمیت کی اوّلین منزل اور سب سے پہلی قرآنی بنیاد ہے جسے ''تحسین آدمیت'' کہتے ہیں! خالق ورازق نے جب واشگاف لفظوں میں تحسین آدمیت کا اعلان فرما کر یہ بتادیا کہ میری اس کائنات میں انسان سے بہتر قالب اوراس سے بڑھ کر خوبصورت کوئی سانچا نہیں ہے تو اب اس اشرف المخلوقات ہستی کا احترام کیوں نہ ہو؟! اس پوری کائنات کی ہر شے انسان کے تابع اور مسخر کیوں نہ ہو؟! کائنات کی ہر چیز کو انسانی ارادے کے سامنے جھکنا پڑے گا! کیونکہ حضرت انسان کو سب نے اشرف المخلوقات تسلیم کرنا، سب کی جبین نیاز کو انسانیت کے قدموں پر سر رکھنا پڑے گا حتیٰ کہ رب کائنات تو تمام جن و ملک کو آدم کے سامنے سربسجود ہونے کا حکم فرمادیتے ہیں۔ سب کے سب حکم خداوندی کے تابع حضرت آدم کے حضور میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک نے اس حکم خداوندی سے روگردانی کی اور وہی رب کائنات کے حکم سے شیطان مردود اور ابلیس لعین قرار پا گیا۔ اپنے تمام زہد وعبادت کی قیمتی پونجی کو لٹا کر ازل سے ابد تک ذلت ورسوائی کا محور ومرکز بن گیا۔ یہی مرحلہ ہے جب آدمیت کی عظمت پر مہر ربانی ثبت ہو جاتی ہے اور اسی کا نام اور عنوان ''تعظیم آدمیت'' ہے! جو احترام آدمیت کو واجب ٹھہراتی ہے۔ ازل میں جنّ وملائک کا آدم کے لئے یہ تعظیمی سجدہ دراصل عظمت انسان کی علامت ہے اور اللہ جل شانہٗ کی طرف سے یہ اعلان واجب الاذعان ہے کہ کائنات کی ہر شے کو عزم انسانی کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا اور یہاں کی کوئی چیز بھی انسانیت کے عزم تسخیر کے سامنے چون و چرا کا حق نہیں رکھتی۔ ہنر مند انسان کی حکمت وتدبیر پوری کائنات کو مسخر کرنے پر قادر ہے اور یہ سب کچھ ربّ کائنات نے پیدا ہی اسی لئے فرمایا ہے کہ اشرف المخلوقات کی چاکری کرے اوراس کی منفعت کے لئے کمربستہ رہے۔

قرآن کریم نے تعظیم آدمیت کے مرحلے کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی پہچان کروانے کے لئے تخلیق کا ڈول ڈالا۔ اس وسیع کائنات پر اپنی حکمرانی

کا رنگ دکھانے کے لئے نور سے فرشتوں کو پیدا کیا جو بلا چون و چرا حکم ربانی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اس رنگ حکمرانی کو دو گنا کرنے کے لئے پھر جناتی مخلوق کو آگ سے پیدا کیا جس کی سرشت میں تمرد، سرکشی اور نافرمانی ہے نور اور نار چونکہ دو انتہائیں ہیں۔ ایک سراپا اطاعت اور دوسری سراپا نافرمانی وعصیان' حتیٰ کہ اطاعت کا عارضی رنگ بھی گوارا نہیں۔ اس لئے طاعت کے بعد بھی شیطنت ہی سر نکالتی ہے اس لئے ایک ایسا رنگ بھی کائنات کو درکار تھا جو اعتدال اور توازن کا حامل ہو۔ اطاعت و نافرمانی کی دونوں صلاحیتیں موجود ہوں' اس لئے انسان کو پیدا فرما کر توازن و اعتدال سے متصف شاہکار مخلوق سے کائنات پر اپنی حکمرانی کے رنگ کو ربّ کائنات نے اجاگر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کے رنگ کو اجاگر کرنے کی یہ صلاحیت ہی عظمت آدمیت کا سبب ہے۔ اور یہ صلاحیت دراصل حصول علم اور پھر اس نور خداوندی کو ارتقائی منازل سے گذارنے کی بے مثال صلاحیت ہے۔ نامعلوم کو معلوم کرنا پھر اس معلوم کی بنیاد پر مزید نامعلوم دنیا کو معلوم کرتے چلے جانا ہی ربّ کائنات کی نظر میں انسان کو عظمت کا مستحق بناتا ہے اور یہی کیفیت وصلاحیت تعظیم آدمیت کا تاج ہے! اسی حقیقت کو کتاب عزیز کو نازل فرمانے والے نے یوں عیاں کیا ہے:

"اور وقت کا وہ لمحہ بھی ناقابل فراموش ہے جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ اب میں کائنات ارضی میں ایک جانشین پیدا کرنے والا ہوں، فرشتوں نے کہا: پروردگار! آپ کوئی ایسی مخلوق پیدا کرنے لگے ہیں جو اس کائنات ارضی میں فساد پھیلائے گی اور خون ریزی کا مرتکب ہوگی! جبکہ آپ کی تسبیح وتحمید اور تقدیس کے لئے تو ہم موجود ہیں! اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو! اور آدم کو اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کے اسماء کا علم سکھلایا، پھر یہ اشیاء فرشتوں کے سامنے پیش کیں اور کہا کہ تم ان نامعلوم اشیاء کے نام بتادو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو! فرشتوں نے کہا: اے پروردگار

آپ کی ذات پاک ہے۔ ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جو آپ نے ہمیں عطا فرما دیا، آپ تو علم رکھنے والے حکمت کے مالک ہیں! تب اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ اے آدم تو انہیں ان اشیاء کے نام بتا دے۔ جب آدم نے معلوم اسماء کو نامعلوم اشیا پر منطبق کر کے بتا دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں بتایا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب اور غیر موجود کا بھی علم رکھتا ہوں اور مجھے وہ سب کچھ بھی معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو یا پوشیدہ رکھتے ہو! ...... اور پھر وقت کا وہ لمحہ بھی قابل ذکر ہے جب آدم نے معلوم سے نامعلوم کو دریافت کرنے کا عطیہ ربانی کا عملی مظاہرہ کر کے اپنی صلاحیت علم کو ثابت کر دیا تو اس وقت ہم نے فرشتوں سے کہا کہ اب تم عظمت آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس لعین کے! اس نے انکار کیا اور خود کو بڑا ظاہر کیا تو وہ اسی تکبر کے باعث کافر قرار پایا!!"

سورۂ بقرہ کی یہ آیات کریمہ جہاں تعظیم آدمیت کو نمایاں کر کے احترام آدمیت کی ایک اہم قرآنی بنیاد کو ثابت کرتی ہیں وہاں ان سے احترام آدمیت کی ایک اور قرآنی بنیاد پر بھی روشنی پڑتی ہے جسے تمکین آدمیت کا نام دیا جا سکتا ہے اور خلافت ارضی سے بھی یہی مراد ہے، اللہ جل شانہٗ نے اس کرۂ ارض کی کرسی اقتدار کا مستحق بھی اولاد آدم کو ٹھہرایا ہے۔

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً﴾ (البقرہ:30)

ترجمہ: میں روئے زمین پر ایک جانشین یا خلیفہ بنانے والا ہوں۔

میں جن وملائک کی خلافت کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب ایک عرصہ تک اس سرزمین خداوندی پر غلبہ اور اقتدار بھی انسان کے ہاتھ میں رہے گا۔ ظاہر ہے اس خاکدان ارضی کی حکمرانی کسی نوری یا ناری مخلوق کے بس کی بات نہیں، یہ فریضۂ منصبی صرف حضرت انسان کو سجتا ہے اور وہی اس کا اہل بھی ہے! خاکی اولاد آدم نے نوری اور ناری مخلوق کی جگہ

لیکران کا اقتدار بھی ختم کر دیا ہے، نوری مخلوق تو اپنے رب کی اطاعت گذار اور فرماں بردار ہے اس لئے خاکدان ارضی پر انسان کا اقتدار ہوتے ہی صرف احکام ربانی کی پابندی پر اکتفا کرنے لگی مگر شیطان کے بھائی جنات کہیں اور پناہ نہ ملنے کی وجہ سے زمین پر اولاد آدم سے چھیڑ چھاڑ میں لگے ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ ابد تک یونہی جاری رہنا منشائے ربانی معلوم ہوتا ہے تاہم اس سے اقتدار انسانی اور اولاد آدم کے تمکن فی الارض پر کوئی حرف نہیں آسکتا اور یہ تمکین و اقتدار کے اوصاف احترام آدمیت کو چار چاند لگاتے ہیں اور اس طرح تمکین آدمیت احترام آدمیت کی ایک نمایاں اور اہم قرآنی بنیاد قرار پاتی ہے! اللہ تعالیٰ نے اپنی جس مخلوق کو اس خاکدان ارضی کی خلافت و اقتدار کا مستحق ٹھہرایا ہے وہ مخلوق یقیناً احترام کی بھی حقدار ہے ہر ابن آدم عزت و احترام کا سزاوار ہے! ہر فرد بشر مرد و زن کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ فرزند آدم ہے جسے رب تعالیٰ نے زمین کی سلطنت، اقتدار اور غلبہ عطا فرمایا ہے۔

احترام آدمیت کی قرآنی بنیادوں میں سے ایک تکریم آدمیت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو عزت و تکریم کا مستحق قرار دیا ہے اور انسان پر اپنی اس نعمت کا اعلان اپنی کتاب زندہ قرآن حکیم میں فرمایا ہے، سورۂ بنی اسرائیل یا سورۂ اسراء کی آیت 70 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور ہم نے اولاد آدم کو عزت و تکریم عطا کی ہے اور انہیں بحر و بر کی سواریوں پر سوار کیا ہے اور انہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ہے۔ اور انہیں اپنی لاتعداد مخلوق پر بڑی فضیلت عطا فرمائی ہے''۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے یوں حکم نہیں دیا کہ اولاد آدم کی عزت و تکریم کرو، بلکہ اس مہتم بالشان کام کو خود اپنی طرف منسوب کر کے احترام آدمیت کو دو چند کر دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ خود اولاد آدم کو عزت و تکریم سے نواز چکے ہیں تو شیطان ملعون کے سوا اور کون ہوگا جو اس

خاکی مخلوق کی عزت نہیں کرے گا۔ اس اعزاز و تکریم کے متعدد ثبوت اور علامات بھی اس آیت کریمہ میں بیان کر دی گئی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے اور سب سے نمایاں علامت وثبوت یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے انسان کا بوجھ اٹھانے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں آسانی کے لئے تمام جانوروں اور بحر و بر کی تمام مخلوق کو اس کی سواری بنایا ہے بلکہ تخلیق کے تحسینی مرحلے میں حضرت انسان کے قلب و دماغ میں ایسی خاصیت وصلاحیت بھی رکھی ہے کہ اس نے بے جان جمادات کو حرکت و گویائی کے قابل بنا کر بحر و بر کی سواریوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہ فضاؤں اور خلاؤں میں اڑنے والی سواریاں احسن تقویم کے ربانی سانچے میں ڈھلنے والے انسان نے خود ہی تیار کر لی ہیں۔

لیکن اس آیت کریمہ میں انسان کی ایک ایسی خوبی کا بھی ذکر ہے جسے آج کے دور میں سود خور مادہ پرست کوئی اہمیت نہیں دیتے اس لئے اس چین اور اطمینان کی دولت سے بھی محروم ہیں جو انسان محترم کا حق ہے اور یہ خوبی ہے طیب وحلال روزی! جو انسان اس سے محروم ہیں یا اس سے اعراض کرتے ہیں وہ اس عزت و تکریم سے بھی محروم ہیں جو حق تعالیٰ نے انسان کے لئے خود پسند فرمائی ہے۔ اسلام میں رزق حلال کی طلب بھی ایک عبادت ہے اور جو رزق حلال کے منکر ہیں وہ دراصل اس عبادت کے منکر ہیں۔

تکریم آدمیت کی ایک علامت تفضیل آدمیت ہے، سائنسدان اور اہل دانش اس بات پر متفق ہیں کہ پوری کائنات میں ابن آدم کا کوئی ثانی نہیں بلکہ اس کا ہم پلہ و ہمسر بھی کائنات کے کسی گوشے میں موجود نہیں ہے۔ ربّ کائنات نے اپنی اس اشرف المخلوقات کو منفرد، بے مثل اور بے نظیر بنایا ہے اور اسے تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے اولاد آدم کو جو امتیازات احترام عطا ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے آدم اور اولاد آدم کو علم کے زیور سے آراستہ فرمایا ہے یہی امتیاز علم تھا جس نے حضرت آدم کو مسجود ملائکہ بنا دیا اور اسی علم کی بدولت انسان تہذیب وثقافت،

ادب و ہنر اور سائنس و ٹیکنالوجی کے اس بام عروج پر پہنچا جس کی چمک دمک آج کائنات کے ہر گوشے میں دکھائی دیتی ہے، انسان کے دماغ میں ربّ کریم نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ علم سے بڑھتا اور ترقی پاتا ہے بلکہ وہ معلوم کے ذریعہ نا معلوم تک جا پہنچنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ عزت و احترام کی یہی قرآنی بنیاد ہے جو انسان کو دوسروں سے امتیاز اور برتری عطا کرتی ہے اور اس بنیاد کو بجا طور پر ''تعلیم آدمیت'' کہا جا سکتا ہے۔ حضرت انسان کا معلّم اوّل خود خالق کائنات ہے۔ جس ہستی کا معلّم اوّل خود اللہ ربّ العزت ہو اس کے مرتبہ و مقام کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور جو احترام اس کے مقدر میں ہے اس کی حدود و قیود کا اندازہ بھی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو ہو سکتا ہے۔ ہمارا فرض تو اتنا ہے کہ اس اولاد آدم کا ہر طرح احترام کیا جائے۔ ہم بھی انسانیت کے مرتبہ پر اسی وقت فائز ہو سکتے ہیں جب ہم اپنے ابنائے جنس کے مرتبہ و مقام سے آگاہ ہو کر انہیں احترام سے نوازیں گے، اسی کو شاعر مشرق نے یوں پیش کیا ہے:

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

تعلیم آدمیت وہ زینہ ہے جس سے انسان صحیح معنی میں اشرف المخلوقات بن کر تسخیر کائنات کے قابل ہوتا اور مہر و ماہ اور افلاک و ابراج کو اپنے تابع کرنے کا شرف پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں بار بار یہ اعلان فرمایا ہے کہ اس نے یہ زمین و آسمان اور ان میں جو کچھ ہے وہ اس نے صرف انسان کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ سب کچھ اس نے اولاد آدم کے لئے مسخر و تابع فرمان بنا دیا ہے۔ یہ درجہ کمال انسان کو علم کے طفیل نصیب ہوا ہے مگر یہ تعلیم آدمیت کا پھل ہے اور اس کا اگلا درجہ ہے جس سے انسان کو مشرف فرمایا گیا، عز و شرف کی اس منزل کو ''تشریف آدمیت'' کا نام دیا جا سکتا ہے اور یہ احترام آدمیت کی وہ قرآنی بنیاد ہے جو تعلیم آدمیت کے بعد آتی ہے اور اس کا ثمر و نتیجہ ہے!!

انسانی زندگی چونکہ اعمال سے عبارت ہے، اگر عمل نہ ہوں تو انسان کسی اجر وثواب اور سزا وعقاب کا مستحق نہیں ہو سکتا بلکہ عمل کے بغیر تو انسان کورے کاغذ کی طرح خالی اور بے نتیجہ ہے بقول اقبالؔ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور اسی لئے قرآن کریم نے بھی احسن تقویم میں ڈھلنے والے انسان کو تحسین آدمیت سے مشرف ہونے کے باوجود اسفل السافلین یا پست ترین درجہ میں پہنچنے کا سزاوار قرار دیا ہے۔ اس پست ترین درجہ سے بلند ہونے کے لئے عمل صالح سے مشروط کیا ہے لیکن اعمال بد انسان کو مزید پست سے پست تر بنا دیتے ہیں اور ان اعمال بد کی دلدل سے نکل کر اعمال صالحہ کے صراط مستقیم پر پڑنے کے لئے انسان کا شرک کی ناپاکیوں سے پاک ہونا پہلی شرط ہے اور شرک سے نجات کے صراط مستقیم کا نام توحید پر ایمان ہے۔ اس کو تطہیر آدمیت کہا جاتا ہے اور احترام آدمیت کی قرآنی بنیادوں میں اسے سرعنوان اور نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل ہے! تطہیر کے اس مرحلہ سے گذر کر گوشت پوست کا یہ کمزور اور ضعیف البنیان ابن آدم فولاد بن جاتا ہے۔ عزم وارادے میں وہ یوں پختہ ہو جاتا ہے کہ کوئی طاقت اسے متزلزل نہیں کر سکتی اور کوئی لالچ یا ترغیب اسے پھسلا نہیں سکتی۔ وہ ہر خوف سے بے نیاز اور ہر طمع سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تطہیر آدمیت کے اس مرحلہ سے گذرنے والے انسان کامل کی تصویر شیخ سعدی نے اپنی اس خوبصورت رباعی میں یوں کھینچی ہے:

موحد چہ در پائے ریزی زرش
چہ شمشیر ہندی نہی برسرش
امید و حراسش نباشد زکس
برین است بنیاد توحید و بس!

قرآن کریم کی رو سے تطہیر آدمیت ایک ایسی بنیاد ہے جو خاکی انسان کو اسفل السافلین کے درجہ سے اٹھا کر اعلیٰ علیّین کے مرتبہ پر فائز کرتی ہے، سارا قرآن کریم احترام آدمیت کی اسی بنیاد کا بیان ہے، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (حٰم السجدہ:30)

ترجمہ: وہ لوگ جو یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب تو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے پھر وہ اسی ایمان پر پختہ ہو گئے تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مت ڈرو اور نہ غم کرو بلکہ تمہیں تو اس جنت کی بشارت ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا۔

احترام آدمیت کی لاتعداد قرآنی بنیادوں میں سے ایک بنیاد تعمیر انسانیت ہے جسے تقویٰ اللہ بھی کہتے ہیں اور یہ توحید ربانی پر ایمان کے بعد میسر آتی ہے اور جو عبارت ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی مکمل ادائیگی سے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کو مان لیتا ہے تو اس کے لوازمات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ نسل انسانی کی وحدت پر بھی ایمان لائے جس نے تمام انسانوں کو صرف نفس واحدہ (ایک آدم) سے پیدا کیا ہے۔ جب سب کا رب ایک ہے، سب کا باپ بھی ایک ہے تو پھر سب انسان بھائی بھائی ہیں، اگر بھائی بھائی ہیں تو پھر سب برابر بھی ہیں اور سب کے حقوق بھی برابر ہیں اور فرائض بھی یکساں ہیں، ان حقوق و فرائض کی ادائیگی کا نام تقویٰ ہے، جو ان کی ادائیگی میں کامل ہے وہی کامل متقی بھی ہے اور جو کامل متقی ہے وہی سب سے زیادہ احترام کا بھی حق دار ہے!

احسن تقویم میں ڈھل کر تیار ہونے والے جس ابن آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے عزت و تکریم کا حقدار ٹھہرایا اس کے احترام کے لئے قرآن کریم نے جو بنیادی قواعد اور

اصول دیئے ہیں ان میں سے ایک اصول اور قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر فرد نے اپنے خالق، رازق اور موت و حیات کے مالک کا بھی ایک حق ادا کرنا ہے، ایک مشن پورا کرنا ہے اور فرض بجالانا ہے۔ یہ حق، یہ مشن اور یہ فرض جو ربّ العالمین جل جلالہ نے ہر فرد بشر کے ذمہ لازم ٹھہرایا ہے' یہ دراصل انسانی احترام کی ایک اہم اصل و بنیاد ہی ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ تو غنی و بے نیاز ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ جو اصول اور جو قاعدہ احترام آدمیت کے لئے تھا اور جسے ربّ کریم نے اپنا حق قرار دیا ہے' اسی اصول اور اسی قاعدہ کو یہ ظلوم وجہول اور خجول و عجول ابن آدم پس پشت ڈال بیٹھا ہے اور اس طرح اس نے اپنے ہاتھ سے ہی اپنا اتنا بڑا نقصان کر لیا ہے اور اب خسارے اور نقصان کی اسی زندگی کے ہاتھوں تنگ بلکہ مبتلائے عظیم ہے۔

جب سے حضرت انسان' یہ فرزند آدم' عدم سے وجود میں آیا ہے اور جب تک یہ اس معمورۂ جہاں میں باقی رہے گا اس وقت تک اس ابن آدم کے دو سلگتے ہوئے' چبھتے ہوئے اور ہر لحہ پریشان کرتے ہوئے مسائل' اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور وہ ان کے باعث اذیتوں میں مبتلا رہے گا اور ذلتوں سے دوچار رہے گا۔ ان میں سے ایک مسئلہ پیٹ کا دوزخ ہے' جسے بھرے بغیر انسان کو کسی کل بھی چین نہیں ملے گا اور اس کے بغیر سب باتیں بیکار ہیں، گویا بھوک اور افلاس سے چھٹکارا ہر فرد بشر کی بنیادی ضرورت ہے، سلگتا چبھتا ہوا حضرت انسان کا دوسرا مسئلہ آزادی کی عزت ہے، آزادی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے، بھوک اور افلاس سے چھٹکارے کے بعد فطری طور پر ہر انسان عزت اور آزادی کی زندگی کا آرزومند ہوتا ہے، از روئے قرآن کریم افلاس سے چھٹکارا اور غلامی سے نجات احترام آدمیت کی دو اہم قرآنی بنیادیں ہیں۔

سورۂ بلد میں ربّ کریم' اللہ جل جلالہ نے مکہ معظمہ کی قسم کھائی جس میں اس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فروکش اور مقیم تھے اور اس قسم میں اپنے کرشمۂ تخلیق

حضرت انسان کے نسلی ارتقاء کی قسم کھاتے ہوئے پہلے ان نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جو اس احسن تقویم میں ڈھل کر تیار ہونے والے ابن آدم کو حسن و جمال اور عظمت و کمال کا حامل بناتی ہیں، جیسے دیکھنے والی دو خوبصورت آنکھیں، بات کرنے والے اور حسن و جمال کو مکمل کرنے والے ہونٹ اور خوبصورت چہرہ، رب نے ابن آدم کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں تاکہ وہ اللہ تعالٰی کی طرف سے عائد کردہ دو ذمہ داریاں پوری کرے مگر خالق و رازق ربّ العالمین کو اس ناشکرے انسان سے گلہ یہ ہے کہ وہ یہ دو مشکل ترین ذمہ داریاں نہ نبھا سکا، ارشاد ربانی یوں ہے:

> ''مگر یہ انسان وہ مشکل ترین دو ذمہ داریاں نہ نبھا سکا! اور بھلا تمہیں معلوم ہے کہ یہ دو مشکل ترین ذمہ داریاں ہیں کیا؟ وہ دو ذمہ داریاں ہیں غلامی سے چھٹکارا دلانا اور افلاس زدہ کو بھوک سے نجات دلانا!!'' (البلد:10-16)

مگر خود غرضی اور نفس پرستی نے ابن آدم کو کہاں پہنچا دیا ہے! وہ یہ دو ذمہ داریاں قطعی طور پر بھلا چکا ہے! آج کا مادہ پرست اور خود غرض انسان دنیا کی تمام نعمتیں اور فوائد اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں ہے، بلکہ وہ تو اس کوشش میں ہے کہ سب کو اپنا غلام بنا کر جکڑ لے اور دنیا کی تمام نعمتوں سے اسے محروم کر دے اور اس سے سب کچھ چھین لے حالانکہ حکم یہ ہے کہ ہر فرد اپنے بھائی کی آزادی کا ضامن و محافظ بن جائے اور اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دے اس سے نوالہ چھیننے کی بجائے اپنا نوالہ بھی اپنے بھائی کے منہ میں ڈال دے اور اسے عزت و آزادی سے ہمکنار کر دے۔

اگر ہر فرد دوسرے فرد کی آزادی اور افلاس سے نجات کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر پورا کرنے پر کمربستہ ہو جائے تو دنیا سے غلامی و محتاجی معدوم ہو جائے اور یہ دنیا امن اور آزادی کا گہوارہ بن جائے اور ہر انسان عزت و آزادی سے سرفراز ہو جائے، احترام آدمیت کی

اس قرآنی بنیاد کو تحفظ انسانیت کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔

احترام آدمیت کی لاتعداد قرآنی بنیادوں میں سے یہ چند نمایاں بنیادیں ہیں اور یہی بنیادیں ہیں جو انسانیت کو احترام کا مستحق ٹھہرا کر آدمیت کا بول بالا کرتی ہیں اور یہی وہ مشن اور رسالت ہے جس کے لئے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے حتی کہ ایک ہندو شاعر کو بھی یہ کہنا پڑا کہ ''اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا!!''۔

احترام آدمیت، تقاضے، حدود، معاشرتی رویے
عصر حاضر کے خصوصی تناظر میں

ڈاکٹر محفوظ احمد
ایسوسی ایٹ پروفیسر اسلامیات
جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

احترام آدمیت، تقاضے، حدود، معاشرتی رویے
عصر حاضر کے خصوصی تناظر میں

ڈاکٹر محفوظ احمد

بانی اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمایا۔ یہ مقام محض تصوراتی اور علمی حوالے سے ہی نہیں بلکہ اس کا اظہار آپ کی تعلیمات اور سیرت طیبہ سے بھی ہوتا ہے۔ آپ نے انسانیت کو گمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف گامزن فرمایا۔ آپ نے انسانیت کو ایسی تعلیمات سے روشناس فرمایا جن پر عمل پیرا ہو کر ہر انسان دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکتا ہے۔ اپنے خصائص کی بنا پر آپ کی سیرت کو ''اسوۂ حسنہ'' سے موسوم فرمایا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:21)

ترجمہ: یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔

آج ہمارا معاشرہ بہت سی معاشی سیاسی اور اخلاقی برائیوں کی آماجگاہ بن چکا ہے جس کی وجہ سے بدامنی اور بے سکونی نظر آ رہی ہے۔ ہر انسان پریشان نظر آتا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے انحراف ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تعلیمات اگرچہ بنیادی اہمیت کی حامل ہیں لیکن ان میں سے بعض تعلیمات ایسی ہیں جو ہماری زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ہیں۔

ان تعلیمات میں سے کسی ایک تعلیم پر عمل پیرا ہونے سے ہماری معاشرت درست سمت کی طرف گامزن ہو سکتی ہے۔ انہی تعلیمات میں سے ایک کا تعلق احترام آدمیت کے ساتھ ہے جسے آج کے اس سیمنار میں ان الفاظ سے موسوم کیا گیا ہے۔

احترام آدمیت، تقاضے، حدود، معاشرتی رویے، معاشرتی روابط عصر حاضر کے خصوصی تناظر میں

امام راغب اصفہانی (م 502ھ) فرماتے ہیں کہ احترام کا لفظ حرم سے مشتق ہے۔ اسی سے ''الحرام'' کا لفظ ہے جس کا معنی ہے ''الممنوع منہ'' یعنی وہ چیز جس سے روک دیا گیا ہو۔ یہ ممانعت خواہ تسخیری ہو یا جبری، عقلاً ہو یا شرعاً۔ حرمین شریفین کو بھی حرم اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حدود میں بہت سے ایسے امور حرام قرار دیے ہیں جو بیرون حرم حرام نہیں [1] علامہ مجدالدین فیروز آبادی (م 817ھ) نے لکھا ہے کہ حِرم یعنی بکسر الراء حرام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کی جمع، حرم آتی ہے۔ محارم سے مراد وہ امور ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ حرام کا لفظ باب افتعال سے اِحْتَرَمَ آتا ہے جو حرمت اور عزت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ [2]

آدمیت کا لفظ آدم سے ہے اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے خواہ اس کا کوئی دین ہو یا کوئی مذہب۔

احترام آدمیت سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی دین کا پیروکار ہو یا کسی مذہب پر عمل پیرا، کسی رنگ کا ہو یا کسی علاقے کا، کوئی زبان بولتا ہو یا کسی بھی معاشرتی حیثیت کا حامل، اس کا بحیثیت انسان دوسروں پر احترام لازم ہے۔ بلاوجہ نہ اسے گالی دی جائے نہ اسے مارا جائے نہ اس کا مال چھینا جائے اور نہ ہی کسی قسم کی اذیت دی جائے بلکہ حتی المقدور اس کی عزت کی پاسداری کی جائے اس کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔

احترام آدمیت اور دیگر بانیان مذاہب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں احترام آدمیت کے تقاضے اور حدود کیا ہیں یہ جاننے سے قبل ضروری ہے کہ ہم دیگر مذاہب اور بانیان مذاہب کی انسانیت سے متعلق تعلیمات سے آگاہ ہوں۔

ہندومت

ہندومت دنیا کے قدیم مذاہب میں سے ایک ہے اس کا آغاز 1500 قبل مسیح سے ہوتا ہے۔(3)

اس مذہب میں احترام آدمیت کے حوالے سے جو تعلیمات ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔اس مذہب میں بہت سے ایسے نظریات اور رسوم وضع کر دی گئیں جنہوں نے آدمیت کو کئی طبقات میں تقسیم کر دیا۔ان طبقات میں سے بعض کا تو انتہائی اعلیٰ درجے کا احترام کیا جاتا اور بعض سے انکا احترام کرنے کی بجائے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے۔

اس مذہب میں انسانوں سے زیادہ بعض جانوروں اور درختوں کا احترام کیا جاتا ہے جیسے بیل اور کچھوا جانوروں میں اور پیپل اور تلسی درختوں میں مقدس سمجھے جاتے ہیں۔(4)

ذات پات کی تقسیم ہندو مذہب میں بہت اہمیت کی حامل ہے اور اسے قبول کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔اس مذہب میں ذات پات کی تقسیم اس طرح تھی: برہمن، خویش، کھشتری اور شودر۔

شودروں کو انسان ہی تصور نہ کیا جاتا۔اگر ان کا سایہ کسی کنویں پر پڑ جاتا تو اس کنویں کو ناپاک تصور کیا جاتا اس بنا پر یہ آبادی سے باہر جھونپڑیوں میں رہنے کے پابند تھے۔شودر اپنی مذہبی کتب یعنی ویدوں کو بھی نہ سن سکتے۔اگر کوئی شودر اتفاق سے کسی وید کے کلمات کو سن لیتا تو اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا۔(5)

عورت کے ذہن میں یہ بات ذہن نشین کرادی جاتی کہ اس کی عزت وناموس اس میں ہے کہ اگر اس کا شوہر مر جائے تو وہ اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ جل کر خاکستر ہو جائے۔ جو عورت ایسا نہ کرتی وہ نہ تو رنگین لباس پہن سکتی اور نہ ہی کسی قسم کے زیورات' اور نہ وہ دوسری شادی کر سکتی۔ ایسی عورت کے لئے بال رکھنا ممنوع تھا اور سر منڈانا لازم' نیز ہر وقت اسے طعن و تشنیع کے الفاظ سننے پڑتے۔ (6)

اس مذہب میں میت کو جلا دیا جاتا ہے۔ جس سے نہ صرف آدمیت کی توہین کی جاتی ہے بلکہ فضا کو مکدّر بھی کیا جاتا ہے اور مسموم بھی۔

زرتشت

ایران کے ساسانی خاندان کی حکمرانی کے عہد 224 قبل مسیح میں زرتشت پیدا ہوا۔ بعض محققین کے نزدیک یہ 660 ق م میں پیدا ہوا اور 583 ق م میں اس کا انتقال ہوا۔ یہ ایران کے قدیم مذہب کا بانی ہے اس کے نام پر اس کے مذہب کا نام پڑا۔ زرتشت کو انگریزی میں ZOROASTER کہتے ہیں۔ زرتشت مذہب (7) کے بعض نظریات اور اسلام میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ (8) لیکن احترام آدمیت کے حوالے سے اس کی تعلیمات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے یکسر مختلف ہیں۔

زرتشت کی تین باتوں کو اس کے مذہب کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ (9)

ان میں ایک یہ کہ اس نے کتے کو نہ صرف انسان کے برابر قرار دیا ہے بلکہ اسے بیوی اور بچوں پر فوقیت دے کر انسانیت کی تذلیل کی۔ (10)

زرتشت نے لوگوں سے کہا کہ انسان جب بیمار ہو جائے تو وہ کسی شفقت کا اور خصوصی توجہ کا مستحق نہیں رہتا بلکہ وہ قابل نفرت ہو جاتا ہے کیونکہ بیماری اس بات کی علامت ہے کہ اس پر بری قوت نے قابو پالیا ہے۔ (11)

زرتشت نے مردہ انسان کے بارے کہا کہ اسے زمین میں دفن نہ کیا جائے کیونکہ

انسان کے دفن کرنے سے پاک مٹی ناپاک اور پلید ہو جاتی ہے۔ اسے نذر آتش کر کے بھسم بھی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ آگ جو ان کی معبود ہے وہ اس کی آلائشوں سے ناپاک ہو جاتی ہے۔ لہٰذا زرتشت نے حکم دیا کہ مردہ انسان کو کسی کنویں میں لٹکا دیا جائے۔ (12) جہاں گوشت خور پرندے جیسے چیلیں، گِدھیں اور دیگر جانور اس پر جھپٹ جھپٹ کر اس کا گوشت نوچ لیں۔ (13)

ڈاکٹر حمید اللہ (م 2002ء) نے ایرانیوں میں رنگ کی تفریق کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایرانیوں کو رنگ کی تفریق اور اپنے گورے ہونے پر اتنا ناز تھا کہ وہ حبشیوں اور ہندوؤں کو کوے کہا کرتے تھے۔ (14)

یہ ہے احترام آدمیت کا وہ تصور جو ایرانیوں کے ہاں رائج تھا اور زرتشت کی وہ تعلیمات جس کی تلقین اس نے اپنے پیروکاروں کو کی۔

رومی مذہب

رومی اگرچہ نصرانی تھے لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں آدمیت کی بہت تذلیل کی جاتی۔ انسان آزاد اور غلام کے طبقات میں منقسم تھے۔ آقا اپنے غلاموں کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے' اس بارے سید قطب شہید (م 1966ع) نے لکھا ہے:-

> کچھ آقاؤں کی ضیافت طبع کے لئے کچھ غلاموں کو تلواریں اور نیزے دے کر ایک اکھاڑے میں دھکیل دیا جاتا اور کھیل میں غلام تلواروں اور نیزوں سے ایک دوسرے پر پل پڑتے بالآخران کا قیمہ بن جاتا۔ (15)

رومیوں کے عہد حکومت میں غلاموں کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ محض جنس تجارت خیال کیا جاتا۔ انہیں کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے۔ البتہ بہت سے فرائض اور ذمہ داریاں ان پر عائد تھیں ان کا قتل وہ جرم نہ سمجھا جاتا جس سے قصاص لازم ہوتا۔ (16)

عرب معاشرہ

ان مذاہب کے علاوہ عرب کا وہ معاشرہ جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی وہاں بھی بعثت سے قبل آدمیت کا کوئی احترام نہ تھا۔ انسانوں کو متعدد طبقات میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ غلام اور لونڈی نہ کسی حق کے مالک تھے اور نہ ہی اپنی رائے کا اظہار کر سکتے تھے۔

غلاموں کے بارے میں ڈاکٹر جواد علی نے کہا:

"لَيْسَ لَهُ اَنْ يَّتَصَرَّفَ بِاَيِّ شَيْءٍ يَّعُوْدُ اِلَيْهِ وَلَا اَنْ يَّتَصَرَّفَ بِنَفْسِهٖ"

غلام کسی بھی معاملے میں اپنا حق تصرف استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ (17)

عربوں کے ہاں فصاحت کا استعمال زیادہ تر خودستائی اور دوسری قوموں کی تحقیر میں کیا جاتا۔ (18) انہیں اپنی زبان کی ساخت اور مفہوم کی ادائیگی کی صلاحیت پر اتنا ناز تھا کہ اپنے سوا پوری دنیا کو گونگا (عجم) سمجھتے تھے۔ (19)

مختلف مذاہب کے اس تاریخی جائزہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمام تہذیبیں احترام آدمیت میں مساوات کے تصور سے نابلد تھیں۔ ان میں نسلی، طبقاتی، خاندانی اور جغرافیائی بنیادوں پر تقسیم موجود تھی۔

احترام آدمیت اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی معاشرتی، سیاسی، اخلاقی اور دینی حالت اس قدر ابتر تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ ال عمران کی آیت نمبر 164 میں "ضلل مبین" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ آپ اپنی تعلیمات کے ذریعہ زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب لائے۔ لوگوں کو زندگی گزارنے کا شعور دیا۔ معاشرتی برائیوں کا سدباب فرمایا، معاشرتی برائیوں میں سے اس عالمگیر برائی کی بھی اصلاح فرمائی، جس نے انسانیت کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا تھا۔ آپ نے بامقصد اور غیر فطری معیار فضیلت و

عزت کوختم فرمایا۔ معیار فضیلت کے ان درجات کی بجائے صرف انسان ہونا ایک ایسا معیار قرار دیا جس کے پیش نظر ایک انسان کا بحیثیت انسان احترام کرنا ضروری قرار دیا گیا خواہ اس کا کوئی دین ہو کسی علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔ کسی طبقہ زندگی سے متعلق ہو اور کوئی اس کا رنگ ہو۔

احترام آدمیت کو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں دیکھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ احترام آدمیت کو دو طرح سے متعین کیا گیا ہے۔

(i) دینی لحاظ سے

(ii) محض انسان ہونے سے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض وہ ارشادات ہیں جن میں مسلم انسان کے احترام کو اور انداز میں اور عام انسانوں کو ایک الگ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ احترام آدمیت کی یہ تفریق قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ مومن کے قتل کے بارے فرمایا گیا:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّلَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (النساء:93)

ترجمہ: اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار رکھا ہے۔

اس آیت میں مومن کی جان کی حرمت پامال کرنے پر چار سزاؤں کا اعلان کیا گیا۔ یہ وہ سزائیں ہیں جو کسی بھی دوسرے جرم کے لئے نہیں ہیں۔ جب کہ غیر مسلم جس کا احترام محض انسان ہونے کے ناطے سے ہے' کے قتل کے بارے فرمایا گیا:

﴿وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ﴾ (النساء:92)

ترجمہ: اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے تو پھر خون بہا ہے جو اس کے گھر والوں کو پہنچایا جائے۔

مسلمانوں کے قتل کی حرمت کا ذکر رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں اس طرح فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ دِمَآءَ كُمْ اِلٰٓى اَنْ تَلْقَوْا رَبَّكُمْ كَحُرْمَةِ شَهْرِكُمْ هٰذَا كَحُرْمَةِ بَلَدِكُمْ هٰذَا وَكَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا". (20)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے خون کو قیامت تک حرام قرار دیا جیسے اس ماہ کی، اس شہر کی اور اس دن کی حرمت ہے۔

احترام آدمیت کی یہ حدود اس دنیا سے متعلق ہیں۔ آخرت میں محض انسانیت کے ناطے سے احترام آدمیت نہیں ہوگا۔ وہاں ہر انسان کو اس کے عمل کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں احترام آدمیت کی یہ صورتیں نمایاں نظر آتی ہیں:

نفس انسانیت کا احترام

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسان کا احترام بحیثیت انسان کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اس احترام کی بنیاد سورۃ الاحزاب کی یہ آیت ہے ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط﴾ (الاحزاب:72)

ترجمہ: ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا۔

چونکہ اس انسان کو ہی امانت کے اٹھانے کی صلاحیت عطا کی گئی لہٰذا اس کا احترام لازمی قرار دیا گیا۔

وہ جانور جس کا گوشت نہیں کھایا جاتا اس کی بنیاد اس کی کوئی منفی صلاحیت ہے جب کہ انسان کے گوشت کو اس کے احترام کی وجہ سے حرام قرار دیا گیا۔

احترام آدمیت کے پیش نظر قتل انسانی کو کبیرہ گناہ قرار دیا گیا۔ اس ضمن میں فرمایا گیا:

اَوَّلُ مَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ فِي الدِّمَآءِ (21)

قیامت کے روز لوگوں میں (حقوق العباد میں سے) سب سے پہلے قتل کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

نفس انسان کی حرمت سے متعلق سنن ابن ماجہ میں ایک روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے خلاف مسلمانوں کا ایک لشکر روانہ فرمایا۔ جنگ کے بعد ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کی یا رسول اللہ! جنگ کے دوران میں ایک شخص کو قتل کرنے کے لئے بھاگا جب میں اس کے قریب ہوا تو اس نے کہا "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِنِّيْ مُسْلِمٌ" (میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں بے شک میں مسلم ہوں)۔ اس کے باوجود میں نے اسے قتل کر دیا تو آپ نے غصے میں فرمایا "هَلْ شَقَقْتَ عَنْ بَطْنِهٖ" کیا تو نے اس کا بطن پھاڑ کر دیکھا تھا کہ اس نے جان بچانے کے لئے ایسا کہا۔

کچھ دیر کے بعد وہ شخص مر گیا اس کی تجہیز و تکفین کے بعد اس کی تدفین کی گئی۔ دوسرے روز دیکھا کہ "اَصْبَحَ عَلَى الْاَرْضِ" کہ اس کی لاش قبر سے باہر پڑی ہوئی ہے۔ اس کے گھر والوں نے سوچا کہ ان کے کسی مخالف نے ایسا کیا۔ پھر اسے دفن کیا اور نگرانی کے لئے ایک غلام مقرر کیا لیکن دوسرے روز پھر ایسا ہی پایا گیا۔ اس کے وارثوں نے خیال کیا کہ شاید اس غلام نے ایسا کیا ہو۔ پھر تدفین کے بعد وارثوں میں سے ایک وارث نے خود قبر کی حفاظت

کی لیکن پھر بھی زمین نے اسے قبول نہ کیا پھر اس لاش کو کسی گھاٹی میں پھینک دیا گیا [22]

ایک اور روایت میں ہے کہ نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینت نے طواف کعبہ کے دوران کعبہ مکرمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

مَآ اَطْیَبَکَ وَاَطْیَبَ رِیْحُکَ مَآ اَعْظَمَکَ وَاَعْظَمَ حُرْمَتُکَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَحُرْمَۃُ الْمُؤْمِنِ اَعْظَمُ عِنْدَاللّٰہِ حُرْمَۃً مِّنْکَ [23]

ترجمہ: تو کتنا اچھا ہے اور تیری خوشبو کتنی اچھی ہے تو کتنا عظیم ہے اور تیری حرمت کتنی عظیم ہے! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مومن کی حرمت تیری حرمت سے زیادہ عظیم ہے۔

ان روایات میں اگر چہ دینی بنیاد پر مسلم اور غیر مسلم کی قدرے تفریق کا اظہار ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر مذہب میں بعض ایسے قوانین وضوابط ہوتے ہیں جن کے مطابق آدمیت کی حرمت کے باوجود اس جرم کے ارتکاب کی بنا پر اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔

ان ضابطوں کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نسلی، قومی، جغرافیائی، مادی اور دینی بنیادوں سے ہٹ کر احترام آدمیت کا سبق دیا اور کسی بھی صورت میں خلاف قانون کسی انسان کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی' خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا جوان۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جب بھی کوئی مہم روانہ فرماتے تو انہیں محاربین کے علاوہ کسی آدمی کو قتل کرنے کی اجازت نہ دیتے۔

چہرے پر مارنا

چہرہ چونکہ انسان کا سب سے زیادہ محترم مقام ہوتا ہے لہٰذا نبی مکرم (ﷺ) نے اس کا احترام بھی جسم کے دیگر اعضاء سے زیادہ کرنے کا حکم فرمایا۔ اس ضمن میں آپ کا یہ

ارشادگرامی ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ضَرْبِ الْوَجْهِ (24)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسان کے چہرے پر مارنے سے منع فرمایا۔

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

اِذَا قَاتَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَجْتَنِبَ الْوَجْهَ (25)

ترجمہ: جب باہم لڑائی جھگڑا ہو جائے تو چہرے پر مارنے سے اجتناب کیا جائے۔

مُثلہ سے ممانعت

عہد رسالت سے پہلے میں بعض اوقات لوگ اپنے مخالفین اور دشمنوں کو قتل کرتے وقت نہایت اذیت ناک طریقوں سے قتل کرتے، جن میں ایک طریقہ مُثلہ کا طریقہ تھا۔ اس طریقہ میں ایک ہی بار کسی شخص کو قتل کرنے کی بجائے مختلف اعضاء کاٹ کاٹ کر چھوڑ دیا جاتا پھر اس اذیت سے وہ انسان مر جاتا یا اسے ایسے قتل کیا جاتا۔

اس طریقہ کو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احترام آدمیت کے خلاف قرار دیتے ہوئے اس کی ممانعت فرمائی، مسند احمد میں ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُثْلَةِ (26)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا۔

مردہ انسان کا احترام

زندہ انسان کی تو ہر کوئی قدر بھی کرتا ہے اور احترام بھی لیکن مردہ انسان کے بارے بالعموم یہ تصور ہوتا ہے کہ اس کا احترام کیوں کیا جائے وہ کون سا دیکھتا ہے اسے تکلیف دینے سے کون سی تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس کے احترام میں کیا فرق آتا ہے۔ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس تصور کی بھی کلیتاً نفی فرمائی اور مردہ انسان کا بھی اس حوالے سے اسی طرح احترام کرنے کا حکم فرمایا جیسے کسی زندہ کا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں

روایت ہے کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ مِثْلُ كَسْرِ عَظْمِ الْحَيِّ (27)

ترجمہ: میت کی ہڈی کو توڑنا ایسے ہی ہے جیسے کسی زندہ انسان کی ہڈی کو توڑنا۔

قبر میں مدفون انسان کا احترام

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف زندہ انسانوں کے احترام کا حکم دیا بلکہ آپ نے قبر میں مدفون انسانوں کا بھی احترام کرنے کا حکم دیا ہے۔ مردہ انسانوں کے احترام کی صورت آپ نے یہ ارشاد فرمائی کہ ان کی قبور پر نہ بیٹھا جائے۔ صحیح مسلم میں روایت ہے:

لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ (28) قبروں پر نہ بیٹھا جائے۔

ایک اور حدیث میں آپ نے قبروں پر بیٹھنے کی وعید ان الفاظ میں فرمائی:

لَاَنْ يَّجْلِسَ اَحَدُكُمْ عَلٰى جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِيَابَهٗ فَتَخْلُصَ اِلٰى جِلْدِهٖ خَيْرٌ لَّهٗ اَنْ يَّجْلِسَ عَلٰى قَبْرٍ (29)

ترجمہ: کسی شخص کا کسی چنگاری پر بیٹھنا اس سے اس کے کپڑے جلنا اور اس کا اس کی جلد تک پہنچنا اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی قبر پر بیٹھے۔

عیادت مریض

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے زرتشت مذہب میں بیمار انسان کسی شفقت کا مستحق نہیں رہتا۔ وہ قابل نفرت ہو جاتا ہے کیونکہ بیماری اس بات کی علامت ہے کہ اس پر بری قوت نے قابو پا لیا ہے۔

اس تصور کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احترام آدمیت کے خلاف قرار دیا۔ اس کے برعکس آپ نے عیادت مریض کو انتہائی مستحسن فعل قرار دیا اور آپ بذات خود بلاتفریق مذہب محض انسانیت کے ناطے سے مریضوں کی عیادت فرماتے۔

عیادت مریض سے متعلق سیدنا موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"عُوْدُوا الْمَرِیْضَ" مریض کی عیادت کرو۔ (30)

یہاں پر مطلقاً مریض کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس سے مراد ہر مریض ہے خواہ وہ کسی مذہب کا ہے یا معاشرتی لحاظ سے کسی طبقہ کا۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مریض کی عیادت کرنے والے کے لئے فرشتے دعا کرتے ہیں۔ (31)

ایک اور حدیث میں انسان کے مریض ہونے کو اللہ تعالیٰ نے خود کا مریض ہونا اور انسان کی عیادت کو اپنی عبادت قرار دیا ہے۔ (32)

اس سے بڑھ کر آدمیت کا احترام اور کیا ہوسکتا ہے کہ آدمی کے بیمار ہونے کو اللہ تعالیٰ اپنا بیمار ہونا اور اس کی تیمارداری کو اپنی تیمارداری قرار دے۔

غلام اور آزاد میں عدم تفریق

بعثت نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وقت غلام کسی بھی تکریم کے مستحق نہ تھے۔ نہ ان کا معاشرتی وقار تھا' نہ انہیں کوئی اہم ذمہ داری سونپی جاتی تھی۔

ظہور اسلام کے بعد جب مؤذن کے تقرر کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس وقت حضور شفیع امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غلام وآزاد کی تفریق کے بغیر اور تکریم آدمیت کی بنیاد پر یہ اہم ذمہ داری سیدنا بلال رضی اللہ عنہ' جو کہ ایک حبشی غلام تھے' کو سونپ دی۔ آپ کی اس تقرری پر کفار نے کہا تھا:

مَاوَجَدَ مُحَمَّدٌ غَیْرَ ھٰذَا الْغُرَابِ الْاَسْوَدِ مُؤَذِّنًا۔ (33)

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اس کالے کوّے کے علاوہ کوئی مؤذن نہیں!

کفار کے اس طعن کے باوجود سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے مؤذن کے منصب پر قائم رکھا۔

امیر و غریب کا فرق

ہر معاشرے میں انسان کا احترام اس کی معاشی حالت کی بنا پر کیا جاتا رہا اور آج بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ انسان کا احترام محض انسان ہونے کے ناطے سے کرتے نہ کہ امیر اور دولت مند ہونے کے ناطے سے۔

ایک بار آپ نے ایک شخص سے مصافحہ فرمایا تو دیکھا کہ اس کے ہاتھ پھٹے ہوئے ہیں۔ آپ نے پوچھا ان ہاتھوں کو کیا ہوا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! میں ان ہاتھوں سے کسّی کا کام کرتا ہوں جس کی وجہ سے یہ پھٹ گئے ہیں۔ آپ نے ان ہاتھوں کو چوما اور فرمایا "ان ہاتھوں کو آگ نہیں چھوئے گی"۔ (34)

ان تمام روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری دنیا کو احترام آدمیت کا وہ سبق دیا ہے جس سے دنیا کے تمام بانیان مذاہب کلیتاً خاموش ہیں۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی آدمیت کا احترام یا تو نسلی بنیادوں پر ہوتا ہے یا رنگ اور نسل کی بنیاد پر۔ کہیں دولت کی بنیاد پر انسان کی عزت کی جاتی ہے اور کہیں جغرافیائی لحاظ سے۔

امریکہ کے MEMPHIS میم فس شہر میں کتنے ایسے گرجے ہیں جن کے صدر دروازوں سے کالے افراد کو گذرنے کی اجازت نہیں۔ ان کے لئے الگ دروازے بنائے گئے ہیں۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان کا احترام انسان ہونے کے ناطے سے کیا جائے تا کہ ہر انسان عزت سے اپنی زندگی بسر کرے۔ عزت کی زندگی گزارنے کی بنا پر انسان معاشرے میں مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔ جس سے نہ صرف اس کو فائدہ ہوگا بلکہ پوری انسانیت اس سے مستفید ہوگی۔

مصادر و مراجع

(1) امام راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، نور محمد کارخانہ کتب (ت،ن) کراچی، (بذیل مادہ حرم)، ص 114

(2) مجد الدین فیروز آبادی، القاموس المحیط، دار الکتب العلمیہ، 1995، بیروت 33/4۔

(3) محمد مظہر الدین صدیقی، اسلام اور مذاہب عالم تقابل مطالعہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1997۔ لاہور ص 4۔

(4) پیر محمد کرم شاہ ضیاء النبی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 1420ھ لاہور، 182/1۔

(5) پیر محمد کرم شاہ ضیاء النبی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 1420ھ لاہور، 189-181۔

(6) پیر محمد کرم شاہ ضیاء النبی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 1420ھ لاہور، 189

(7) زرتشت دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے آج کل اس کے ماننے والوں کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار ہے۔ یہ فارس کی عظیم سلطنت کا مذہب تھا۔ زرتشت کو لاطینی میں ZARATHUSTRA ذراتشتر کہا جاتا ہے۔ (لیوس مور، مذاہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا، مترجم یاسر جواد، سعدیہ جواد، نگارشات، 2003ء لاہور ص 79)

(8) جیسے خدائے واحد جو اپنی ذات وصفات میں واحد ہے خیر و شر کی طاقتوں کا الگ الگ وجود ہونا اور جنت و دوزخ کا تصور وغیرہ۔ (عماد الحسن فاروقی! دنیا کے بڑے مذاہب، مکتبہ تعمیر انسانیت، 1990، لاہور، ص 162-173)

(9) جیسے توحید، خیر و شر کی الگ الگ قوتیں ہونا اور اخلاقیات میں صدق کی اہمیت وغیرہ کراچی، (230-265)

(10) پیر محمد کرم شاہ، ضیاء النبی 182/1

(11) پیر محمد کرم شاہ، ضیاء النبی 45/1

(12) اس مقام کو "Tower of silence" کہا جاتا ہے۔ یہ مینار آج بھی انڈومان اور گلوبار کے جزائر اور مغربی افریقہ میں موجود ہیں۔ یہ ٹاور امریکی فٹ بال سٹیڈیم کی طرح ہوتا ہے۔ یہ گول اور آسمان تلے کھلا ہوتا ہے اس داکھما یا دخمہ کہا جاتا ہے۔ اس کے اندر کھلے قطعات اور وسط میں ایک خشک کنواں ہوتا ہے انسانی جسم کو ایک احاطے میں رکھ کر اس کے کپڑے اتار دیے جاتے ہیں یا انہیں پھاڑ دیا جاتا ہے اور لوگ وہاں سے چلے جاتے ہیں چند ہی لمحوں کے اندر گدھ جسم پر جمع ہو جاتے ہیں اور آدھ گھنٹے کے اندر جانور جسم کو کھا جاتے ہیں بعد میں خشک ہڈیاں داکھما کے وسطی کنویں میں پھینک دی جاتی ہیں۔ اس طرح زرتشتی کی لاش کو آگ اور

پانی کو آلودہ کیے بغیر ختم کر دیا جاتا ہے۔(لیور مور، مذاہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا ص 90)، ڈاکٹر حکیم سید قدرت اللہ حسامی، اسلام اور میڈیکل سائنس، (علاج و معالجہ میں نبوی ہدایات، مکتبہ دانیال شیخ محمد بشیر (ت،ن) لاہور ص 69)

(13) پیر محمد کرم شاہ ضیاء النبی (ﷺ) 45/1۔

(14) ڈاکٹر حمید اللہ، رسول اکرم (ﷺ) کی سیاسی زندگی، پیراگراف نمبر 751، دارالاشاعت، 1980ء، کراچی ص 324۔

(15) سید قطب شہید، شبہات حول الاسلام، ترجمہ اسلام میں جدید ذہن کے شبہات، مترجم محمد سلیم کیلانی، البدر پبلی کیشنز، 1981، لاہور، ص 60۔

(16) سید قطب شہید، شبہات حول الاسلام، ترجمہ اسلام میں جدید ذہن کے شبہات، مترجم محمد سلیم کیلانی، البدر پبلی کیشنز، 1981، لاہور، ص 60۔

(17) ڈاکٹر جواد علی المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، دارالعلم۔ 1970ء بیروت، 570/5۔

(18) 18- قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی (ت،ن) لاہور، 29/1۔

(19) ڈاکٹر حمید اللہ رسول اکرم (ﷺ) کی سیاسی زندگی، (پیراگراف نمبر 751) ص 324۔

(20) عبدالملک بن ہشام، السیرۃ النبویہ، مصطفیٰ البابی، 1936ء، مصر 250/4

(21) امام بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب الدیات، حدیث نمبر 6864) نور محمد 1935، کراچی، 1014/2۔

(22) امام مسلم، الجامع الصحیح، (کتاب القسامۃ والمحاربین، باب مجازاۃ بالاماء فی الآخرۃ، نمبر 4381)، سعید کمپنی (ت،ن)، کراچی، ص 290

(23) امام مسلم، الجامع الصحیح، (کتاب القسامۃ والمحاربین، باب مجازاۃ بالاماء فی الآخرۃ، نمبر 3932) امام احمد المسند، 439/1،

(24) امام احمد، المسند، 118/2۔ امام مسلم، الجامع الصحیح (کتاب اللباس، باب النہی عن ضرب الوجہ، نمبر 5550) 202/2۔

(25) امام مسلم، الجامع الصحیح (کتاب البر والصلۃ، باب النہی عن ضرب الوجہ، نمبر 6651) 327/2

(26) امام احمد، المسند 12/5,246,440/4

(27) امام احمد، المسند 100/6

(28) امام مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الجنائز، باب فی النہی عن الجلوس علی القبر، نمبر 2250)، 312/1۔

(29) امام مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الجنائز، باب فی النہی عن الجلوس علی القبر، نمبر 2248)، 312/1۔

(30) امام بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب المرضٰی، باب وجوب عیادۃ المریض، نمبر 5649)، 843/2۔

(31) امام ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، (ابواب الجنائز، باب ماجاء ثواب من عاد مریضا، نمبر 1442)۔ ص 105

(32) امام مسلم، الجامع الصحیح (کتاب البر والصلۃ، فضل عیادۃ المریض نمبر 6556)۔ 318/2

(33) پیر محمد کرم شاہ، ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 477/4، برہان الدین حلبی، سیرۃ حلبیہ، دارالمامون (ت،ن) مصر، 307/2

(34) ابوبکر بن علی خطیب، تاریخ بغداد، المکتبۃ السلیفہ (ت،ن) مدینہ منورہ، 343/7 ابوالحسن علی الجزری، اسدالغابہ، مترجم محمد عبدالشکور فاروقی (تذکرہ سعد انصاری مکتبہ نبویہ، 1407ھ لاہور، 78/4۔

احترام انسانیت

صوفیاء کے افکار و تعلیمات کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس
جی سی یونیورسٹی، لاہور

احترام انسانیت

صوفیاء کے افکار و تعلیمات کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

صوفیاء کے طائفہ منصورہ نے تزکیہ نفس کے نبوی منہاج پر عمل کرتے ہوئے محبت الٰہی، اخلاق حسنہ اور خدمت خلق جیسے اوصاف و کمالات حاصل کیے۔ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نتیجہ میں یہ لوگ خالقِ دو جہاں کی صفتِ ربوبیت کے مظہر بن گئے۔ اس لئے ان کی حیات طیبہ (1) جود و سخا، محبت و یگانگت، ایثار، تحمل، رواداری اور حسن اخلاق کا ابر کرم تھی۔ یہ لوگ انسانی زندگی کے دھاروں سے الگ نہیں رہے بلکہ ان دھاروں میں رہ کر، ان کو صحیح سمت کی طرف موڑا، ان لوگوں نے مذہب کو جامد روایات کے مجموعہ کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ ایک زندہ اور متحرک معاشرتی قوت کے روپ میں پیش کیا۔ "برعظیم پاک و ہند میں صوفیاء کا نیا نظام فکر نہ ہوتا تو معاشرتی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھانے والا ہندوستان بہت بڑی سہولت سے محروم رہ جاتا۔ صوفیاء نے تضاد اور نفرت سے بھری ہوئی دنیا کو محبت اور خدمت کا پیغام دیا اور یہاں تک کامیاب ہوئے کہ معاشرتی زندگی میں کوئی سوسائٹی ان سے بازی نہ لے جا سکی۔ صوفیائے کرام اگرچہ بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ایک دوسرے سے بظاہر الگ ہی معلوم ہوتے تھے مگر وہ اپنی تاریخ میں سب سے زیادہ منظم اور سب سے زیادہ بیدار طاقت بنے رہے شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ سیاسی تضاد کے باوجود متحدہ

تمدن کی بنیاد پڑتی چلی گئی۔ آج ہر شخص متحدہ انسانیت کی ستائش میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جن ناگوار حالات میں صوفیائے کرام یہ مشکل فرض انجام دیتے رہے اس کا اندازہ کر سکنا بھی ہم لوگوں کے لئے آسان نہیں۔ سجادہ و دلق ہی کی بنیادوں پر امتیازی پوزیشن دے سکنے والی سوسائٹی میں "طریقت بجز خدمت خلق نیست بہ تسبیح و سجادہ و دلق" کا نعرہ لگانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں، صوفیاء کی پاکیزہ دل اور پاکیزہ کردار سوسائٹی نے وہ سب کچھ کیا جس کی آئیڈیل سوسائٹی سے توقع کی جا سکتی تھی۔" (2)

گویا صوفیاء کی حیات کا یہ سنہری اصول تھا کہ سجدہ کے علاوہ قرب الٰہی کی تمام راہیں مخلوق سے ہو کر جاتی ہیں۔ احترام آدمیت و عظمت انسانیت کا جو تصور ہمیں صوفیاء کے ہاں نظر آتا ہے، وہ بعض اہل الظاہر علماء کے ہاں نظر نہیں آتا کیونکہ اول الذکر کے ہاں علم کے عملی پہلو کا غلبہ رہا اور ثانی الذکر کے ہاں نظری جہت پر توجہ زیادہ رہی۔ (3)

قرآن کریم میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے بیان کردہ اوصاف کی روشنی میں احترام انسانیت کے دو بنیادی پہلو ہیں:

(ا) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رؤف ہونا

(ب) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رحیم ہونا (4)

ان میں سے ایک صفت کا تعلق دفع شر سے ہے اور دوسری میں عطائے خیر اور رحمت کے دوام کی طرف اشارہ ہے۔ گویا انسانیت کو حتی المقدور مصائب و آلام، دکھ درد اور پریشانیوں سے بچانا راحت کے سامان بہم پہنچانا اور اس کام کو تسلسل و دوام سے کرنا احترام انسانیت و آدمیت کا تقاضا ہے۔ صوفیاء کے ہاں یہ جذبہ بلا تفریق مذہب و ملت پایا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بعض صوفیاء پر یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ وحدت ادیان کے قائل تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے شریعت محمدی پر مضبوطی و استقامت سے عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے افکار و نظریات پر غیر متزلزل یقین و ایمان کے ساتھ خلق کو عیال اللہ سمجھا۔ احترام انسانیت

کے اسی جذبہ کا اثر تھا کہ برصغیر میں ہندو، سکھ بھی صوفیاء کے عقیدت مندوں میں نظر آتے ہیں۔ (5)

صوفیاء نے اس فریضہ کو اپنی زندگی میں نبھانے کا حق تو ادا کیا ہی وصال کے بعد بھی نفع رسانی اور فیض رسانی کے یہ سلسلے جاری رہے۔ زیر نظر تحریر میں صوفیاء کے جذبہ احترام انسانیت کا جائزہ تین مختلف جہات سے لینے کی کوشش کی جائے گی:

(ا) صوفیاء کے ہاں رائج اصطلاحات میں اس جذبہ کا عنصر

(ب) باہمی احترام، رواداری، حسن اخلاق، تحمل و بردباری، عفو و درگزر کے علاوہ احترام انسانیت کے دیگر مظاہر تقاضوں کے حوالہ سے صوفیاء کے ارشادات

(ج) ان حوالوں سے حیات صوفیاء کے چند واقعات

(ا) صوفیاء کے ہاں رائج اصطلاحات

تصوف، علم و عرفان اور تکمیل ذات کا ایک وسیع میدان ہے، مرور زمانہ سے، جب یہ ایک فن کی شکل اختیار کر گیا تو صوفیاء نے اپنی اصطلاحات وضع کیں، جن سے اگرچہ بعض غلط فہمیوں نے بھی جنم لیا مگر یہ اپنے اندر حقائق کا جہاں رکھتی ہیں۔ ذیل میں کچھ ایسی اصطلاحات کا ذکر کیا جاتا ہے جو احترام انسانیت سے تعلق رکھتی ہیں:-

(1) خانقاہ/لنگر (6)

تصوف کے حوالہ سے مروجہ یہ دونوں اصطلاحات، انسان دوستی، باہمی محبت و الفت اور کفالت کی مظہر ہیں۔ یہاں ضروریات دنیا کی تکمیل ہوتی اور مدارج روحانی بھی طے ہوتے۔ صوفیاء کی ان خانقاہوں نے انسان سازی اور تہذیب گری کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ خانقاہوں نے حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد کی اہمیت پر اس طرح زور دیا کہ تعصب سے پاک "انسانی وجود" تیار ہوئے۔ ان خانقاہوں نے لاکھوں انسانوں کی دل کی دنیا تو بسائی ہی مگر شہر اور بستیاں بھی آباد کیں۔ (7)

ان خانقاہوں کی سرگرمیوں کے بارے میں چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:۔

(i) خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کا تذکرہ نثار احمد فاروقی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"حضرت کی خانقاہ سلاطین و امراء، علماء و فقہا، عوام و خواص، نوکر پیشہ اور اہل حرفہ فقراء اور مساکین سب کے لئے ایک مرکز کشش بن گئی تھی۔ یہاں قلب و روح کا تزکیہ و تجلیہ بھی ہوتا تھا۔ سیرت و اخلاق کی اصلاح بھی کی جاتی تھی۔ احکام شریعت کی پاسداری کا درس بھی دیا جاتا تھا' دکھ درد کے مارے ہوئے انسانوں کو تسکین اور تسلی بھی ملتی، فقراء و مساکین کے لئے کھانا کپڑا بھی فراہم ہوتا تھا، دعا اور ہمت درویشاں کے طالبوں کو تعویذ بھی دیا جاتا تھا، ہر آنے جانے والے کے لئے ایک عام لنگر بھی کھلا ہوا تھا۔ قدم قدم پر دستگیری و رہنمائی بھی ہو رہی تھی"۔ (8)

خلیق نظامی لکھتے ہیں:

"تقریباً پچاس سال تک انسانی دلوں نے اس طرح ان کی خانقاہ میں راحت و سکون حاصل کیا جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر، تمازت آفتاب سے خستہ جان، ٹھنڈے اور سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر فرحت و اطمینان کا سانس لیتا ہے، حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا، امیر غریب، عارف و عامی، شہری اور دیہاتی، بوڑھے اور بچے سب ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے"۔ (9)

سلسلہ چشتیہ کی خانقاہوں کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ان بزرگوں کی خانقاہوں میں ہندو اور مسلمان سب ہی جمع ہوتے تھے

ان مشائخ نے اختلافات کے پردوں کو ہٹا کر ان میں ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی اور ایسا عمدہ سماجی ماحول پیدا کر دیا کہ یہ سماجی نظام اپنے مضبوط معاشرہ کو ایک مضبوط سیاسی نظام کی شکل میں ظاہر کر سکا"۔ (10)

(ii) شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ ایک بڑی درس گاہ تھی جہاں طلباء کی تمام ضروریات پوری ہوتیں۔ تمام مصارف شیخ خود پورے کرتے۔ اس خانقاہ کی امتیازی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے حمید اللہ شاہ ہاشمی لکھتے ہیں:

"اس خانقاہ میں طلباء کو ترک و تجرید اور ترک علائق کی تعلیم نہ دی جاتی تھی بلکہ حکم تھا کہ خلفاء و مرید عام دنیا داروں کی طرح رہیں۔ عیش و آرام سے زندگی بسر کریں۔ روپیہ پیدا بھی کریں اور رکھیں بھی، مگر اطاعت الٰہی و ذکر ربانی سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہوں اور معاصی سے بچتے رہیں"۔ (11)

(iii) شاہ غلام دہلویؒ کی خانقاہ کا نقشہ سر سید احمد خاں نے یوں پیش کیا ہے:

"میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام، بغداد، مصر، چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھتے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے، حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا"۔ (12)

سر سید احمد خاں مزید لکھتے ہیں:

"اس پر فیاضی اور سخاوت اس قدر تھی کہ سائل کو کبھی محروم نہ پھیرا۔ جو اس

نے مانگا، وہ دیا جو چیز عمدہ اور تحفہ آپ کے پاس آتی' اس کو بیچ کر فقراء پر صرف کرتے"۔ (13)

(iv) حضرت نور الحق المعروف نور قطب عالم کی خانقاہ بنگال میں تھی، اس خانقاہ سے متعلق شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

"وہ اپنے والد کی خانقاہ کے تمام درویشوں کی ساری خدمتیں بجالاتے، ان کے کپڑے دھوتے، ان کے لئے پانی گرم کرتے، کوئی بیمار ہوتا تو ساری خدمتیں، جو ایک ماں بھری ماں بیمار بچے کی بجالاتی ہے، پوری کرتے، آٹھ سال تک اس خانقاہ کے لئے انہوں نے لکڑیاں کاٹی ہیں" (14)۔

(vi) شیخ جلال الدین تبریزی کے بارے میں شیخ محمد اکرام نے لکھا:

''اس ملک کے ہندو مسلمان سب شیخ کی زیارت کو آتے اور ان کے واسطے تحفے اور نذر لاتے ہیں۔ اس میں سے فقراء اور مساکین کھاتے ہیں اور شیخ فقط اپنی گائے کے دودھ پر گزارہ کرتے۔ (15)

ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "خانقاہ" نے ایک کلچر کو فروغ دیا جس کی بنیاد وحدت نسل انسانی کے اسلامی اصول پر تھی، اس وجہ سے یہاں سے انسان دوستی، علم دوستی' خدمت خلق، ہمدردی و محبت جیسے افکار پر مبنی تحریک اٹھی' جس نے برصغیر کے صنم پرست تمدن کو اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنایا۔ اگر خانقاہیں آج بھی اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کریں تو نفرتوں، کدورتوں اور کبر و نخوت کے بت خانوں کو مسمار کر کے اخوت و محبت، امن و آشتی اور وحدت و یگانگت پر مبنی اسلامی تہذیب کو رواج دیا جا سکتا ہے"۔ (16)

(2) القاباتِ صوفیاء

تصوف کی اصطلاحات میں بعض صوفیاء خاص القابات سے پہنچانے جاتے ہیں، لوگ ان بزرگوں کو اصل ناموں کی بجائے ان القابات سے ہی پہچانتے ہیں۔ فقہاء کی ان القابات پر تنقید اپنی جگہ، مگر یہ القاب بذات خود صوفیاء کے جذبہ احترام انسانیت کے آئینہ دار ہیں۔ "غوث العالمین"، "غوث اعظم"، "داتا گنج بخش"، "نوشہ گنج بخش"، "غریب نواز" اور "گنج شکر" یہ سب صوفیاء کے انسانوں کے ساتھ روابط، حسن سلوک، محبت و انس، اور حسن معاشرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ان القابات کو فقہ کی میزان پر تولنے کے بجائے صوفیاء کے جذبہ خدمت خلق کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ یہاں صرف ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کے حوالہ سے حضرت بابا فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے لقب کی موضوع زیر بحث کے حوالہ سے وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس تلقیب کی کئی وجوہات اور اس سلسلے میں دلچسپ واقعات مذکور ہیں جو صرف سننے اور سر دھننے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو ہمارے نزدیک بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کی تلقیب "شکر گنج" یا "گنج شکر" کا حقیقی سبب وہ حلم و بردباری، شفقت و رحمت، لطافتِ کلام اور شگفتگی گفتار ہے جو انہیں عشق مصطفٰی علیہ التحیہ والثناء اور پیروی اسوہ حسنہ کے طفیل عطا ہوئی تھی۔ بابا سائیں دلکش، پیکرِ محبت اور سراپا مہر و لطافت تھے، کھلا کھلا چہرہ، مسکراتے ہونٹ، میٹھی رسیلی زبان اور پرسوز گونج دار آواز کے مالک تھے، ہر چھوٹے بڑے سے ملتے ہوئے مسکراتے اور محبت و شفقت کے پھول بکھیرتے ہوئے بات کرتے تھے۔ شاید اسی لئے انہیں ان کے مرشد اور پیر طریقت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے گنج شکر کے لقب سے نوازا...... اللہ تعالٰی کے نیک اور برگزیدہ بندوں کی نمایاں خوبی ہی زبان کی حلاوت اور گفتار کی شیرینی ہے، ان کے معاصرین مریدوں

اور پیروکاروں نے اگر انہیں اس لقب سے نوازا ہے تو یہ بجا طور پر اس کا ثبوت ہے کہ "پاکپتن" کی سلطنتِ تصوف کا یہ عظیم وجلیل بادشاہ اسوۂ حسنہ کی اس خوبی سے متصف تھا جو ہر ملنے والے اور مخاطب کو مصطفیٰ کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کا گرویدہ وفریفتہ بنادیتی تھی۔ فریدالدین مسعود رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں بھی اس خلقِ نبوی کا حظ وافر آیا تھا اور اسی لئے انہیں "گنج شکر" کے اس لقب سے نوازے جانے کا مستحق ٹھہرادیا تھا۔ (17)

شاہ رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ کو "قبلہ حاجات" کہا جاتا۔ اس کی وجہ سیرُ العارفین میں یہ لکھی ہے:

"جو گروہ ان کے پاس پہنچتا اور اس کا جو مدعا ہوتا اس کو پورا کرتے"۔ (18)

(3) کرامت

کرامت در حقیقت حکم الٰہی کی بجا آوری اور اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نتیجہ میں ملنے والی عزت افزائی کی ایک شکل ہے۔ اگرچہ صوفیاء نے اسے چنداں اہمیت نہیں دی مگر ان میں احترام انسانیت کے دونوں پہلو، نفع رسانی اور دفع مشکل، بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ گویا صوفیاء کی کرامت پر نظر ڈالیں تو انسانی حاجات کی تکمیل کا عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ صرف ایک کرامت نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ سیر الاولیاء میں ہے:

مولانا وجیہ الدین پائلیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے دق کی بیماری شروع ہوئی۔ طبیبوں نے مشورہ دیا کہ میں کسی باغ میں دریا کے کنارے سکونت اختیار کروں۔ میں نے طبیبوں سے کہا کہ میرے لئے ایسے مقام کا ملنا مشکل ہے سوائے اس کے کہ سلطان المشائخ کے مکان میں رہوں، جو دریا کے کنارے ہے۔ چنانچہ میں نے وہ دوائیں ساتھ لیں جو طبیبوں نے

میرے لئے تجویز کی تھیں اور سلطان المشائخ کی خدمت میں پہنچا۔ اس وقت آپ روزہ افطار کر رہے تھے۔ سرما کا موسم تھا، کوئی شخص تحفتاً منڈی لے کر آیا تھا، سلطان المشائخ وہ تناول کر رہے تھے۔ مجھ سے بھی آپ نے فرمایا کہ "آؤ بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر کھاؤ۔ باوجود اس کے کہ مجھے دق کی بیماری تھی اور منڈی گرم ہوتی ہے، لیکن سلطان المشائخ کے حکم پر میں نے منڈی کھائی، جب میں سلطان المشائخ کے پاس سے اٹھا تو مجھے شفائے کامل ہو چکی تھی اور مجھے علاج کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ (19)

صوفیاء کے احوال حیات پر کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں اس میں کرامات کا بیان ضرور ملتا ہے۔ اس کی وجہ صوفیاء کے ہاں اس جذبہ محبت انسانی کا بدرجہ کمال پایا جانا ہے۔

(4) وظائف

انسانی رنج و آلام دور کرنے کے لئے صوفیاء نے اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے، اپنے ارادت مندوں کو مختلف اوقات میں وظائف تلقین کئے، ان سے اگر ایک طرف رجوع الی الخالق کا جذبہ نمو پاتا ہے تو دوسری طرف انسان کے غم، پریشانیاں اور مصائب و آلام بھی دور ہوتے ہیں۔ یہ وظائف انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے " انسانی تجربات " کا وہ لافانی شاہکار ہیں کہ آج بھی یہ اپنی مسلمہ افادیت رکھتے ہیں۔ ان اوراد و وظائف کی عنوانات کے حوالہ سے فہرست بنائی جائے تو اس طرح کے عنوانات سامنے آئیں گے۔

(1) حاجت کے پورا ہونے کے واسطے
(2) غم و فکر دور کرنے کے لئے
(3) معاش میں تنگی دور کرنے کے لئے
(4) برائے دفع شر

(5) مشکل کام کے واسطے

یہاں حاجت کے پورا ہونے کے لئے اور دفع شر کے حوالہ سے چند وظائف نقل کئے جاتے ہیں۔

(ا) بابا فریدالدین گنج شکر فرماتے ہیں "اگر کوئی شخص صبح کی سنتوں اور فرائض کے درمیان تین روز تک سورہ بقرہ پڑھے تو اس کا مقصد پورا ہوگا۔" اس مقصد کے لئے حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری فرماتے ہیں" صبح کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان اکتالیس بار سورہ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ اور سید اشرف جہانگیر سمنانی فرماتے ہیں۔"سورہ اخلاص ہزار یا سو مرتبہ پڑھیں۔"(20)

(ب) حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ محمد مراد بدخشی کو لکھتے ہیں:

"دوسری بات یہ ہے کہ خوفناک مواقع میں اور اس جگہ جہاں دشمن کا غلبہ ہو امن ورفاہیت کے لئے سورۃ الایلاف کا پڑھنا مجرب ہے۔ کم از کم گیارہ (11) مرتبہ دن اور ہر رات میں پڑھ لیا کریں۔"(21)

(ب) احترام انسانیت صوفیاء کے ارشادات کی روشنی میں

صوفیاء کی تصانیف، مکتوبات، ملفوظات، اور مواعظ میں احترام انسانی کی اہمیت وافادیت کو مختلف حوالوں سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسے چند ارشادات یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

(i) خواجہ عبیداللہ احرارؒ فرماتے ہیں کہ درویش وہ ہے جیسا کہ حضرت پیر انصار نے فرمایا: خاک بیختہ وآب ریختہ" پس (گیلی مٹی اور پانی کی طرح) بن جائے۔ جس سے نہ کسی کے پاؤں کی پشت خاک آلود ہو

اور نہ پاؤں کا تلہ دُکھنے پائے۔

(ii) حضرت شیخ علی ہجویریؒ لکھتے ہیں: ''مشائخ طریقت کی صحبت کی شرط یہ ہے کہ ہر ایک کو ان کے درجہ کے مطابق پہچانے، بوڑھوں کا ادب کرے، ہم جنسوں کے ساتھ عمدہ سلوک سے پیش آئے اور بچوں کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کرے۔ بوڑھوں کو باپ دادا کی طرح سمجھے۔ ہم جنسوں کو بھائیوں کی مانند اور بچوں کو اولاد کی مانند جانے۔ کینہ، حسد اور عداوت و دشمنی سے اجتناب کرے اور کسی کی نصیحت میں کوتاہی نہ کرے۔ صحبت میں کسی کی کوتاہی نہ کرے اور نہ ایک دوسرے کی قول و فعل میں کوتاہی کرے اس لئے کہ لوجہ اللہ صحبت کرنے والے پر لازم ہے کہ رفیق کے کسی فعل و عمل پر کبیدہ اور آرزدہ خاطر نہ ہو اور اسے اپنے سے اس بناء پر جدا نہ کرے۔'' (22)

آپ مزید لکھتے ہیں: ''اسی طرح بزرگ حضرات کو چاہیے کہ جوانوں کو اپنے پر فوقیت دیں کیونکہ جوان دنیا میں نو وارد ہیں اور ان کے گناہ بہت کم ہیں اور جوانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ بزرگوں کو اپنے پر فضیلت دیں کیونکہ وہ عبادت میں ان سے پہلے ہیں اور خدمت الٰہی میں مقدم۔ جب یہ سب ایک دوسرے کا اس طرح لحاظ و پاس کریں گے تو یہ سب نجات پا جائیں گے ورنہ ہلاک ہو جائیں گے۔'' (23)

(iii) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

میں نے تمام اعمال کے بارے میں تفتیش کی۔ پس میں نے کھانا کھلانے سے افضل اور حسن خلق سے اعلیٰ کوئی عمل نہیں پایا۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا میرے ہاتھ میں ہوتی اور میں اسے بھوکے کو کھلا دیتا جس

سے بر مائے ہوئے ایسے انسان کی کفایت ہوتی جس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اگر میرے پاس ہزار دینار بھی آئیں تو میرے پاس ایک رات بھی نہیں رہ سکتے۔ (24)

(iv) حضرت خواجہ نظام الدینؒ فرماتے ہیں۔ کہ اطاعت کی دو قسمیں ہیں۔ایک لازمی اور دوسری متعدی، اطاعت لازمی یہ ہے کہ اس کا نفع صرف اطاعت کرنے والے کو پہنچے' وہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ، اور اوراد ہیں۔ اطاعت متعدی یہ ہے کہ جس کی منفعت اور راحت دوسروں کو بھی پہنچے اس کا ثواب بے حد و بے شمار ہے۔ طاعت لازمی میں اخلاص قبولیت کی شرط ہے۔ لیکن اطاعت متعدی جس طرح بھی کرے اس میں ثواب ملتا ہے۔"

(v) شیخ ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ سے لوگوں نے پوچھا کہ "اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی کتنی راہیں ہیں؟ فرمایا" یوں تو کائنات کا ہر ذرہ حق تعالیٰ کی رہنمائی کرتا ہے، لیکن کوئی راستہ قریب تر دلوں کی راحت پہنچانے سے نہیں۔ ہم نے جو کچھ پایا ہے اسی راہ سے پایا ہے اور میں اسی کی وصیت کرتا ہوں۔" (25)

فوائد الفواد میں آپ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا گیا ہے" اگر کوئی کانٹا رکھے اور تم بھی جواب میں کانٹا رکھو تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔ ان کلمات کے درمیان فرمایا کہ عوام میں یہ دستور ہے کہ اچھوں کے ساتھ اچھائی اور بروں کے ساتھ برائی لیکن درویشوں میں یہ طریقہ ہے کہ اچھوں کے ساتھ اچھے اور بروں کے ساتھ بھی اچھے" (26)

آپ ہی کا ارشاد ہے" خلقت کا معاملہ تین طرح کا ہے، پہلی قسم یہ ہے

کہ آدمی سے نہ تو کسی کو فائدہ پہنچے نہ نقصان، ایسے لوگوں کا حال جماد جیسا ہے دوسری قسم وہ ہے اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے نقصان نہیں یہ (ذرا) بہتر ہے۔ تیسری قسم ان دونوں سے اچھی ہے اور وہ ایسے آدمیوں کی ہے جن سے دوسروں کو فائدہ تو پہنچتا ہی ہے۔ لیکن کوئی انہیں نقصان پہنچاتا ہے تو اس کا بدلہ نہیں لیتے اور برداشت سے کام لیتے ہیں اور یہ صدیقوں کا کام ہے۔"(27)

(vi) حضرت شرف الدین یحیٰی منیریؒ کا اس سلسلہ میں ایک بصیرت افروز مکتوب ہے جو احترام انسانیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں شریعت اسلامیہ کے مزاج کو واضح کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ احترام انسانیت کے حوالہ سے معاشرہ کے مختلف افراد کی ذمہ داریاں مختلف ہیں:-

" اَلدُّنیَا مَزرَعَۃُ الآخِرَۃِ " دنیا آخرت کی کھیتی ہے، جہاں تک ممکن ہو آخرت کی کمائی کرنے میں مشغول ہونا چاہیے۔ اپنے ہاتھ، زبان اور قلم و کاغذ اور اپنے نقد و جنس سے لوگوں کے دلوں کو خوش کریں، راحت و آرام پہنچائیں اور اس عمل کو ایک عظیم کام جانیں۔ دنیا کے عیوب میں اس کی آفتیں اتنی زیادہ ہیں کہ جلد کے جلد سیاہ کیے جائیں تو بھی اس کے دسویں حصے کا دسواں حصہ بیان نہ ہو سکے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی دنیا میں اس کا ایک ہنر بھی ہے کہ یہ مزرعہ آخرت ہے یعنی آخرت کمانے کی جگہ ہے۔ ایک بزرگ سے لوگوں نے پوچھا حق سبحانہ تعالیٰ تک پہنچنے کی راہ کتنی ہے؟ انہوں نے فرمایا موجودات میں جتنے ذرے ہیں ان میں سے ہر ایک ذرہ کی

تعداد میں خداوند جل وعلا تک پہنچنے کی راہ ہے لیکن کوئی راہ لوگوں کی دلجوئی کرنے اور دلوں کو خوش کرنے سے زیادہ فائدہ منداور نزدیک تر نہیں ہے اور میں نے اسی راہ سے خدا کو پایا اور اپنے مریدوں کو اسی کی وصیت کرتا ہوں۔اے بھائی! شریعت کا حکم ہے:

مَنْ قَضٰی لِاَخِیْهِ الْمُسْلِمِ حَاجَةً قَضَی اللّٰهُ لَهٗ سَبْعِیْنَ حَاجَةً.

جوشخص اپنے مسلمان بھائی کی ایک حاجت پوری کرے اللہ تعالیٰ اس کی ستر حاجتیں پوری کرتا ہے۔

وَقَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ مَنْ کَسَا مُؤْمِناً کَسَا اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَلْفَ حُلَّةٍ وَّقَضَی اللّٰهُ لَهٗ اَلْفَ حَاجَةٍ وَّ کَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ عِبَادَةَ سَنَةٍ وَّغَفَرَ اللّٰهُ ذُنُوْبَهٗ کُلَّهَا وَاِنْ اَکْثَرَ مِنْ نُجُوْمِ السَّمَآءِ وَاَعْطَاهُ اللّٰهُ لِکُلِّ شَعْرَةٍ عَلٰی جَسَدِهٖ نُوْراً وَّرَفَعَ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَ الْقَبْرِ وَ کَتَبَ اللّٰهُ بَرَاءَةً مِّنَ النَّارِ وَجَزَاءً عَلَی الصِّرَاطِ وَاَمَاناً مِّنَ الشَّدَآئِدِ.

جوشخص کسی ایک مومن کو کپڑا پہناتا ہے، قیامت میں اللہ تعالیٰ اسے ہزار جوڑا عطا کرے گا، آسمان کے ستاروں کی گنتی سے زیادہ اگر اس کے گناہ ہوں گے تو وہ معاف کردئے جائیں گے، اس کے جسم کے ہر بال کے برابر انوار کی بارش ہوگی۔اس سے عذاب قبر ہٹا دیا جائے گا، دوزخ کے عذاب سے اس کو چھٹکارا مل جائے گا، پل صراط بے خدشہ گزر جائے گا۔روز قیامت کی سختیوں سے نجات مل جائے گی۔

یہ دولت نفل نمازوں، نفل روزوں میں کہاں ہے، یہی بات ہے کہ ایک دفعہ ایک بزرگ سے لوگوں نے کہا کہ اس ملک کا بادشاہ شب بیداری کرتا ہے اور رات بھر نفل نمازیں پڑھا کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: بیچارے نے اپنی راہ کھودی ہے اور دوسروں کے کام کی راہ اختیار کی ہے، لوگوں نے سوال کیا یا حضرت یہ کیسے؟ فرمایا اس کے خدا تک پہنچنے کی یہ راہ ہے کہ وہ اپنی دولت انواع واقسام کی نعمتوں سے بھوکوں کو کھانا کھلائے، ننگوں کو طرح طرح کے کپڑے پہنائے برباد و پریشان دلوں کو شاد آباد کرے، حاجت مندوں کی حاجت برآری کرے، نفل نمازوں کی مشغولی اور شب بیداری درویشوں، فقیروں کا کام ہے، ہر شخص کو اپنے مناسب کام کرنا چاہیے۔

اے بھائی! اگر کسی شکستہ دل کو پاؤ اور اس ایک دل کو تم نے شاد آباد کر دیا اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم رات بھر شب بیداری کرو۔ اس لئے کہ کسی بھی ٹوٹی ہوئی چیز کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے لیکن دل وہ ہے کہ جتنا زیادہ ٹوٹا ہوا چور ہوا اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

نقل ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی مناجات میں کہا! الٰہی! تجھے کہاں ڈھونڈھوں؟۔ جواب ملا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَاتِ قُلُوْبِهِمْ لِاَجْلِيْ ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس تلاش کرو، عرض کی، آج میرے دل سے زیادہ کوئی دل شکستہ نہیں ہے۔ جواب ملا میں اسی جگہ ہوں۔

ارے بھائی! آخر یہ تو تم نے سنا ہے کہ حضرت رابعہ بصریہ کو اس درجہ نعمت و دولت جو نصیب ہوئی وہ ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے کے سبب سے ہوئی لیکن اس امر میں کوشش کرنا چاہیے کہ جو بھی کسی کو دے وہ بے طلب دے اس لئے کہ فرمایا گیا ہے۔ اَلسُّوَالُ وَاِنْ قَلَّ مِنَ النَّوَالِ وَاِنْ جَلَّ سوال کتنا ہی کم کا ہو اور عطاء و احسان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ سوال کی قیمت بن جاتا ہے اور جسقدر اور جتنا زیادہ کسی کو دے تو اسے بہت قلیل جانے اس لئے کہ ساری دنیا ہی بہت قلیل ہے۔ جیسا کہ امام شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اگر ساری دنیا کی دولت

میرے قبضہ میں ہو تو سب کا ایک لقمہ بنا کر کسی ایک فقیر کے منہ میں ڈال دوں پھر بھی مجھے اس پر شفقت آئے (یعنی اور دیتے کچھ نہ دیا۔) (28)

(ج) حیات صوفیاءؒ سے چند واقعات

صوفیاء کی زندگی کا نمایاں ترین پہلو ہی یہ ہے کہ وہ گفتار کے نہیں کردار کے غازی ہوتے ہیں۔ اسی کردار کے بل بوتے پر وہ اپنی ذات منواتے ہیں۔ انسانیت کا درد رکھنے والا یہ گروہ اتباع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کہنے سے کہیں زیادہ کر کے دکھاتا ہے۔ بادشاہ کے درباروں سے دور رہنے والے یہ لوگ انسانیت کے دکھ درد کے مداوا کے لئے بادشاہوں کے دربار میں بھی گئے۔ سلطان فیروز شاہ کے ایک وزیر نے کسی لڑکے کو گرفتار کر لیا۔ مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ اس کی سفارش کے لئے بیس مرتبہ وزیر کے پاس گئے۔ ایک دن وزیر نے کہا کہ اتنی بار جواب دیا، تمہیں بار بار آتے شرم نہیں آتی۔ آپ کے سینہ بے کینہ میں انسانیت کا درد تھا فرمانے لگے۔ "میں جتنی بار آتا ہوں مجھے ثواب ملتا ہے۔ مگر مظلوم کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ چاہتا ہوں کہ اس مظلوم کو تمہارے ہاتھ سے رہائی دلواؤں اور تم کو ثواب پہنچاؤں۔ (29)

دل کو موہ لینے والا انداز تھا جس نے وزیر کے تکبر کو خاک میں ملا دیا اور آپ کا مرید ہو گیا۔ اسی جذبہ کے تحت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے التمش کو لکھا تھا:

اے والی دہلی! باید کہ با غریباں وفقیراں و درویشاں و مسکیناں نیکو باشی وبا خلق نیکوئی کنی ورعیت پرور باشی۔ ہر کہ با رعیت رعایت کند وبا خلق نیکوئی کند خدائے تعالیٰ اورا نگاہ دارد وجملہ اعداء او (را) دوست دارند۔

اے والی دہلی! تجھے چاہیے کہ غریبوں، فقیروں، مسکینوں کے ساتھ نیکی سے پیش آئے اور خلقِ (خدا) کے ساتھ نیکی کرے، رعیت پرور ہو، جو بھی رعیت کے ساتھ رعایت کرتا ہے اور خلقت کے ساتھ نیکی کا برتاؤ اللہ تعالیٰ اس کی

حفاظت کرتا ہے اور اس کے دشمن بھی اس کو دوست سمجھنے لگتے ہیں۔ (30)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب اٹھا کر دیکھئے کئی امرائے دربار کو بے کسوں، بے سہارا اور ضرورت مند افراد کی مدد کے لئے لکھا۔ جب کبھی یہ لوگ بادشاہ کے دربار سے منسلک بھی ہوئے تو انسانیت کے اجتماعی مفاد کے لئے ہی ایسا کیا۔ انسانی ہمدردی واحترام سے سرشار ان لوگوں کے چند واقعات درج ذیل ہیں:

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں محمد ریاض قادری نے لکھا ہے:

"آپ غریب، مفلس، نادار اور پریشان حال لوگوں کی دستگیری فرماتے، ضعیفوں اور فقیروں کے ساتھ تواضع سے پیش آتے۔" "لوگوں کی خطاؤں اور کوتاہیوں سے درگزر فرماتے۔ فقراء کو اپنے دروازے پر کھڑے ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ عطا فرماتے۔" بھوکے کو کھانا کھلانا اور محتاج یتیم اور بیوہ کی حاجت روائی کرنا آپ کا معمول وکرم میں شامل تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی بخشش کی دعا فرماتے، کوئی بیمار ہوتا تو عیادت فرماتے، دعوت قبول فرماتے اور لوگوں کی دلجوئی فرماتے۔ "اگر کسی وقت کچھ بھی پاس نہ ہوتا اپنا پیراہن اسے اتار کر دیتے۔" بلکہ روزانہ لباس اس لئے تبدیل فرماتے کہ پہلا غریبوں کو دیا جا سکے۔" (31)

خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے بارے سیر الاولیاء میں لکھا ہے:

"جب سحری کا وقت ہوتا تو خادم آتا اور دروازے کو کھٹکھٹاتا۔ سلطان المشائخ دروازہ کھولتے، ہر قسم کا کھانا آپؒ کے سامنے لایا جاتا۔ آپ اس میں سے تھوڑا سا تناول کر کے باقی کے لئے فرماتے کہ "چھوٹوں کے لئے محفوظ رکھو" سحری کے کھانے لانے کی خدمت خواجہ عبدالرحیم کے سپرد تھی۔ خواجہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ سلطان المشائخ

سحری بالکل تناول نہ فرماتے۔ میں عرض کرتا کہ "مخدوم! آپ افطاری میں بہت کم کھاتے ہیں، اگر سحری میں بھی آپ کچھ نہ کھائیں گے تو ضعف زیادہ ہو جائے گا۔ یہ سن کر آپ رونے لگتے اور فرماتے "کتنے مسکین اور درویش مسجدوں کے کونوں اور دکانوں میں بھوکے اور فاقے سے سو رہے ہیں۔ یہ کھانا میرے حلق میں کیسے اتر سکتا ہے۔" (32)

آپ کے بارے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جب تک سب کچھ محتاجوں میں تقسیم نہ ہو جاتا آپ کو چین نہ آتا۔ ہر ہفتے حجروں کو خالی کرواتے اور جھاڑو دلواتے۔ (33)

حاصلِ بحث

درج بالا سطور سے واضح ہوتا ہے کہ، مشکوۃ نبوت سے مستنیر یہ طائفہ زکیہ، معنوی اعتبار سے "خیر القرون" کے زیادہ قریب ہوتا ہے، زمانی بُعد ان کے درمیان حائل نہیں ہوتا، اس لئے ان میں اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جذبہ، لفظاً اور معناً دیگر اہلِ اسلام سے زیادہ ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں مخلوق خدا کے لئے محبت، شفقت، معاملات وتعلقات میں راستی، تواضع وانکساری، جیسے احترامِ انسانیت کے تمام لوازمات ان میں بدرجہ کمال پائے جاتے ہیں۔

انسانیت آج مادہ پرستی، انسان دشمنی، قتل وغارت، نفاق اور کبر ونخوت کی جس آگ میں جھلس رہی ہے اس سے بچاؤ کی راہ یہی نفوس قدسیہ ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اب یہاں بھی، عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں آ گئے ہیں۔ اب سادہ لوح بندے کدھر جائیں۔

مصادر و مراجع

1- سورۃ النحل: 97 کی طرف اشارہ

2- برہان احمد فاروقی، قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور 1989ء
ص: 249

3- علماء اور صوفیاء کے کام میں فرق کی نوعیت کو ان اقتباسات سے سمجھا جا سکتا ہے:

''علماء کے مقابلہ میں صوفیوں کے ہاں قوتِ برداشت تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو خدا کی مخلوق سمجھ کر ان سے ہمدردی کرتے تھے اور بادشاہوں کو بھی یہی مشورہ دیتے تھے کہ رعیت کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔ چنانچہ شیخ محب اللہ الٰہ آبادی (متوفی 1648ء) نے شاہ جہاں سے کہاں تھا کہ ہندو اور مسلمان خدا کی مخلوق ہیں اس لئے بادشاہ کو چاہیے کہ وہ رعیت کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اس خط کی عبارت یوں نقل کی گئی ہے۔

حق آنست کہ اندیشہ رفاہیت خلق دامن گیر خاطر حکام باشد چہ مومن و چہ کافر کہ خلق خدا پیدائش خداست و سید این مقام کہ صاحب آں مقام بسر کسے از صالح و فاجر و مومن و کافر رحم کند رسول خدا است صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

(تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجیے: محمد اکرام شیخ؛ رود کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور 1996ء ص 441، مبارک علی ڈاکٹر برصغیر میں مسلم معاشرہ کا المیہ، فکشن ہاؤس لاہور 1997ء، ص 82)

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے بقول:

''مذہبی تصور کی نمائندگی دو طبقے کرتے تھے۔ صوفیاء اور علماء ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ صوفیاء کا مسلک ہی ایسا تھا کہ زندگی کے باہمی تضاد، نفرت اور دشمنی کی طوفان بدوش موجیں اس کی کشتی میں بیٹھنے والوں کو غرق نہ کر سکتی تھیں۔ علماء جن رسوم و اطوار کا ذوق رکھنے کی بناء پر گروہ بندی کے بھنور میں پھنستے چلے گئے تھے صوفیاء ایک ہی جست میں اس سے باہر نکل گئے تھے۔ رسوم و اطوار کی پابندی صوفیاء بھی کرتے تھے مگر انہیں زندگی کی بنیادی سچائیوں سے کبھی ٹکرانے کے قابل نہ ہونے دیا۔ مذہبی علوم ان میں سے بہت کم حضرات ہی کے حصے میں آ سکے تھے مگر پیغمبرانہ روح کی زد سے اس کی بنیادی تعلیم اور اس کے ہموار نظام زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہ رہ سکا۔ رند سبو بدوش ہو یا مذہبی رسوم کا پابند، مسلمان ہو

یا کافر، غریب ہو یا امیر، سبھی کو انہوں نے اپنا بھائی سمجھا، سبھی کی معاشی الجھنوں میں سہارے دیئے اور سبھی کی کمزوریوں کو اپنی کمزرویوں کے برابر سمجھا، اپنی تخیلی طاقتوں کو انہوں نے کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ بلکہ انہیں انفرادی زندگی کی گوناگوں مشکلات حل کر سکنے کے لئے مفید بنالیا۔ (برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر، قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور 1989ء ص 268)

4- التوبہ: 128' علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔ رؤف : یدفع عنھم ما یؤذیھم ۔رحیم : یجلب لھم ما ینفعھم. آلوسی، سید محمد، روح المعانی، دار الفکر، بیروت جلد 7، ص: 83

5- گورو ارجن دیو نے حضرت میاں میرؒ سے دربار صاحب امرتسر کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے درخواست کی تھی جسے آپ نے قبول فرمایا۔ کلیم قادری، محمد دین، تذکرہ، حضرت میاں میر، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، 1999ء ص 80، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار اقدس پر مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کی کثیر تعداد بھی حاضر ہوتی ہے۔ گورونانک کے کلام کے مجموعہ کا نام گرنتھ صاحب ہے جو حضرت شیخ ابراہیم فرید ثانی کی شاعری سے لبریز ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ کلام بابا فریدؒ کا ہے۔ واخد بخش سیال، حیات و تعلیمات حضرت خواجہ غلام فرید، محکمہ اوقاف پنجاب لاہور، 2002ء صفحات بالترتیب 115' 243

6- (ا) خانقاہ

اصلا فارسی است معرب خانگاہ یعنی محل خوردن بہ معنی خوردنی و طبق غذا، بعضی از خانہ بہ معنی منزل گرفتہ اند مرادف منزلگاہ۔

عباس کی منش، دکتر، پرتو عرفان، تہران۔ 1366 ش، جلد اول، ص 473

مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ خانقاہ کی اصل سورۃ الدھر کی یہ آیات ہیں:

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝﴾ (الدھر: 9-8)

خانقاہ کے لئے رباط، تکیہ اور زاویہ کی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں۔ دھخدا، علی اکبر، لغت نامہ، چاپ سیروس تہران، 1337 ش، جلد 20، ص: 128

خانقاہ نشینوں کی فضیلت، خصوصیت اور بعض تاریخی مباحث کے لئے ملاحظہ فرمائیں: سہروردی، شہاب الدین، عوارف المعارف، مترجم شمس بریلوی، ص 257' 304

(ب) لنگر

وہ کھانا جو غریبوں اور فقیروں کو کھلایا جائے، مساکین وفقراء کو روزہ مرہ کھانا تقسیم ہونے کی جگہ، خیرات خانہ محتاج خانہ، خانقاہ۔

اردو لغت (تاریخی اصولوں پر)، اردو لغت بورڈ کراچی 1994ء جلد 16' ص 912۔

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، مکتبہ حسن سہیل اکیڈمی لاہور 1974، جلد 4، ص:214)

7- ''حجرہ شاہ مقیم'' اور ''لنگر مخدوم'' اس کی مثالیں ہیں۔ ''لنگر مخدوم'' کے بارے میں ڈاکٹر سلطان الطاف علی لکھتے ہیں:

''مخدوم جہانیان علیہ الرحمۃ غوث بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے فرزند حقیقی تھے۔ ان کو ان کے والد گرامی نے ایک ویرانے میں قیام پذیر ہونے کا حکم صادر فرمایا تھا اور وہاں آپ نے مسافروں اور مساکین کے لئے عام لنگر یا مفت خوراک کا عوام کے لئے انتظام کر رکھا تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا قیام کا نام لنگر مخدوم سے معروف ہو گیا۔ لنگر مخدوم جھنگ کے علاقہ چنیوٹ میں واقع ہے۔ (رموز' اپریل 2006ء ص 15)

8- فوائد الفوائد، مرتبہ امیر حسن سنجری، مترجم خواجہ حسن ثانی، زاویہ لاہور، 1998ء ص 73

9- خلیق احمد نظامی، علامہ، تاریخ مشائخ چشت، دار المولفین، اسلام آباد' ص 173

10- ایضاً' ص 197

11- حمید اللہ ہاشمی، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی، تصوف فاؤنڈیشن لاہور، 2000ء، ص 86

12- سید احمد خاں، آثار الصنادید، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی دہلی' 1990ء جلد 2' ص 15

13- ایضاً ص 16

14- محمد اکرام شیخ، آب کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور' 1992ء ص 307

15- ایضاً ص 302

16- ایسی مزید تفصیلات کے لئے تاریخ مشائخ چشت ص 625 پر شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کا تذکرہ ملاحظہ فرمائیں۔

17- ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر، معارف فریدیہ، مرکز معارف اولیاء لاہور' 2005ء ص 17-16

18- جمالی، حماد بن فضل اللہ، سیر العارفین، مترجم محمد ایوب قادری، اردو سائنس بورڈ لاہور 1989ء ص 200 (اس کتاب میں خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ''کاکی'' کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے وہ بھی مضمون ہذا سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کتاب مذکورہ' ص 31)

19- کرمانی سید مبارک علوی، سیر الاولیاء، مترجم اعجاز الحق قدوسی، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1980ء، ص262
20- شارب، ظہور الحسن، تذکرہ اولیائے پاک و ہند، پروگریسو بکس لاہور۔ 1999ء صفحات بالترتیب:62، 96، 145)
21- مکتوبات امام ربانی، دفتر دوم، مکتوب:69
22- الہجویری، شیخ علی بن عثمان، کشف المحجوب، مترجم مفتی سید غلام معین الدین نعیمی، زاویہ، لاہور، 2004ء، ص487
23- ایضاً، ص489
24- ماجد عرسان الکیلانی، ڈاکٹر، عہد ایوبی کی نسل نو اور القدس کی بازیابی، مترجم پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، اردو سائنس بورڈ لاہور، 2004ء، ص186
25- سیر الاولیاء، ص630-631
26- فوائد الفواد، ص247
27- فوائد الفواد، ص434
28- منیری، شرف الدین احمد یحییٰ، مکتوبات دوصدی مترجم سید قیم الدین، سیرت فاؤنڈیشن لاہور 2003ء، ص 308-310
29- سیر العارفین، ص427
30- خلیق احمد نظامی، پروفیسر، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، نگارشات، لاہور، 1990ء، ص116، تاریخ مشائخ چشت، ص116
31- محمد ریاض قادری، غوث الاغیاث، قرطاس پبلشرز لاہور، صفحات بالترتیب، 366، 374، 328
32- سیر الاولیاء، ص242-243
33- ایضاً، ص246-247

احترام آدمیت
اسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں

محمد واصل اویسی
استاذ شعبۂ اسلامیات
مدرسۃ العقیق الباکستانیۃ بالمدینۃ المنورۃ

احترام آدمیت
اسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں

محمد واصل اویسی

عجب نہیں کہ خدا تک تیری رسائی ہو
تیری نگاہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

خدائے لم یزل نے انسان کو خلافت ارضی کے لئے منتخب فرمایا بقولہ تعالیٰ:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (البقرہ:30)

ترجمہ: میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس کو مسجود ملائک ٹھہرایا بقولہ تعالیٰ:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ (البقرہ:34)

ترجمہ: اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔

اسی انسان کو تاج کرامت عنایت کیا بقولہ تعالیٰ:

﴿"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ"﴾ (بنی اسرائل:70)

ترجمہ: بے شک ہم نے بنی آدم کو تکریم بخشی۔

اسی انسان کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے سب سے بڑے عابد کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے راندۂ درگاہ کردیا۔

بقولہ تعالیٰ:

﴿فَاخْرُجْ مِنْهَآ اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ﴾ (الاعراف:13)

(نکل یہاں سے بے شک تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے)

پھر اسی احترام آدمیت کو Abiding law کی حیثیت سے فطری والہامی مذاہب کا جزو لازم بنایا۔ ہوس کی گرد نے جب حقیقت کے شفاف آئینے کو مکدر کر دیا تو احترام آدمیت کا یہ عظیم باب خود آدمیت ہی کی کتاب سے محو ہوتا گیا۔ نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کے تعصب کی بناء پر نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں پیدا ہوتی گئیں۔ یہودیوں نے اسی بناء پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھہرایا۔ اپنے مذہبی احکام تک میں غیر بنی اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا جس کی رو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی۔ اونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھہرائے گئے اور شودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں آج اکیسویں صدی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ سکتا ہے۔ کمزور طبقوں کو غلام بنا کر رکھنا اور ان سے جانوروں سے بدتر سلوک روا رکھنا ایک فرعون پر ہی موقوف نہیں بلکہ ہر زمانے میں آدمیت کے احترام کو فراموش یا نظر انداز کرنے والے رذیل لوگوں کا وطیرہ رہا ہے۔

اسوۂ حسنہ کا طرۂ امتیاز

ہر فرد انسانیت کو بلاتمیز و تفریق رنگ و نسل، جان مال اور عزت و آبرو کا تحفظ مہیا کرنا اور ہر انسان کے اندر دوسرے انسان کا احترام قائم کرنا تاجدارِ ختم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات و اسوۂ حسنہ کا ہی طرۂ امتیاز اور مقصد عظیم ہے۔ بلکہ ان تعلیمات کی بنا پر ایک مفصل قانون ہتک عزت (Law of Libel) مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی قانون ہر

شخص کی ایک بنیادی عزت کا قائل ہے جس پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات مبارکہ میں ''احترام آدمیت'' کو جو حیثیت دی گئی ہے اس کا مطالعہ ہم دو پہلوؤں سے کرتے ہیں۔

1- مومن و مسلم کا احترام

2- غیر مسلم و کافر کا بحیثیت انسان احترام۔

1- مومن و مسلم کا احترام

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مومن کے جان و مال اور آبرو کو دوسرے تمام لوگوں کے لئے محترم قرار دیا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے طویل خطاب میں ارشاد فرمایا:

''اِنَّ دِمَآءَ کُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاِعْرَاضَکُمْ حَرَامٌ عَلَیْکُمْ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا وَسَتَلْقَوْنَ رَبَّکُمْ فَیَسْئَلُکُمْ عَنْ اَعْمَالِکُمْ اَلَا فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ ضَلَالًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ''.(1)

ترجمہ: لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں جیسا کہ آج کے اس دن کی حرمت ہے تمہارے اس شہر میں تمہارے اس مہینے میں تمہیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال فرمائے گا۔ خبردار میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

امام مسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام (محترم) ہے''۔(2)

کعبہ سے بڑھ کر محترم

ایک مومن کے احترام کا اس سے بڑھ کر کیا تصور ہوسکتا ہے کہ تاجدار مدینہ (ﷺ) نے بیت اللہ شریف سے مخاطب ہوکر فرمایا:

"لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ مَآ اَطْيَبَكَ وَاَطْيَبَ رِيْحَكَ وَأَعْظَمَ حُرْمَتَكَ وَالْمُؤْمِنُ اَعْظَمُ حُرْمَةً مِّنْكَ، اَللّٰهُ جَعَلَكَ حَرَامًا وَحَرَّمَ مِنَ الْمُؤْمِنِ مَالَهٗ وَدَمَهٗ وَعِرْضَهٗ وَأَنْ يَظُنَّ بِهٖ ظَنًّا سَيِّئًا". (3)

ترجمہ: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ تو کتنا طیب ہے اور تیری خوشبو کیسی طیب ہے اور تیری حرمت کیسی عظیم ہے اور ایک مومن کی حرمت تجھ سے بھی عظیم ہے۔ اللہ نے تجھے حرام (حرمت والا) قرار دیا ہے۔ اور ایک مومن کے مال، اور خون اور اس کی عزت کو بھی حرمت والا بنایا ہے یہاں تک کہ اس کے متعلق برا گمان کرنے کو بھی۔ (حرام قرار دیا ہے)۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات جو احادیث یا آپ کی سنن مبارکہ کے طور پر موجود ہیں وہ وضاحت وتشریح ہیں قرآنی احکام وآیات کی اور آپ کی سیرت واسوہ دراصل قرآن کریم کی عملی تفسیر ہے۔ بایں ہمہ آپ نے مومن کے جان ومال اور عزت کو جو آبرو بخشی اور احترام دیا اس کا ماخذ دراصل قرآنِ کریم ہی ہے۔

قرآن مجید ایک مومن کی جان کو حفظ وامان اور "Right of existance" بخشتا ہے، اس کا اندازہ اس آیت قرآنی سے لگایا جاسکتا ہے:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (سورۃ النساء:93)

ترجمہ: "جو کوئی کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرتا ہے تو اس کا بدلہ جہنم ہے ہمیشہ اس

میں رہنا اور اللہ کا غضب اور لعنت اس پر اور اس (اللہ) نے تیار کر رکھا ہے اس کے لئے بہت بڑا عذاب"۔

معاشرتی قوانین کی بنیاد

اسی طرح قرآن ایک مومن کی عزت و حرمت کا جب درس دیتا ہے تو ایک دو آیات میں ہی اس کے ذکر پر بس نہیں کرتا بلکہ کئی آیات پر مشتمل معاشرتی و اخلاقی قوانین دیتا ہے جن کی بنیاد ایک مومن کی عزت و حرمت کا احترام ہی ہے۔

﴿"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ج وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ج وَ مَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ O یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ط وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ O"﴾

(الحجرات: 11-12)

ترجمہ: "اے ایمان والو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کے برے نام رکھو۔ ایمان لانے کے بعد لاتہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو باز نہ آئیں وہی خدا کے نزدیک ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو۔ کیونکہ بعض شک گناہ ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی ٹوہ نہ لگاؤ۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی پیٹھ

پیچھے اس کو برا نہ کہے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو گوارا کرے گا۔ کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

غیبت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''انسان کا گوشت محض اس کی عزت وحرمت کی وجہ سے حرام ہوا ہے۔ اس لئے جو چیز اس کو عزت وحرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے''۔ (4)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مومن کی تعظیم کو کتاب اسلام میں ایک اہم باب کی حیثیت دی ہے اور اس تعظیم کو اس قدر لازم قرار دیا کہ ارشاد فرمایا:

''لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا''.

ترجمہ: ''وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کا ادب نہیں کرتا''۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے شفیع معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فرمان جو آپ نے ایک سردار کی تعظیم کیلئے دیا تھا:۔

''قُوْمُوْآ اِلٰى سَيِّدِكُمْ''

ترجمہ: ''اپنے سردار کے لئے اٹھو''۔

غیر مسلم کا احترام

دین محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس میں کسی بھی قسم کا تعصب نہیں پایا جاتا۔ اسلام جہاں ایک مسلمان کو جان و مال اور عزت وآبرو کا تحفظ اور احترام بخشتا ہے وہیں غیر مسلموں کو ان مراعات سے محروم نہیں کرتا۔ اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس ابر کرم کی مانند ہے جو برستے وقت مومن وکافر کی تمیز نہیں کرتا۔

اسلام اگر جہاد کا حکم دیتا ہے تو اس کا مقصد خدا کے بندوں کو طاغوتی تسلط سے آزاد کرانا اور فتنہ کا سدّ باب کرنا ہوتا ہے۔ نہ جبراً کسی کو مسلمان بنانا اسلامی تعلیمات کا منشا ہے اور نہ ہی ہر کہ دومہ کی گردن اس بنیاد پر اڑانا کہ وہ اسلام کے نظریات کو قبول نہیں کرتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کو احترام بخشا ہے۔ آپ کی تبلیغ کا زریں مقصد یہ ہی تو ہے:

"اِخْرَاجُ الْعِبَادِ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلٰی عِبَادَةِ اللّٰهِ".

ترجمہ: بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لانا۔

یہی وجہ ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر شیدایان اسلام جب مہمات کیلئے روانہ کیے جاتے تو نبی کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم انہیں یوں ہدایات فرماتے:

"جب تم مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دو۔ ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کرلو اور اس پر حملہ کرنے سے رک جاؤ۔ اس کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ قبول کرے تو پھر اس سے رک جاؤ۔ اس کے بعد اس سے کہو کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آ جائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے۔ اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی۔ قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا۔ لیکن غنیمت اور فئے میں اس کا حصہ نہ ہوگا۔ جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہو۔ اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگو اور لڑائی شروع کر دو"۔ (5)

امام ابوداؤد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امراء کے نام یہ وصیت تحریر کی ہے:

"اللہ کے نام اور اس کی مدد سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملت پر

قائم رہتے ہوئے چلو اور ضعیف بوڑھے، چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرو"۔(6)

ذمی کا احترام:

کفار میں سے جو کوئی جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائے اور حدود مثلاً قتل، چوری اور پامالی عزت میں اسلامی احکام کی پابندی قبول کرے ایسا شخص ذمی کہلاتا ہے اور ایسے شخص کے احترام کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں واضح فرمایا ہے:

"مَنْ آذٰی ذِمِّیًّا فَاَنَا خَصْمُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ"۔ (7)

ترجمہ: جو کوئی ذمی کو ایذا دے گا قیامت کے دن میں اس کا دشمن ہوں گا۔

اس سے بڑھ کر کسی کافر کے احترام کا تصور کیا ہو سکتا ہے کہ سرِ اقدس پر کوڑا کرکٹ پھینکنے والی بڑھیا بھی عیادت سے مشرف کی جاتی ہے۔

اخلاق حسنہ اور اخلاق رزیلہ کی بنیاد احترام آدمیت:

اگر ہم بنظرِ غائر جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام عادات واطوار جو بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح سے احترام آدمیت کے تصور سے جڑے ہوں اخلاق حسنہ کے ذیل میں آتے ہیں۔ اور اخلاق رذیلہ سے مراد وہ ہی اخلاق ہیں جو بالکل اسی طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کسی کی ناموس کی توقیر سے متصادم ہوں۔ مثلاً تکبر کیا ہے۔ دوسرے کو خود سے کم اور خود کو دوسرے سے زیادہ لائق احترام سمجھنا۔ شیطان نے سب سے پہلے تکبر کیا تھا۔

غیبت، بہتان، قتل، دشنام طرازی، لڑائی جھگڑا، چغلی وغیرہ ایسے رذائل کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ یہ متصادم ہیں ناموس و وقار آدم وابن آدم سے حضور شفیع اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ"۔ (8)

ترجمہ: مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔

تعین حقوق شرح تصور توقیر آدمیت:

سیرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف احترام انسانیت کے متعلق زبانی دعووں پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے لئے میدان عمل میں ایک بے نظیر مثال فراہم کرتی ہے۔ اور ایک ایسا نظام واضح کرتی ہے جو بذات خود انسانی قدروں کے احترام کا محافظ ہے۔ یعنی وہ ان تمام لوگوں کے حقوق کا تعین کر دیتا ہے۔ جن سے ایک انسان کا زندگی کی کسی بھی سطح پر بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق یا رشتہ ہوتا ہے۔ ہر انسان کو Catagorize کر دیا گیا۔

اور دوسروں پر Catagorical Rights کی بجا آوری واجب قرار دی گئی۔ والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، ہمسایوں کے حقوق، دوستوں کے حقوق، قرابت داروں کے حقوق، اجنبیوں کے حقوق، مسافروں کے حقوق، اساتذہ کے حقوق، مالک اور غلام کے حقوق الغرض ''حقوق العباد'' ایک اہم باب کے طور پر اسلام کے نظام میں شامل کیے گئے۔ ان حقوق کی ادائیگی ہی احترام آدمیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ چوری کے جرم میں پکڑی جانیوالی بنو مخزوم کی عورت کی سفارش کے وقت ارشاد فرمائے تھے:

> ''خدا کی قسم اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کو بھی یہی سزا ملتی''۔

خود آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کو پیش کیا جنگ بدر کی صفوں کی ترتیب کے وقت اس شخص کے سامنے جس نے کہا تھا کہ آپ نے میرے ننگے بدن پر اپنے عصا سے جو چوبھ کرائی ہے میں اس کا انتقام لینا چاہتا ہوں تو سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قمیض مبارک اٹھا دی تھی اور اسے اسی طرح انتقام کی اجازت دی تھی پھر اس نے بڑھ کر آپ کے جسم اطہر سے لپٹ کر اس کو بوسہ دیا تھا۔(9)

غلاموں کے حقوق

یہ یہی وہ نظام ہے جس میں غلاموں کو بھی اعلیٰ حقوق دیے جاتے ہیں اور مالکوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے غلاموں پر سختی نہ کریں۔ انہیں کھلائیں قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری لکھتے ہیں:

"اسلام سے پیشتر غلامی تو جملہ ممالک اور جملہ اقوام میں اور جملہ ادیان میں موجود تھی۔ کیا حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیشتر کسی نے غلامی کے محور زائل کرنے اور غلاموں کو ایسے بلند مناصب تک پہنچانے میں بھی کوئی کارروائی کی۔ ہندوستان میں اچھوت اقوام کی تعداد برہمنوں، کھشتریوں اور ویش قوموں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے اور اچھوت ہونے کی بیڑی اور طوق اس طرح اس کا لازمۂ جسم و روح ہو گیا ہے۔ کہ سینکڑوں نسلوں اور ہزاروں، لاکھوں سالوں کی امتداد مدت بھی ان کو رہائی نہیں دلا سکی۔ ہندو قومیں ہندو لاء کے حکم سے معاشرت، تمدن، علم اور مذہب کے جملہ حقوق سے قطعاً محروم رکھی گئی ہے۔ برہمنوں کو شودروں کے مال کا مالک بنایا گیا ہے۔ اور کوئی برہمن کسی شودر مقتول کے قتل میں مستوجب قصاص نہیں سمجھا گیا۔

اسلام میں کوئی انسان بھی اچھوت نہیں۔ سب کی جان و مال کو یکساں حرمت واحترام کے حقوق حاصل ہیں۔ معاشرت اور تمدن میں سب برابر ہیں۔ ہر ایک شخص سلطنت دنیوی یا امامت دینی تک فائز ہو سکتا ہے۔ (10)

نہ صرف یہ کہ ہر شخص کو دوسرے کی تحقیر اور ہتک کرنے سے منع فرمایا گیا ہے بلکہ دوسرے کی عزت و وقار کی حفاظت ہر مسلمان کے ذمے لگا دی گئی ہے۔ امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

"اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جارہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جارہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرتا جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو"۔ (11)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدیوں سے رائج غلامی اور غلاموں کی پامالی کی سدِّ باب کا بتدریج نظام دیا جس میں غلاموں کو ان کے حقوق عطا کئے۔ اسلامی معاشرے میں غلاموں کو بھی وہ حیثیت دی گئی کہ خود محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہی آزاد کردہ غلام حضرت زید رضی اللہ عنہ کی شادی اپنی پھوپھی زاد حضرت زینب سے کردی۔

غلاموں کے معاملے میں اس قدر تاکید فرمائی کہ زندگی کے آخری لحات میں جن دو چیزوں کی وصیت فرمائی ان میں سے ایک "وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" یعنی غلام ہی ہیں۔ احترام آدمیت کی اس سے بڑی مثال کیا ہوسکتی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو اسلام قبول کرنے سے پہلے امیہ کافر کے پاس ایک حبشی غلام سے زیادہ حیثیت نہیں دیے جاتے تھے۔ قبول اسلام کے بعد انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مقام دیا کہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی بھی انہیں "یا سیدی" (میرے آقا) کہہ کر پکارتے تھے۔

تعلیمات محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام نے انسانیت کو وہ عظمت، عزت اور احترام بخشا کہ مذہب اسلام کے اندر رنگ و نسل، یا مال و دولت کی بناء پر فخر و تفاخر کا نشان تک باقی نہ رہا۔ مساوات کے عالمگیر نظام نے انسانیت کو جو معراج عطا کی وہ شان "يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" کی ایک بڑی وجہ بنی۔ اسی مساوات کے تصور کو ابھارتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

"کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت حاصل نہیں سفید رنگ والے کو سیاہ فام کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر ہاں فضیلت صرف

تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ہے''۔

اسلامی حدود میں قانون قصاص نمایاں اہمیت کا حامل ہے جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ جس کسی کو بھی زندہ رہنے کے حق سے محروم کیا گیا اور اسے قتل کر دیا گیا خدا کے قانون کے مطابق اس کے قاتل کو بھی بدلے میں قتل کیا جائے۔ دوسرے کی جان کا احترام نہ کر کے اس نے اپنی جان کا احترام کھو دیا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

مصادر و مراجع

(1) صحیح البخاری باب حجۃ الوداع

(2) الصحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ

(3) کنز العمال: رقم الحدیث 820

(4) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ج ششم ص: 567

(5) صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر حدیث 1731

(6) سنن ابو داؤد

(7) التاریخ للخطیب عن ابن مسعود

(8) بخاری و مسلم

(9) رحمۃ للعالمین

(10) رحمۃ للعالمین ج سوم ص 104

(11) سنن ابو داؤد

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

احترام آدمیت

علاقائی، نسلی، طبقاتی اور لسانی تعصّبات کا حل، انسان دوستی اور
باہمی رواداری کے حوالے سے علماء وصوفیاء علیہم الرحمۃ کا کردار

طبقاتی تعصّبات اور اُن کا حل

پروفیسر محمد یوسف صابر
گورنمنٹ اسلامیہ کالج فیصل آباد

طبقاتی تعصّبات اوران کا حل

پروفیسر محمد یوسف صابر

اللہ تعالیٰ نے انسان کونفس واحدہ سے پیدا فرمایا' اسی سے اس کا جوڑا بنایا اوران میں سے بہت سے مردوں اورعورتوں کو پیدا فرما کرزمین کے طول وعرض میں پھیلا دیا۔ (1)

وحدت سے کثرت تک اس انسانی داستان میں تاریخ انسانی کے بہت سے نشیب و فراز پنہاں ہیں۔ جب روئے زمین پر نسلِ انسانی پھیلی تواس نے اجتماعی رہائشی بستیاں بسائیں، دوردراز علاقوں میں اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کیں، اپنے اپنے علاقوں کی آب وہوا، موسموں اورجغرافیائی ماحول کے مطابق الگ الگ معاشرتی رسوم ورواج اختیار کیےاورالگ الگ زبانیں بولنے لگے۔دولت کی کمی بیشی مختلف پیشوں اوردیگرعوامل نے انھیں ایک دوسرے سے مختلف کردیا۔اس طرح نفس واحدہ سے جنم لینے والا انسان وطن' رنگ اور نسل کی بناپر مختلف طبقوں میں تقسیم ہوگیا۔ تاہم ان مختلف طبقات کو توحیدورسالت پرایمان کی رسی نے باہم مربوط رکھااوراپنے تمام تر دنیاوی اور معاشرتی اختلافات کے باوجوذان میں باہمی پیارمحبت اوراخوت ومودت کا مضبوط رشتہ قائم رہا۔ لیکن جب ابلیسی سازشوں نے انہیں راہِ حق سے بھٹکانا شروع کیااورنیکی کی بجائے بدی کے راستے گامزن کردیا تو معاشرتی وحدت کے ساتھ ساتھ ان کی نظریاتی وحدت بھی پارہ پارہ ہوگئی۔اب انسان ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے'ایک دوسرے کا حق چھیننے لگے'

اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے اور اپنے مقابلے میں لوگوں کو حقیر خیال کرنے لگے۔ اس طرح انسانوں میں بے شمار طبقات پیدا ہو گئے اور ان میں باہمی تعصب نے ایسی جڑ پکڑی کہ اشرف المخلوقات کا معاشرتی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل مبعوث فرمائے جنہوں نے انسان کو شیطانی چالوں سے محفوظ و مأمون کرنے میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ لیکن ان کے جاتے ہی کفر و شرک اپنے تمام تر شیطانی حربوں سے وحدتِ انسانی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے پھر سرگرمِ عمل ہو جاتا رہا۔ چھٹی صدی عیسوی میں ابلیس کا سازشی نظام پوری دنیا پر حاوی ہو گیا تھا۔ ایران اور روم نے پوری دنیا کو سیاسی، مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا تھا۔ انسان کے ہاتھوں انسان کی فروخت عروج پر تھی۔ انسان انسان کو لونڈی غلام بننے پر مجبور کر رہا تھا۔ عورتوں کا طبقہ انتہائی قابلِ رحم تھا۔ لوگ باپ کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں کو ترکے کے طور پر اپنی ملکیت قرار دیتے، بچیوں کو زندہ درگور کیا جاتا اور ایک خدا کے گھر میں تین سو ساٹھ (360) بت رکھ کر ان کی پوجا پاٹ ہو رہی تھی۔ ایسے میں رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور نبی آخر الزماں (ﷺ) نوعِ انسانی پر اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم بن کر تشریف لائے' جنہوں نے ہر قسم کے باہمی تعصبات کا خاتمہ کر کے وحدتِ انسانی کا بے مثال معاشرہ قائم کر دیا۔

ظہورِ قدسی سے پہلے یہ تعصب اس قدر گہرا تھا کہ عرب کے ہر علاقے اور ہر قبیلے کا علیحدہ نظامِ اِمارت، علیحدہ رسم و رواج، علیحدہ شاعر، علیحدہ پہلوان یہاں تک کہ علیحدہ خدا موجود تھا۔ ان کے مشہور خداؤں میں ایک وَدّ تھا جو دمشق اور مدینہ کے درمیان دومۃ الجندل کے مقام پر نصب تھا اور بنی کلب کا قبیلہ اسے پوجتا تھا۔ اسی طرح سواع نامی بت رباط میں نصب تھا اور بنی ہذیل اسے پوجتے تھے۔ یغوث یمن میں مذحج کے مقام پر نصب تھا اور بنی

مذحج اور بنی جُرش اسے پوجتے تھے۔ یعوق مکہ مکرمہ اور صنعاء کے درمیان خیوان کے مقام پر نصب تھا اور ہمدان کے لوگ اسے پوجتے تھے۔ نسر وادی سبا میں بلخع میں نصب تھا اور بنی حِمیَر اس کو پوجتے تھے۔

فلس کو بنی طے نے "آجا" کے مقام پر رکھا ہوا تھا جو مدینہ منورہ کے شمال میں تین منزل پر واقع ہے۔ مناۃ بحیرۂ قلزم کے قریب قدید کے مقام پر نصب تھا اوس، خزرج، ہذیل، خزاعہ ہی نہیں بلکہ قریش اور تمام اہل عرب اس کی عبادت کرتے تھے۔ اوس وخزرج کے لوگ تو ارکان حج کی ادائیگی کے بعد اس بت کے پاس سر کے بال منڈواتے اور اس کے بغیر حج کو نامکمل خیال کرتے تھے۔ لات بنو ثقیف نے طائف میں رکھا ہوا تھا اور تمام عرب اس کی تعظیم کرتے تھے۔

عزٰی قریش کا خدا تھا جو انہوں نے مکہ مکرمہ سے دو منزل جانب شمال وادی حراض میں رکھا ہوا تھا۔ قریش دیگر بتوں کی نسبت اس کی تعظیم زیادہ کرتے تھے انہوں نے درہ سقام کو حرم کعبہ کی طرح حرم قرار دے رکھا تھا اور اس کے قریب غبغب نام کا ایک مذبحہ بنایا ہوا تھا' جہاں وہ قربانیاں کیا کرتے تھے۔ عرب لات اور عزٰی دونوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ ذوالخلصہ تبالہ کے مقام پر تھا اور قبیلہ خثعم، ازد اور سراۃ وغیرہ اس کی پوجا کرتے تھے۔ سعد ساحل جدہ پر ایک لمبا پتھر تھا' بنی کنانہ اس پر خون بہانا عبادت خیال کرتے تھے ذوالکفین کو یمن کا قبیلہ دوس پوجتا تھا۔

ذوالشرٰی مکہ مکرمہ کے قریب ذوالشرٰی نامی جگہ پر رکھا تھا اور بنو حارث اسے پوجتے تھے۔ اُقیصر شام کے علاقے مشارف میں تھا اور قبیلہ غطفان وغیرہ اس کا حج کرتے تھے۔ ہبل مکہ مکرمہ میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بتوں میں سب سے بڑا تھا جو عین جوف کعبہ میں رکھا ہوا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا قریش کو اسی حالت میں ملا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے سونے کا ہاتھ بنا دیا تھا۔ اس کے سامنے سات تیر رکھے ہوئے تھے جن سے

پجاری قرعہ اندازی کیا کرتے تھے۔ اساف اور نائلہ دونوں زمزم کی جگہ پر تھے۔ قریش ان کے پاس قربانیاں دیا کرتے تھے۔ وہ مناف نامی بت کو بھی پوجتے تھے۔ ان کے علاوہ مکہ کے ہر گھر میں ایک بت تھا جب کوئی سفر پر جاتا تو بطور تبرک اس کو مسح کرتا اور جب واپس آتا تو گھر میں داخل ہو کر سب سے پہلے اسے چھوتا۔ (2)

ہر قبیلہ، ہر خاندان بلکہ ہر گھر کے الگ الگ قبلہ گاہ اور الگ الگ بتوں کی پوجا پاٹ کے سبب ان میں باہمی تفاخر و نفرت اور تعصب کی دیواریں بہت اونچی ہو گئی تھیں۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے فتح مکہ کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خدائے واحد کے گھر کو قسم قسم کے بتوں سے پاک کر دیا۔ اس طرح انسانوں کی نظریاتی وحدت میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو گئی۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے دوسری سب سے بڑی ضرب قبائلی تعصب پر لگائی۔ عرب کے قبائل کے لیے اسلام قبول کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ بھی تھی کہ داعی اسلام کا تعلق بنی ہاشم سے تھا اور بنی ہاشم کی سیادت و نبوت کو تسلیم کرنے سے ان کے خیال میں ان کے اپنے قبیلے کی اہانت کا پہلو نکلتا تھا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد جب لَاتَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کا اعلانِ عام فرمایا تو قبائلی تفاخر و تعصب کے تمام بت پاش پاش ہو گئے اور وہ تمام اللہ کی وحدانیت کے سچے علمبردار کی سچی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

جملہ تعصبات کی مستقل پیش بندی کے لیے حجۃ الوداع کے موقع پر حضور شفیع امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے جان و مال کو تم پر ایسا ہی محترم کر دیا ہے جیسا کہ تمہارا یہ شہر مکہ، یہ مہینہ ذوالحجہ اور یہ دن یوم العرفہ محترم ہے۔ تمام لوگ اسلام میں برابر ہیں۔ سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی

تھی۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ماسوائے تقویٰ کے۔ زمانہ جاہلیت کے تمام خون میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ سب سے پہلے میں اپنے قبیلے کے آدم بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون معاف کرتا ہوں۔ زمانہ جاہلیت کا ہر سود میرے قدموں کے نیچے ہے سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے عباس بن عبدالمطلب کا سود معاف کرتا ہوں۔ میں تمہیں عورتوں کے بارے میں خیر کی نصیحت کرتا ہوں' تم نے انہیں اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے' تمہارا ان پر حق ہے اور ان کا تم پر حق ہے۔ میں تمہیں غلاموں کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ جو تم کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ اور جو تم خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے' اس کے ساتھ دغا نہ کرے نہ اس کی خیانت کرے نہ اس کی غیبت کرے۔ نہ اس کا خون حلال ہے۔ میرے بعد گمراہی پھیلانے والے نہ بن جانا میں تم میں ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم اسے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے وہ ہے کتاب اللہ اور میری عترت''۔

آپ ایک ایک بات کا اعلان فرماتے جاتے تھے اور پوچھتے جاتے کہ کیا یہ بات میں نے تم تک پہنچا دی اور لوگ عرض کرتے: جی ہاں! اور آپ فرماتے: اے اللہ! گواہ رہنا۔ (3)

علاقائی یا وطنی محبت اگرچہ ایک فطری عمل ہے لیکن جب یہ تعصب کی حدوں کو چھونے لگتی ہے تو انتہائی خطرناک ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس سے انسانی سوچ، نظریات، مفادات اور ہر قسم کے تعلقات محدود ہو جاتے ہیں۔ آزادی فکر و نظر کی وسعتیں سمٹنے لگتی ہیں اور انسانی معاشرہ مخصوص علاقائی سرحدوں کے اندر مسدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے اس کی دعوت آفاقی اور سرمدی ہے وہ انسانی قدروں کو اس حد تک وسیع اور مضبوط بنانے کا علمبردار ہے کہ انسان صحیح معنوں میں خلیفۃ اللہ فی الارض کے عظیم منصب پر فائز ہونے کے قابل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دین متین کی آخری و تکمیلی دعوت کا ابتدائی اور بنیادی مرکز مکہ مکرمہ کو بنایا گیا' جس پر روز اول سے کسی غیر کی حکومت قائم نہ ہوئی تھی۔ اور اس کے باسی اجتماعی غلامی سے کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ کعبۃ اللہ جسے کائنات ارضی کا مادی اور روحانی نقطۂ مرکزیہ اور عبادتوں کا قبلہ بننا تھا' اس کا سنگ بنیاد انسانِ اول حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھا گیا' جو کسی ایک قبیلے یا علاقے کے نمائندہ نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کے باپ تھے اور اس کی تعمیر اولی میں صرف انسان ہی نہیں فرشتوں نے بھی حصہ لیا تھا اور اس میں دنیا کے پانچ پہاڑوں کوہ حرا، کوہِ لبنان، کوہ زیتون، کوہ سینا اور کوہ جودی کے پتھر استعمال ہوئے تھے۔ (4)

اسلام کے پیغام آخریں کے اعلان سے پانچ سال قبل ہونے والی اس کی تعمیرِ نو میں تمام علاقوں قبیلوں اور نظریات کے حامل نمائندوں نے جسمانی طور پر شرکت کی تھی۔ اس کی تعمیر میں دین عیسوی کی نمائندہ سلطنت روم کے باقوم نامی شخص نے تکنیکی مہارت اور چھت کا سامان مہیا کیا تھا' جو اس جہاز سے حاصل ہوا تھا' جو مشیت ایزدی سے جدہ کے قریب ٹوٹ کر ناقابل استعمال ہو گیا تھا۔ عرب کے قبائل کا تعمیر کعبہ میں دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے حلال کی کمائی کو اس مقدس کام کے لیے وقف کر دیا تھا اور حجر اسود کی تنصیب کی سعادت حاصل کرنے کے لیے آپس میں جھگڑنے لگے تھے اور قریب تھا اللہ کا یہ گھر قبائلی تعصب کے سبب میدان جنگ بن جاتا کہ نبی آخریں نے یہ مسئلہ بڑی حکمتِ عملی کے ذریعے حل کر دیا۔ آپ نے ایک چادر میں حجر اسود رکھا اور تمام قبیلوں کے نمائندوں سے اسے کناروں سے پکڑنے کو کہا۔ وہ اسے اٹھا کر اس مقام پر لے آئے جہاں اسے نصب کرنا تھا۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اسے اپنے دست مبارک

سے وہاں نصب کر دیا اس طرح جہاں ایک بہت بڑی خانہ جنگی ہوتے ہوتے رہ گئی وہیں بیت اللہ کی آفاقیت اور جامعیت بھی واضح ہو گئی۔

اسلام سے قبل اہل عرب میں نسلی تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنے قبیلے کو ہر اعتبار سے دوسرے قبیلے پر فوقیت دیتا تھا اور کسی بھی کیفیت میں اپنے قبیلے یا اس کے اتحادیوں کا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ میں جب یثرب کے کچھ لوگ اسلام لائے تو ان میں سے ایک شخص ابوالہیثم بن تیہان اوسی نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے عرض کی تھی کہ یارسول اللہ! یہود سے ہمارے تعلقات ہیں' جو آپ کی بیعت کے سبب ٹوٹ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ جب اللہ آپ کو غلبہ دے دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم میں چلے جائیں اور آپ نے یہ ارشاد فرما کر ان کے خدشات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا کہ تمہارا خون میرا خون ہے' میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے۔ میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو۔ تمہارا دشمن میرا دشمن اور تمہارا دوست میرا دوست ہے۔(5)

اس طرح نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینۃ نے یثرب کے مسلمانوں کو اسلام کا یہ سرمدی اصول تعلیم فرما دیا کہ اسلام کا تعلق ہر قسم کے تعلقات پر بھاری ہے اور اس پر ہر قسم کے تعصبات کو قربان کیا جانا ضروری ہے۔

فتح مکہ کے دن آپ نے بیت اللہ کے دروازے کو تھام کر یہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے گروہ قریش! خدا تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار دور کر دیا۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْٓا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾(6)

ترجمہ: لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا فرمایا اور تم کو کنبے اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک تم میں اللہ کے نزدیک بزرگ وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے تحقیق اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

اسلام نے نسلی تعصب کا خاتمہ کر دیا اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جس کی بنیاد صرف تقویٰ کی بنیاد پر قائم تھی۔ مختلف قبیلوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے تمام تعصّبات کو تج کر اس منفرد معاشرتی مرکز مدینۃ الرسول کی طرف کھنچے چلے آتے تھے جہاں نہ ان کا کوئی رشتہ دار تھا نہ کوئی کاروبار تھا اور نہ ہی روٹی روزی کا کوئی سامان۔ سیدنا ابوذر غِفاری، سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی، ابوسعید خدری، ابو ہریرہ، خباب بن الارت، حذیفہ بن الیمان (رضی اللہ عنہم) اور ان جیسے بیسیوں لوگ رنگ و نسل اور علاقائی تعصب کو قربان کر کے صفہ میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ وہ بھوکے پیاسے اور زندگی کی تمام سہولیات سے محروم ہونے کے باوجود شاداں و فرحاں تھے کہ سب کچھ چھن گیا تو کیا ہوا رسول اللہ کا قرب تو نصیب ہو گیا۔ اللہ تعالی نے ان کا خصوصی ذکر قرآن مجید میں فرمایا (7) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی سب سے زیادہ ان کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مال غنیمت کی تقسیم کے موقع پر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی تحریک پر سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا نے ایک لونڈی مانگی تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو لونڈی دے دوں اور اہل صفہ بھوکے رہیں ان کے خرچ کے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ میں ان اسیران جنگ کو بیچ کر ان کی قیمت اہل صفہ پر خرچ کروں گا۔ (8)

نسلی تعصب کے خاتمے کے لیے نبی پاک علیہ الصلوۃ والسلام نے انصار اور مہاجرین میں مؤاخات قائم کی۔ ایک مہاجر اور ایک انصاری کو آپس میں بھائی بنا دیا اور یہ رشتہ اس حد تک پختہ ثابت ہوا کہ ایک ماں کے پیٹ اور ایک باپ کی صلب سے پیدا ہونے

والے سگے بھائیوں کے تعلقات بھی اس سے ہیچ تھے۔

اسلام کے ابتدائی معاشرہ میں خاندانی اور نسلی تعصب کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا اور اسلام کا تعلق ہر قسم کے رشتوں پر غالب آ گیا۔ چنانچہ جنگ بدر میں سیدنا ابو عبیدہؓ بن الجراح نے اپنے والد کو قتل کر دیا۔ (9)

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے سگے ماموں عاص بن ہشام کو تہ تیغ کر دیا۔ (سیرت ابن ہشام) اور جنگ اُحد میں سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کو فی النار کیا۔ (نسیم الریاض)۔

غزوۂ بدر ہی کے دن عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے جو اس وقت اسلام نہیں لائے تھے جنگ کے لیے مبارز مانگا تو خود سیدنا ابو بکر صدیقؓ تلوار سونت کر مقابلے کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت نہ دی۔ (10)

اسی طرح ایک موقع پر مشہور منافق عبداللہ بن ابی کے بیٹے سیدنا عبداللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو میں ابن ابی کا سر قلم کر دوں مگر آپ نے اجازت نہ دی۔

نسلی اور نسبی تعلقات اس حد تک بے معنی ہو کر رہ گئے کہ جنگ بدر کے خاتمہ پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا تو سیدنا عمر فاروق نے عرض کیا کہ آپ ان کو ہمارے حوالے کر دیں تا کہ ہم انہیں قتل کر دیں مثلاً عقیل کو علی کے حوالے کر دیں اور میرے فلاں رشتہ دار کو میرے حوالے کر دیں۔ مگر رحمۃ للعالمین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے سیدنا ابو بکرؓ کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے انہیں فدیہ کے عوض رہا کر دینے کا فیصلہ فرمایا۔ (11)

فتح مکہ کے دن سیدنا عباسؓ ابو سفیان کو (جو اب تک ایمان نہ لائے تھے) اپنے پیچھے خچر پر سوار کر کے رسول اللہ کی خدمت میں لائے۔ حضرت عمر نے عرض کیا اگر اجازت

ہوتو میں اس دشمن خدا کی گردن اڑا دوں۔ سیدنا عباس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے ابوسفیان کو پناہ دی ہے۔ سیدنا عمر نے اصرار کیا تو جنابِ عباس رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اے ابن خطاب! اگر ابوسفیان قبیلہ بنی عدی میں سے ہوتے تو آپ ایسا نہ کہتے۔ اس پر سیدنا عمر نے کہا اے عباس! جس دن آپ اسلام لائے تھے آپ کا اسلام لانا میرے نزدیک خطاب کے اسلام سے (اگر وہ اسلام لاتا) زیادہ محبوب تھا کیونکہ آپ کا اسلام رسول اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب تھا۔ (12)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کو ہمہ وقت نسلی تعصب سے بالاتر رہنے کی تلقین فرماتے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک غزوہ (غزوہ مسر یسیع شعبان 5 ہجری) میں ہم رسول اللہ کے ہمراہ تھے۔ ایک مہاجر نے کسی بات پر ایک انصاری کو تھپڑ مارا۔ انصاری نے انصار کو اور مہاجر نے مہاجرین کو مدد کے لیے پکارا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا تو پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ جب سارا ماجرا عرض کیا گیا تو فرمایا یہ دعویٰ جاہلیت اچھا نہیں۔ اس طرح فساد رفع ہو گیا۔ (13)

اسلام سے قبل ساری دنیا میں انسانوں کو غلام بنا لینے کا عام رواج تھا۔ انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح منڈیوں میں فروخت کیا جاتا اور ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اسلام نے ان کی عزتِ نفس کو بحال کیا اور ایسے قوانین وضع کیے جن پر عمل کے نتیجے میں رفتہ رفتہ دنیا بھر سے غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔ نبی کریم علیہ التحیہ والتسلیم نے غلاموں کی آزادی کو آخرت میں نجات کا باعث قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ جو کوئی کسی مسلمان غلام کو آزاد کرتا ہے اس کے ہر عضو کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ اس کا ایک عضو دوزخ کی آگ سے آزاد کرتا ہے۔ (14)

اسلام نے کفارات میں جا بجا غلام آزاد کرنا واجب قرار دیا اور معاشرتی زندگی میں غلاموں کے حقوق کا خیال رکھا گیا۔ سیدنا ابو مسعود انصاری روایت کرتے ہیں کہ میں اپنے غلام

کو مار رہا تھا کہ میں نے پیچھے سے یہ آواز سنی: ابو مسعود! جان لو کہ تم کو جس قدر اختیار اس غلام پر ہے اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو تم پر ہے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو رسول اللہ (ﷺ) تھے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے اسے رضائے الٰہی کی خاطر آزاد کر دیا۔ آپ نے فرمایا: دیکھو اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تمہیں جلاتی۔ (15)

سیدنا ابوذرؓ کا بیان ہے کہ میں نے ایک عجمی غلام کو برا بھلا کہا۔ اس نے رسول اللہ سے شکایت کر دی۔ آپ نے فرمایا: ابوذر تم سے جاہلیت نہیں گئی؟ سنو وہ تمہارے بھائی ہیں' خدا نے تم کو ان پر فضیلت دی۔ ان میں سے جو تمہارے موافق نہ ہو اس کو بیچ دو اور خلق خدا کو عذاب نہ دو۔ (16)

سیدنا عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا: یا رسول اللہ! ہم غلام کو کتنی بار معاف کر دیا کریں۔ آپ خاموش رہے۔ اس نے دوسری بار پوچھا تو پھر بھی آپ خاموش رہے' تیسری بار دریافت کرنے پر فرمایا کہ ہر روز ستر بار معاف کر دیا کرو۔ (17)

سیدنا انس نے دس سال تک نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینت کی خدمت کی۔ اس تمام عرصہ میں آپ نے کبھی انہیں اف تک نہ کہا اور نہ یوں فرمایا کہ فلاں کام کیوں کیا اور فلاں کیوں نہیں کیا؟ (18)

نبی پاک صاحب لولاک علیہ التحیہ والتسلیمات کو غلاموں کی بہبودی کا اس قدر خیال تھا کہ جب وفات شریف کا وقت عین قریب آیا تو آپ یوں وصیت فرما رہے تھے: اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ یعنی نماز اور غلاموں کا خیال رکھنا۔ (19)

عرب کے جاہلی معاشرے میں شہری اور دیہاتی کی تفریق اور تعصب بھی انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔ شہر کے باسی اپنے آپ کو مہذب بلکہ اعلیٰ و ارفع مخلوق خیال کرتے اور دیہاتیوں سے نفرت کرتے تھے۔ جنگ بدر کے بعد سیدنا عبداللہ بن مسعود نے ابوجہل کو کفار کے

مقتولین ومضروبین کے درمیان خون میں لت پت پڑا ہوا پایا۔ دیکھا تو اس میں زندگی کی رمق باقی تھی ابن مسعود اس کو قتل کرنے کی نیت سے اس کے سینے پر بیٹھ گئے اور اس کی ناپاک داڑھی کو پکڑ کر کہا: کیا تو ابوجہل ہے؟ بتا تجھے اللہ نے کیسا رسوا کیا؟ اس لعین نے کہا: کاش مجھے کسان کے علاوہ کوئی اور قتل کرتا اس جواب میں اس لعین کا تکبر اور انصار کی تحقیر پائی جاتی ہے کیونکہ ابوجہل کو فنافی النار کرنے والے سیدنا معاذ اور سیدنا معوذ انصار میں سے تھے۔ سیدنا ابن مسعود نے اس کا کام تمام کر دیا اور یہ خبر حضور کی خدمت اقدس میں لائے تو آپ نے فرمایا: یہ اس امت کا فرعون ہے۔ (20)

نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم دیہاتی کسانوں سے بہت پیار کیا کرتے تھے۔ شمائل ترمذی باب ماجاء فی مزاح رسول اللہ میں منقول ہے کہ زاہر نام کے ایک بدوی صحابی جو خوبصورت نہ تھے جنگل کے پھل وغیرہ آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ لایا کرتے تھے جب وہ آپ سے رخصت ہوتے تو آپ شہر کی چیزیں کپڑا وغیرہ انہیں دے دیا کرتے تھے۔ آپ کو ان سے محبت تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ زاہر ہمارا دیہاتی کسان اور ہم اس کے شہری ہیں۔ ایک دن آپ بازار کی طرف نکلے تو دیکھا کہ زاہر اپنا سودا بیچ رہے ہیں۔ آپ نے پیٹھ کی طرف جا کر اس کی آنکھوں پر اپنا دست مبارک رکھ دیا اور ان کو گود میں لیا وہ بولے کون ہے؟ مجھے چھوڑ دو۔ پھر مڑ کر دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ پس اپنی پیٹھ اور بھی رسول اللہ کے سینے سے لپٹانے لگے۔ آپ نے فرمایا: کوئی ہے جو اس غلام کو خریدے وہ بولے یا رسول اللہ! اگر آپ مجھے بیچتے ہیں تو بہت کم قیمت پائیں گے۔ فرمایا کہ تو خدا کے نزدیک تو بڑا قیمتی ہے۔ (21)

نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم بچوں سے بہت زیادہ پیار اور شفقت فرمایا کرتے تھے۔ آپ بچوں کو اپنے ساتھ سواری پر بٹھا لیا کرتے تھے اور پیار سے چوما کرتے تھے۔ ایک دن آپ سیدنا حسنؓ کو چوم رہے تھے۔ اقرع بن حابس تمیمی آپ کے پاس بیٹھے تھے

دیکھ کر کہنے لگے کہ میرے دس بیٹے ہیں میں نے ان میں سے کبھی کسی کو نہیں چوما۔ آپ نے فرمایا: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ ایک بدو کہنے لگا کہ تم تو بچوں کو چومتے ہو ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ جب تمھارے دل سے رحم نکال لے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ (22)

آپ کے پاس جب کوئی پھل وغیرہ آتا تو آپ اسے تقسیم فرماتے وقت سب سے پہلے محفل میں موجود سب سے چھوٹے بچے کو عطا فرماتے۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الادب)

سیدہ ام خالد بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کپڑے آئے۔ ان میں ایک سیاہ چادر تھی، جس میں دونوں طرف آنچل تھے۔ آپ نے حاضرین سے پوچھا کہ یہ چادر کس کو اوڑھاؤں۔ کسی نے جواب نہ دیا تو آپ نے فرمایا: ام خالد کو لاؤ۔ مجھے لے گئے تو آپ نے اپنے دست مبارک سے وہ چادر مجھے اوڑھائی اور دو دفعہ فرمایا: تو اسے پہن کر پرانی کرے۔ آپ چادر کی بُوٹیاں دیکھ رہے تھے اور ہاتھ مبارک سے میری طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے: ام خالد! یہ سنہ ہے۔ ام خالد یہ سنہ ہے۔ سنہ حبشی زبان میں میں حسن یعنی اچھے کو کہتے ہیں۔ (23)

عورت نوع انسانی کا مظلوم ترین طبقہ ہے۔ اسلامی دور کے علاوہ تقریباً ہر زمانے اور ہر خطے میں اس کی حالت قابل رحم رہی ہے۔ عرب میں لذدواج کی کوئی حد نہ تھی چنانچہ سیدنا غیلان ثقفی ایمان لائے تو ان کے پاس دس منکوحہ عورتیں تھیں۔ جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کا بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو وراثت میں پاتا، وہ خود اس سے شادی کر لیتا یا اپنے بھائی یا قریبی رشتہ دار کو شادی کے لیے دے دیتا۔ بصورت دیگر اسے شادی سے منع کرتا۔ تبت میں اگر عورت ایک مرد سے شادی کرتی تو وہ اس مرد کے دوسرے بھائیوں کی بھی زوجہ سمجھی جاتی۔ مجوسیوں کے ہاں بیٹی اور ماں سے بھی نکاح جائز سمجھا جاتا تھا۔ نیوگنی میں شوہر کو عورت پر پورا پورا اختیار حاصل تھا وہ اپنے شوہر کا مال تھی کیونکہ شوہر اس کے لیے ایک رقم ادا

کیا کرتا تھا۔ بعض حالات میں شوہر اس کو قتل بھی کر سکتا تھا۔

ہندوستان میں کثرت ازدواج اور نیوگ کو جائز سمجھا جاتا تھا۔ شوہر مر جاتا تو بیوہ نکاح ثانی نہ کر سکتی تھی بلکہ اسے دنیا میں زندہ رہنے کا حق بھی حاصل نہ تھا۔ وہ شوہر کی چتا میں زندہ جل کر بھسم ہو جاتی اور ستی کا پوتر لقب حاصل کرتی عجب یہ کہ ایسا حکم صرف عورتوں کے لیے تھا مرد اپنی عورتوں کی چتا میں نہیں جلتا تھا۔ (24)

عراق و شام میں خشک سالی کے ازالہ کے لیے کنواری نوجوان عورت کو صحرا میں ذبح کر دیا جاتا۔ یورپ کے تاریک عہد میں وبا کو ٹالنے کے لیے عورت کو زندہ جلا دیا جاتا۔ قسطنطیہ کے فرماں روا بیمار ہو جاتے تو نابالغ بچی کے خون کو پانی میں ملا کر غسل کرتے۔ ہنگری کے رئیس اپنی جوانی کو تابناک رکھنے کے لیے عورتوں کے خون سے نہایا کرتے۔

قدیم یونان اور روم میں جب جنگیں ہوتیں تو دونوں متحارب فریق میدان میں اترنے سے پہلے اپنے اپنے دیوتاؤں کی قربان گاہوں پر نوجوان لڑکیاں ذبح کرتے تاکہ دیوتا عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھا کر خوش رہیں اور لڑنے والوں کو فتح کے انعام سے نوازیں۔ (25)

مصر میں سیدنا عمرؓ کے دور تک دریائے نیل میں پانی کی روانی کی خاطر دوشیزہ کو ذبح کیا جاتا رہا۔ دنیا کے کسی مذہب میں والدین یا شوہر کے ترکہ میں عورت کا کوئی حق نہ تھا ور اب تک بھی اسلام کے علاوہ کسی مذہب نے عورت کو ترکہ کا حقدار نہیں ٹھہرایا۔ آج کے نام نہاد رقی یافتہ دور میں تو عورت اور بھی مظلوم ہو کر رہ گئی ہے اسے آزادی کے نام پر اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے اور اسے مردوں کی سفلی خواہشات کی تکمیل کا سستا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔ عورت پر ظلم و ستم پہلے سے بھی بڑھ کر روا رکھا جاتا ہے۔ نئی تہذیب کے علمبردار برطانیہ کے دورِ حکومت میں تقسیم ہند کے موقع پر ایک لاکھ عوتیں اغوا ہوئیں اور اس معاملہ میں مذہب اور نسل کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا۔ بوسنیا ور ہرزے گووینیا میں ایک لاکھ

عورتوں کو قتل کیا گیا اور تیس ہزار سے زنا بالجبر کیا گیا۔ (26)

اسلام نے عورت کو بلند ترین مقام پر فائز کیا۔ ماں کے قدموں تلے جنت کی نوید سنائی گئی۔ عورت ماں ہو یا بیٹی' بہن ہو یا بیوی' ہر حالت میں اس کی بنیادی ضروریات اور جملہ اخراجات کی ذمہ داری مرد پر عائد کی گئی۔ کثرت ازدواج کو چار تک محدود کر دیا گیا' اسے بھی عدل کی شرط سے مشروط کر دیا گیا۔

لسانی تعصب بھی انسانی معاشرہ کے لیے ایک ناسور کی حیثیت رکھتا ہے نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اپنے عمل و کردار اور تعلیمات کے ذریعے اس پر بھی کاری ضرب لگائی۔ آپ کی بولی اگرچہ عربی تھی مگر آپ بعض اوقات اپنی گفتگو میں دوسری زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کر لیا کرتے تھے۔ ام خالد بنت خالد بن سعید امویہ کے والدین ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے یہ وہیں پیدا ہوئیں اور لڑکپن میں وہاں سے مدینہ آ گئیں۔ ان کا بیان ہے کہ ایک روز میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ زرد رنگ کا کرتہ میرے بدن پر تھا۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا "سنہ سنہ" حبشی زبان میں سنہ حسنہ کو کہتے ہیں۔ (27)

اسلام نے ہر قسم کی طبقاتی کشمکش اور گروہی تعصب کو بہترین حکمت عملی کے ذریعے باہمی رواداری اور معاشرتی اتحاد میں تبدیل کر دیا۔ یہ باہمی رواداری اپنوں تک محدود نہ رہی بلکہ نبی کریم رؤف رحیم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے تو اس کا دائرہ غیر مسلموں تک وسیع کر دیا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ عمل میں آیا جس کی رو سے باہمی رواداری' مشترکہ دفاع اور مذہبی آزادی کے اصولوں پر اتفاق کیا گیا اور باہمی اختلافات کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم تسلیم کیا گیا۔

اسلامی عبادات کا اصل مقصد بھی مثالی انسانی معاشرہ قائم کرنا اور ہر قسم کے تعصبات کو ختم کر کے وحدت اسلامی کی فضا قائم کرنا ہے۔ نماز میں دور و نزدیک کے تمام علاقہ جات

سے تعلق رکھنے والے لوگ بیت اللہ کو نقطہ مرکز یہ اور قبلہ مان کر اس کی جانب منہ کرتے ہیں۔ اور کالے گورے، عربی عجمی، امیر غریب، حاکم محکوم تمام ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں تو طبقاتی تعصب کی تمام دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح حج میں مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف علاقوں اور ملکوں سے تعلق رکھنے والے، مختلف لباس پہننے والے اور مختلف رسم ورواج کے حامل لوگ جب احرام کا ایک ہی لباس زیب تن کرتے ہیں اور ایک ہی زبان میں لبیک اللھم لبیک کا نغمہ سرمدی زبان پر لاتے ہیں تو وحدت و یگانگت اور اتحاد واتفاق کی ایسی فضا دیکھنے کو ملتی ہے جس کی مثال روئے زمین پر اور کہیں نظر نہیں آتی۔

الغرض تعلیمات نبوی نے نوع انسانی کو اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ حق ترجمان سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ کہ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر اس کے بعد آنے والوں کا اور پھر اس کے بعد آنے والوں کا۔

لاریب بہترین انسانی معاشرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے دور میں قائم ہوا۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا اس انتہائی معاشرتی ترقی کے گراف میں کمی واقع ہوتی گئی لیکن ہر دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام لیواؤں نے اپنے عمل و کردار کے ذریعے قابل قدر روشن مثالیں قائم کیں۔ خلفائے راشدین کا زمانہ تو خیر القرون اور منہاج نبوت کے عین مطابق تھا اس کے بعد جب ملوکیت قائم ہوئی اور بادشاہوں نے اپنی سج دھج برقرار رکھنے کے لیے اسلامی اصولوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تو علمائے کرام اور صوفیائے عظام نے انسان دوستی اور باہمی رواداری کا علم بلند کیا اور دنیا میں ہر قسم کے تعصب کے خاتمے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

صوفیائے کرام کے عمل و کردار کے ذریعے اسلام کا پیغام برصغیر، ایشائے کوچک، مغرب اقصیٰ اور مشرق بعید کے ممالک تک جا پہنچا۔ ایشائے کوچک کے ممالک پر یونن

صدی تک اشتراکی روس کا قبضہ رہا۔ اس دور میں اسلامی مدارس، مساجد اور اسلامی تشخص کے اظہار پر جبری پابندیاں عائد رہیں لیکن جونہی سویت یونین روس کا شیرازہ بکھرا اور یہ ممالک آزاد ہوئے تو ان ممالک میں اسلامی جوش و جذبہ کی وہی لہر پھر ابھر آئی۔ اسلامی تشخص کی اس بقا کی بڑی وجہ ان ممالک میں صوفیاء کا کردار ہے۔

تصوف کے چار بڑے سلسلے ہیں: نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ اور اسے حسن اتفاق کہیے کہ ان چاروں کے بانیوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق شمالی ایران اور ایشیائے کوچک کے ممالک ہی سے ہے۔ خصوصاً سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے اثرات ان ممالک میں بہت گہرے ہیں۔ کمیونسٹ روس کے دور عروج میں سب سے بڑی مزاحمتی تحریک کے روح درواں امام شاملؒ کا تعلق اسی سلسلے سے تھا۔ کمیونسٹوں نے مسلمانوں کے سروں کو تو جھکا لیا لیکن ان کے دلوں کو وہ جھکانے میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ انہیں صوفیائے کرام کی روحانی تعلیمات نے ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔ سمرقند و بخارا کے علمی اور روحانی مراکز نے ایسے چراغ روشن کیے جن کو کفر و شرک کی تیز آندھیاں بھی بجھا نہ سکیں۔ اس کے برعکس ہسپانیہ میں تقریباً آٹھ صدیوں تک حکومت کرنے کے باوجود آج وہاں ایک مسلمان بھی نظر نہیں آتا تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں صوفیاء کا کردار بہت کم رہا۔ ہسپانیہ نے بڑے بڑے علماء، فلاسفر، سپہ سالار اور حکمران تو پیدا کیے مگر صوفیاء کا کوئی معروف سلسلہ وہاں جاری نہ ہو سکا۔ اگرچہ شیخ الاکبر محی الدین ابن عربیؒ کا تعلق ہسپانیہ سے تھا مگر انہوں نے تصوف کو فلسفہ کے رنگ میں پیش کیا جس کے سبب وہ خود ایک متنازعہ شخصیت بن گئے ویسے بھی وہ اڑتیس سال کی عمر میں ہسپانیہ سے چلے آئے اور باقی تمام عمر بلاد شرقیہ ہی میں گزار دی اور دمشق میں دفن ہوئے۔

صوفیائے کرام کی عملی زندگی سنت نبوی کے عین مطابق ہوتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کو سیرت مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء کی روشنی سے مستنیر کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات

کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ وہ ہمہ وقت احترام آدمیت اور باہمی رواداری کا درس دیتے رہے ہیں اور اس سلسلے میں وہ خود اپنے آپ کو عملی نمونہ کے طور پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی بھی حالت میں کسی انسان کا برا نہیں چاہتے۔ کشف المحجوب میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری اپنے ساتھیو ں کے ہمراہ دریائے نیل میں ایک کشتی پر جا رہے تھے۔ دوسری جانب سے ایک کشتی آ رہی تھی جس پر کچھ آوارہ لوگ غیر اخلاقی حرکات کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر حضرت ذوالنون کے ساتھیوں کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے حضرت ذوالنون سے عرض کی کہ حضرت ان کے غرق ہونے کی دعا کیجئے۔ حضرت ذوالنون کھڑے ہو گئے اور دعا کرنے لگے: الٰہی! تو نے ان لوگوں کو دنیا میں عیش وعشرت عطا کی' آخرت میں بھی انہیں راحت وسکون عطا فرما۔ اس دعا پر آپ کے ساتھیوں کو بہت حیرت ہوئی۔ کشتی رفتہ رفتہ قریب آ گئی اور جب کشتی والوں نے حضرت ذوالنونؒ کو دیکھا تو بے اختیار رونے لگے۔ آپ سے معذرت کر کے اپنے آلات موسیقی توڑ ڈالے۔ توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیا۔ اس پر حضرت ذوالنون نے ساتھیوں سے کہا: تم نے دیکھا مقصد حاصل ہو گیا وہ بھی کامیاب ہو گئے تم بھی کامران ہو گئے کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔

ایثار' سیرت مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء کا ایک اہم باب ہے اور صوفیہ کی زندگی کا بنیادی اصول بھی یہی ہے۔ امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیریؒ رسالہ قشیریہ میں لکھتے ہیں کہ صوفیاء کے ایک دشمن غلام الخلیل کے ایک جھوٹے الزام پر بادشاہ وقت نے عظیم صوفیاء ابوالحسن نوریؒ، رقامؒ اور ابوحمزہؒ کے قتل کا حکم دے دیا۔ جلاد نے سب کے ہاتھ باندھ دیے اور تلوار لے کر ان کی طرف بڑھا تو نوریؒ مسکرائے اور سب سے پہلے قتل گاہ میں پہنچ گئے۔ جلاد نے کہا اے جواں مرد! تیری باری ابھی نہیں آئی اور تلوار ایسی چیز بھی نہیں جس کے آگے آ کر خوشی محسوس کی جائے۔ نوری نے جواب دیا کہ میرا مسلک ایثار ہے۔ زندگی میرے لیے عزیز ترین چیز ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میری باقی چند سانسیں میرے ان بھائیوں کے

کام آجائیں۔ میرے خیال میں اس دنیا کی زندگی کا ایک لمحہ بھی دوسری دنیا کے ہزار سال سے بہتر ہے۔ یہ مقام خدمت ہے وہ مقام قربت ہے اور قربت خدمت سے حاصل ہوتی ہے۔ قاصد نے یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی وہ نوری کی باتوں سے حیران رہ گیا۔ اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے قتل کا حکم منسوخ کر دیا۔

اسی طرح کے ایثار کا ایک اور واقعہ کشف المحجوب میں ہے کہ دس درویش ایک جنگل میں سفر کر رہے تھے۔ ان کو سخت پیاس لگی۔ ان کے پاس پانی کا صرف ایک پیالہ تھا۔ ہر ایک نے چاہا کہ پانی کوئی دوسرا پی لے اور اس کی زندگی بچ جائے۔ اس ایثار اور قربانی میں نو درویش وفات پا گئے۔ دسویں درویش نے جب دیکھا کہ اب صرف وہی زندہ ہے تو اس نے پانی پی لیا اور منزل تک پہنچ گیا۔ کسی نے اس درویش سے پوچھا کہ آپ نے پانی کیوں پیا؟ درویش نے جواب دیا کہ اگر میں بھی پانی نہ پیتا تو خودکشی کا مرتکب ہوتا اور عذاب میں گرفتار ہوتا۔ پوچھنے والے نے پھر پوچھا کہ کیا باقی نو درویشوں نے خودکشی کی؟ درویش نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے قربانی کرتے رہے تاہم جب صرف میں باقی رہ گیا تو شریعت کے حکم کے مطابق جان بچانے کے لیے پانی پینا مجھ پر واجب ہو گیا۔

القصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور تعلیمات کی مکمل تصویر علمائے کرام کی تحریروں میں نظر آتی ہے یا صوفیاء کرام کی عملی زندگیوں میں۔ آج کے دور کی بے اصولی، بدامنی، انتشار، باہمی دشمنی، طبقاتی کشمکش، نسلی و علاقائی تعصبات اور دوسری تمام برائیوں کا علاج سیرت نبوی کے سنہری اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں ہے اس مقصد کے لیے ہمیں کتاب و سنت پر مکمل ایمان لانا ہوگا اور علماء امت و صلحائے ملت کی پاکیزہ زندگیوں سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ کیونکہ ؎

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

مصادر و مراجع

(1) (النساء:۱)

(2) (ابوالمنذر ہشام کلبی: کتاب الاصنام مطبوعہ مصر 1343 ہجری)

(3) (امام ابن جریر الطبری، تاریخ طبری، خطبہ حجۃ الوداع)

(4) امام عبدالرزاق (مصنف عبدالرزاق)

(5) (سیرت ابن ہشام) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(6) (الحجرات:13)

(7) (البقرۃ:273)

(8) (مشکوہ۔ترمذی)

(9) امام ابن حجر العسقلانی (الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ) حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ

(10) علامہ ابن عبدالبر (الاستیعاب فی معرفۃ الصحاب) عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ

(11) امام محمد بن اسماعیل بخاری الجامع الصحیح (صحیح بخاری۔باب امداد بالملائکہ فی غزوہ بدر)

(12) امام البیہقی (سنن البیہقی)

(13) مولانا نور بخش توکلی (سیرت رسول عربی صفحہ نمبر 215)

(14) (مشکوۃ المصابیح)

(15) (مشکوۃ المصابیح۔باب النفقات وحق المملوک)

(16) امام ابوداؤد (سنن ابوداؤد: کتاب الادب۔باب فی حق المملوک)

(17) امام ابوداؤد (سنن ابوداؤد: کتاب الادب۔باب فی حق المملوک)

(18) امام محمد بن اسماعیل بخاری الجامع الصحیح (صحیح بخاری۔کتاب الادب)

(19) (مشکوۃ المصابیح) باب وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(20) مولانا نور بخش توکلی (سیرت رسول عربی صفحہ نمبر 98)

(21) (علامہ شبلی نعمانی۔سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

(22) امام محمد بن اسماعیل بخاری الجامع الصحیح (صحیح بخاری۔کتاب اللباس)

(23) امام محمد بن اسماعیل بخاری الجامع الصحیح (صحیح بخاری۔کتاب اللبفاس)

(24) مولانا نور بخش توکلی (سیرت رسول عربی صفحہ نمبر 231

(25) (محمد اعظم خاکوانی'' ستم کی رسمیں '' سنڈے ایکسپریس' 30 / اپریل 2006ء' ص 6)

(26) (محمد اعظم خاکوانی'' ستم کی رسمیں '' سنڈے ایکسپریس' 30 / اپریل 2006ء' ص 6)

(27) امام محمد بن اسماعیل بخاری الجامع الصحیح (صحیح بخاری۔کتاب الادب)

طبقاتی اور لسانی تعصّبات کا حل

پروفیسر ڈاکٹر سید قمر علی زیدی
شعبۂ عربی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

طبقاتی اور لسانی تعصّبات کا حل

پروفیسر ڈاکٹر سید قمر علی زیدی

حلقۂ محبت میں نور و شعور کے طالبو!

ابتدائے آفرینش ہی میں ایک قصۂ طویل شروع ہوا' جس میں مخلوقات کی برتری، احساسِ برتری اور عصبیت کے کردار نظر آتے ہیں اور آج تک یہ کہانی ہمارے معاشرے میں کبھی نسل، علاقہ اور کبھی لسانیات اور طبقات بندی کے مختلف عنوانات سے علم اور عمل کے رویوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔

خلافت الٰہی کا تاج تو آدم کے سر پر ہی رکھا جانا تھا لیکن اس مقام بلند تک پہنچنے کے لئے قصۂ آدم و ابلیس نے اخلاقیات کے مثبت و منفی رویوں کو جنم دیا۔ برتری کے احساس کے سبب ابلیس کو اپنی نسل کی فوقیت جتلانا پڑی۔ اس نے ﴿اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ﴾ (الاعراف:12) کا دعویٰ پیش کیا اور دلیل میں ﴿خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ﴾ (الاعراف:12) کی ایک موجود حقیقت کو پیش کیا۔

مشیت الٰہی نے اس رویے کو سخت ناپسند فرمایا اور ﴿فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّکَ رَجِیۡمٌ﴾ (ص:77) کا فیصلہ صادر فرماتے ہوئے کائنات کے مستقبل کے رویوں اور فطرت کے قوانین کا اجراء فرما دیا۔ دشمن ازلی ابلیس کو آدم کی ذات سے دشمنی تو تھی ہی، اسے آدم کے خطۂ رہائش جنت سے بھی حسد تھا اور پھر ابلیس نے ہزار جتن کیئے اور آدم کے داخل

وخارج میں اپنے روحانی ونفسیاتی اثرات قائم کرنے میں کامیاب ہوا اور قیامت تک کے لئے خدائی اجازتوں اور طاقتوں کا سہارا لے کر گمراہی اور کج فکری کا وہ بازار گرم کیا ہے کہ نسل انسانی کو عصبیت کے جالوں میں جکڑ ڈالا ہے۔ اپنی ذات کی خرابیوں کو' فطرت کے پُرفریب حوالوں سے مزین کرتے ہوئے' انسانی نفوس پر' نہ صرف وارد کرتا ہے بلکہ راسخ کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زبان، علاقہ، نسل اور طبقات پرستی کے پرستار اپنے تعصب کو فطرت کی حقیقت بتا کر زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔

خالق فطرت نے حقائقِ تخلیق اور عُمرانی و معاشرتی امتیازات اور انسانی خود ساختہ ثقافت کی خوب خوب اور بجا طور پر وضاحت کی ہے۔ فرمایا:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ. اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ﴾ (الروم:22)

ترجمہ: کہ دیکھو اس ربّ قدیر کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمانا اور تمہاری زبانوں کا مختلف ہونا اور تمہارے رنگوں کا مختلف ہونا، ان سب باتوں میں تو اہل علم کے لئے علامات معرفت ہیں۔

یہ تخلیق سماوات وارض، یہ خطہ ہائے زمین کے رنگا رنگ جغرافیائی پہلو، یہ علاقوں کے مختلف خدوخال اور وہاں کے باسیوں کے ہزار پہلو ہائے اندازِ گفتگو، خیالات پر جغرافیائی اثرات اور الفاظ پر ماحول کی چھاپ اور پھر فضائے کائنات میں بدلتے موسم اور مستقل آب و ہوا کے زیر اثر چہروں کے نقش و نین اور پھر دلآویز اور پرآب رنگ جسم وبدن' دراصل خالق قدیر کی قدرت کا پتہ دیتے ہیں نہ کہ انسانوں کو تقسیم کرنے کا فارمولا بتاتے ہیں:

عِبَارَتُکَ شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ

تعبیراتِ خیالات کمزور و کوتاہ ہیں لیکن حسنِ حقیقت بہت ہی بلند ہے۔ آج کے موضوع کا سوال یہی ہے کہ اسفل و اعلیٰ کے درمیان اتنے بڑے فاصلے کو کون دور کرے گا؟

جی ہاں پوری انسانیت، واقعاتِ تمدن، دساتیرِ عالم اور اخلاقیات کے ضابطے پڑھ لینے کے بعد نظر اسی کرم نوازِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جا کر ٹھہرتی ہے جس نے تمام عمر طبقاتی، لسانی اور نسلی امتیازات کو ختم کرنے اور ابلیسی اخلاقیاتِ باطن کو خدا کے محبوب و منظور اخلاق میں بدلنے کے لئے گزاری اور وقتِ آخر انسانیت پرور نمائندہ اجتماع کو یہ مختصر اور دائمی قانون عطا فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا وَإِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ. أَلَا وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ.
أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَّلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ
وَّلَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ إِلَّا
بِالتَّقْوٰى. إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ.

یہ سب کچھ فرما کر سب سے اعتراف کروایا اور حکم دیا کہ یہ سب باتیں ان لوگوں تک پہنچا دینا جو یہاں حاضر نہیں ہیں اور فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰى مِنَ السَّامِعِ اور ہاں بسا اوقات جس کو یہ پیغام پہنچایا جائے گا وہ سننے والے سے زیادہ عقلمند ہوگا۔

اچھی بات اور ستھرا عمل دوسروں کے دل بھاتا ہے لیکن پائیداری کے لئے خونِ جگر درکار ہے اور خونِ جگر تو محبت صرف محبت یعنی خدا کی محبت اور اس کی محبت کی تکمیل کی خاطر مخلوق سے محبت سے پیدا ہوتا ہے اور یہ محبت رنگ و نسل اور علاقہ و زبان کی توہماتی عمارت کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکتی ہے اور پھر صحرائے اخلاص و جنوں میں ہر رنگ و نسل اور علاقہ و زبان کا انسان ایک ہی قافلہ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس قافلۂ حق میں سلمان، بلال، صہیب اور مقداد و بوذر (رضی اللہ عنہم) جیسے بظاہر کمتر درجہ کے لوگ، بلند قامت قریشیوں کے شانہ

بشانہ نظر آتے ہیں۔

نسل پرستی پر ایسی ضرب کاری کہ ایک ایرانی نژاد سلمان فارسی کے متعلق فرمایا کہ "سَلْمَانُ مِنْ اَهْلِ بَيْتِیْ" کہ سلمان تو ہمارے گھر کا فرد ہے۔ افریقہ کے غلام سیاہ فام بلال کو جناب عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی "سیدنا بلال" کہہ کر پکارتے ہیں۔

حضور سید کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قول مبارک اور اپنے عمل طیب سے اسی پاکیزہ حقیقت کو قانون ورواج بنا کر پیش کیا کہ انسانی فطرت واخلاق کے امتیازات کو بڑائی، تکبر اور مخدومیت میں بدلنے کی کوشش نہ کی جائے۔

آقائے عالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شب وروز کی سیرت اور سفر وحضر کا کردار ایک مسلمہ حقیقت بن کر عوامی زندگی کی گواہی دے رہا ہے۔ ایک کافر غلام اپنے کافر آقا کی خون آشام آنکھوں کے تصور سے لرزہ براندام بیماری کی حالت میں چکی پیس رہا تھا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چکی پیسنے کے لئے خود بیٹھ گئے' کام مکمل کر دیا اور غلام سے فرمایا: آئندہ بھی ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا۔

یہاں پر صرف طبقاتی تفریق پر ہی ضرب کاری نظر نہیں آتی بلکہ احترام انسانیت میں تفریق مذہب بھی رکاوٹ نہیں بنتی۔ حاکم ومحکوم اور آقا وغلام کی امتیازی حدیں بھی طبقاتی تفریق کو جنم دیتی ہیں۔

خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے ہر موقع پر اس خیالی امتیاز کی اپنے عمل پاک سے نفی فرمائی ہے۔ ایک سفر کے دوران جب کھانا پکانے کا مرحلہ پیش تھا تو سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے ذمہ ایک ایک کام بانٹ لیا۔ جنگل سے ایندھن اکٹھا کرنے کا کام خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ذمہ لے لیا۔ جاں نثاروں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! یہ کام بھی ہم خود کر لیں گے۔ جواب میں دو عالم کے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ارشاد فرمایا' اس میں

برتری، نسبی نخوت اور طبقاتی امتیاز کی یکسر نفی نظر آتی ہے۔ فرمایا:

"مجھے پسند نہیں ہے کہ میں خود کو تم سے الگ رکھوں یا اپنے آپ کو بڑا سمجھوں، خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے بڑا شمار کرتا ہے"۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں تو خانہ زاد غلام بن کر خدمت اقدس میں رہتا تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں اتنی خدمت نہ بجا لایا جتنے میرے حصے کے کام خود سرکار کونین مدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود کر دیا کرتے تھے، اپنے جوتے خود مرمت فرماتے، گھر میں جھاڑو اور صفائی کا فریضہ خود انجام دیتے تھے۔

جھاڑو دینا اور جوتے گانٹھنا ایک بلند نسبتی عمل بن گیا ہے۔ ذرا غور فرمایئے! ہمارے نزدیک ان افعال کی حیثیت کیا ہے اور ایسا کام کرنے والے کو ہم معاشرے میں عزت کے کس درجے پر بٹھاتے ہیں! بکریاں چرا کر طبقاتی اور نسلی تفریق قائم کرنے اور پیشہ ہائے محنت کو کسب سے موسوم کرنے کی عملی تردید بھی کر دی ہے۔

مدینہ طیبہ میں چھوٹی چھوٹی بچیاں اپنے گھریلو کاموں کے سلسلے میں معروضات پیش کرتیں کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! ہمارا فلاں کام ہے اس میں آپ ہماری مدد کریں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً ان کے ساتھ چل پڑتے اور خدمت سرانجام دیتے۔

نسلی امتیاز و تفاخر کو رحمت کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول مبارک نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے:

اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنِي اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ

اس قول کی عملی تصویر نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ خلفاء میں بہت

روشن نظر آتی ہے جو علم کا سراپا اور صفائے قلبی کا پیکر تھے۔

قصہ یوں ہے کہ سلطنت غسان کا ولی عہد جبلہ بن ایہم عیسائیت سے تائب ہو کر مسلمان ہوا۔ تألیف قلبی کے زمرے میں:

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کے مصداق اس سے احسن سلوک کیا جاتا تھا۔ ایک روز یہ صاحب کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ یہ اپنے لباس شاہانہ کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ایک بیچارہ بدو بھی اسی دوران میں طواف کر رہا تھا۔ جبلہ اپنے لباس میں مگن، بدو کو خدا سے لگن، نیم مستی میں بدو کا پاؤں جبلہ کی خلعت فاخرہ پر جا لگا۔ نسلی تفاخر نے کروٹ لی اور جبلہ نے بدو کو تھپڑ دے مارا۔ یہ بدو تو اب عظمتِ انسانیت اور انصاف کے عادی ہو چکے تھے۔ امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی، جناب عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ عدالت میں انصاف کے تقاضے پورا کرتے ہوئے جبلہ کو قصوروار قرار دیا اور فرمایا: دیکھو جبلہ! اسلام میں سب انسانوں کو برابری کا قانونی حق حاصل ہے۔ رنگ، نسل اور زبان علاقہ اس قانونی حق کو کمزور نہیں بنا سکتا، اس لئے اس غریب بدو کو راضی کرو ورنہ سزا کے لئے تیار ہو جاؤ۔

محترم قارئینِ کرام!

اَلْاِنْسَانُ بِأَصْغَرِيْهِ الْقَلْبُ وَالِلّسَانُ

گویا انسان کی نصف کائنات اس کی زبان ہے اور اس کے جوہر باطن کی نمائندہ ہے۔ ہمارے نجی و اجتماعی کردار میں ایک مسلمہ اہمیت کی حامل زبان ہی ہے اور بڑے کاموں کی انجام دہی کے لئے سنت الٰہیہ بھی یہی ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (ابراہیم:4)

ترجمہ: ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا تو اس کو اس کی قوم کی زبان دے کر بھیجا

تا کہ وہ ان کے لئے اچھی طرح وضاحت کر دے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جتنے بھی نمائندے دیگر معاشروں اور قبائل کی جانب روانہ فرمائے وہ سب ان کی علاقائی زبانوں سے واقف ہوتے تھے۔ بلکہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو تو خاص طور پر سریانی سیکھنے کا حکم فرمایا۔ حضور سید الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں کئی حضرات اس لئے حاضر ہوتے تھے کہ ان کے لئے دعا فرمائی جائے کہ ان کو غیر عربی زبانیں آ جائیں۔

عربی کی اکملیّت و افضلیت اپنی جگہ لیکن دنیا کی دوسری زبانوں کی اہمیت اور ضرورت کا انکار کسی طرح بھی ممکن نہیں بلکہ اشاعت دین اور توحید بین المسلمین کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے۔

زبان، علاقہ، رنگ و نسل اور طبقات کی محبت میں بے جا گرفتار ہونا' دل کی بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے۔ اس بیماری کی دوا تو باطن کے تزکیے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے اور باطن کا تزکیہ صوفیاء کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام نے انسانی وحدت کو اخلاص اور محبت کی چھتری تلے جمع کیا ہے۔ انہوں نے انسانیت سازی کے قرآنی اصول اور تعلیماتِ مصطفوی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بلادِ غیر میں بھی دلوں کی روشنی کا وہ سامان مہیا کیا' جس کی برکت سے پتھر صفت دل والے بھی انسان دوست بن گئے۔

خطبۂ حجۃ الوداع میں رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دلوں کو پھیرنے کے لئے ایک نہایت قابل عمل طریقہ ارشاد فرمایا:

وَاعْلَمُوْآ اَنَّ الْقُلُوْبَ لَا تُغَلُّ عَلٰی ثَلَاثٍ: اِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَمُنَاصَحَةُ اُولِی الْاَمْرِ وَعَلٰی لُزُوْمِ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ۔

جان لو! دل ان تین باتوں پر حسد و عناد نہیں کرتے:

(1) کسی عمل کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنا۔

(2) حاکم وقت کو از راہ خیر خواہی نصیحت کرنا' اور

(3) مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ شامل رہنا۔

اور جو ان کے علاوہ ہیں' دعوت کا کام ان تک بھی پہنچایا جائے۔

حضرات صوفیائے کرام نے زمان و مکان کے عارضی و مستقل تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے' مختلف علاقوں اور مختلف حالات میں مختلف انداز سے دلوں کے غبار صاف کرتے ہوئے' ہر طبقے میں اصلاح برائے وحدت انسانیت کا فریضہ سرانجام دیا ہے اور اپنی ذات کو اصلاح وارشاد کا مخاطب بنا کر دوسروں سے خطاب کیا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جب تو وعظ کہتا ہے تو تجھے اپنے کلام میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ یہ لذت ریاکاری کے زمرے میں آتی ہے اور ریاکاری شرک ہے۔ خبردار! جب بھی وعظ کہے تو خود سے خطاب کر، تاکہ تیرا نفس شرمندہ ہو اور تیرا دل روشن ہو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام علماء میں معتبر ہے اور صوفیاء میں معتمد ہے۔ ان کی تعلیمات میں نبوی تعلیمات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بھرپور روشنی نظر آتی ہے۔ صوفیاء وعلماء نے اپنی زندگیوں میں اپنی زبان، قلم، تلوار اور عملی رویوں سے انسانی معاشرے کے ناہموار رویوں اور انسانیت کش تعصبات کے خلاف جہاد کیا ہے اور انسانی مساوات وشرف میں رکاوٹ کو دور کرتے ہوئے اخلاص وفکر نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیمات) کا دامن تھامے رکھا۔

سیدنا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر محی الاسلام، غوث اعظم، سیدنا

عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک کا کردار تاریخ میں محفوظ ہے۔ یہ حضرات عام انسان سے لے کر بادشاہ وقت تک کو اپنے علم اور تربیت کے فیضان سے روشن کردار بنانے کی کوشش کرتے۔ علاقہ، زبان اور طبقاتی اونچ نیچ کو ختم کر کے اپنے حلقۂ محبت کے زیرِ دام لا کر خدا پرست انسان دوست مسلمان بنا دیتے تھے۔

صوفیاء کا ایک دبستان حضرت نوشاہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا دبستان ہے۔ ان کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک صوفی کو فی اللیل رھبان وٌ فی النھار فرسان کا بھرپور نمونہ ہونا چاہئے اور معاشرے کے کس مپرس افراد و طبقات سے محبت، بدحال لوگوں کے دلوں پر بلاتفریق نسل و زبان، محبت کی روشنی اتارنا چاہئے۔ ہندو معاشرے میں انہی کی زبان میں پیغام پہنچایا۔ آپ معاشرے کے کمتر لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

کسب چیز اور ہے، ذات چیز اور ہے

اور عملی رویہ یہ تھا کہ محنت پیشہ لوگوں کو مسلمان کیا اور روحانی قربت میں رکھ کر خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس طرح آپ نے کسی بھی دھرم یا دین میں خود ساختہ پنڈت ازم کا بھرم توڑ دیا۔

صوفیائے کرام نے ہمیشہ اہل علاقہ کی زبان اور ثقافت کو پیش نظر رکھتے ہوئے محبت و پیار کا پرچار کیا ہے اور کبھی بھی اپنی زبان کو فاتحین کی زبان بنا کر عوام الناس پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔

برعظیم پاک و ہند کا ایک اور دبستانِ تبلیغ و اصلاح جسے دبستان نظام سے جانا جاتا ہے، حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قریبی دوستوں؛ جن میں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ سرفہرست تھے، کو فرمایا: تم سب مل کر ایک ایسی زبان بناؤ؛ جس سے مقامی لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنا آسان ہو۔ اس خانقاہ میں صرف زبان کی یکسانیت کی بات نہ تھی بلکہ بلاتفریق مذہب و ملت سب نسلوں کے لئے جماعت خانہ اور لنگر خانہ بھی موجود تھا۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اُچ شریف کی خانقاہوں میں روحانی تربیت، ظاہری علوم اور طلبہ کے قیام وطعام کے علاوہ عامۃ الناس کے لئے دو وقت کے کھانے کا مستقل اہتمام کیا جاتا تھا اور اس اہتمام سے فیضیاب ہونے ولوں میں زیادہ لوگ غیر مسلم ہوا کرتے تھے۔ اس بلند پایہ اہتمام میں استعمال ہونے والی اشیاء نہایت عمدہ اور قیمتی ہوتی تھیں، دودھ پینے کے پیالے زمرد کے بنے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ کسی طالب علم سے ایک پیالہ ٹوٹ گیا تو ناظم مطبخ نے خانقاہ کے شیخ تک اطلاع پہنچائی تو شیخ نے فرمایا کہ تمام پیالے بدل ڈالو، طالب علم سے پوچھ گچھ نہ کرنا، کہیں اس کا دل غمگین نہ ہوجائے: ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است

ان صوفیائے کرام کے نزدیک ''اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ'' کا فرمان ہی آئینِ انسانیت تھا۔ انسانیت کش تعریفات' جو معاشرے میں تکبر ونخوت سے پیدا ہوتی ہیں اور تفریق رنگ ونسل کو جنم دے کر انسانیت اور انسان کی وحدت وجمعیتِ قلبی وفکری کو پریشان کردیتی ہیں، وہ بالآخر فریقین کو بے نوری اور کردار کو بے عملی میں بدل ڈالتی ہیں۔

صوفیائے کرام نے اس طرح کی بے سبب عصبیت کی اپنے کردار کی قوت سے نفی کی ہے۔ ان کے نزدیک کسی بھی ثقافت کے امتیازی پہلو کبھی بھی مستقل معیار حیات نہیں ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت فخر الدین اورنگ آبادی کی خدمت میں ایک طویل عرصے تک زیر تربیت رہے اور وہاں کی ثقافت اسی طرح اختیار کی جیسے وہاں کے لوگوں کے ہاں تھی۔ دہلی والوں کی طرح پاجامہ کرتا استعمال کرتے تھے۔ وطن واپسی کے موقع پر ان کے شیخ حضرت اورنگ آبادی نے فرمایا:

میاں صاحب! اب آپ اپنے وطن مالوف پنجاب واپس جارہے ہیں، دھیان رہے کہ وہاں کا مقامی لباس تہہ بند اور کھلا کرتا استعمال فرمایئے گا تاکہ آپ کے ظاہری لباس کے سبب عوام الناس آپ

سے مانوس رہیں۔

صوفیاء کے نزدیک اپنی عارضی ثقافت بے جا اور بے سبب خواہ مخواہ قائم رکھنے سے عامی ذہنوں میں خلل کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے وسواس و توہم کے یہ دروازے اپنی وسیع فکری اور کشادہ عملی سے بند کر دینے چاہئیں اور عامۃ الناس سے مل جل کر رہنے سے یہ احوال نصیب ہوتے ہیں۔

رواداری اسوہ حسنہ کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد طفیل
پروفیسر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی
اسلام آباد

رواداری اسوہ حسنہ کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد طفیل

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آفاقیت اس امر سے عیاں ہے کہ آپ کی تعلیمات تمام انسانوں، تمام مکانوں اور تمام زمانوں کے لئے ہیں۔ جس طرح یہ تعلیمات اپنوں کے لئے مفید اور قابل عمل ہیں اسی طرح یہ تعلیمات بیگانوں کے لئے بھی مفید اور قابل عمل ہیں۔ کیونکہ آپ پوری انسانیت کے پیغمبر اور تمام جہانوں کے لئے سراپا رحمت، راحت اور مہربان ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری تعلیمات انسانی عظمت وکرامت اور عالمی علم وحکمت کا منبع اور سرچشمہ ہیں۔ ان تعلیمات کا تعلق اخلاقی قدروں سے ہو، معاشی اصولوں سے ہو، سیاسی ضابطوں سے ہو یا معاشرتی عوامل سے' وہ سب انسانوں کے لئے یکساں سودمند، قابل تقلید اور انسانی طبیعت کے عین مطابق ہیں۔ اور وہ انسانی رویوں کا نہ صرف رخ متعین کرتی ہیں بلکہ انہیں حقیقی جلا بھی بخشتی ہیں۔

اسوۂ حسنہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ نبوی احکام انسانی معاشروں کو باہم مربوط بناتے، انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب لاتے اور ان میں مودّت والفت کے رشتے استوار کرتے ہیں۔ نیز انسانوں کو فکری آزادی، اپنے مذہب ومسلک کی پیروی اور اپنے نظریہ حیات کی پابندی کرنے کا حق دینے کے ساتھ ساتھ احترام آدمیت، تحفظ

ناموس انسانیت اور انسانی عزت نفس کا اہتمام کرنے کا بھی درس دیتے ہیں۔

نبوی ارشادات کا انسانی پہلو اس وقت مزید اجاگر ہو جاتا ہے جب ہم اس پس منظر سے آگاہ ہوتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں عداوت و دشمنی کا دور دورہ تھا، معمولی باتوں پر برسوں جنگ و قتال جاری رہتا تھا۔ حق و باطل کا پیمانہ صرف انسانی اقوال و بیانات تھے اور انہیں تائید ایزدی یا حمایتِ خداوندی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ قبائلی سردار جو کچھ بتاتے وہی حق اور وہی آخری قانون شمار ہوتا تھا۔ کوئی ایسا حقیقی معیار نہیں تھا جو حق و باطل میں تمیز کر سکے۔

ان حالات میں محسن انسانیت اور رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانوں کو ایک نئے انسانی ادارے سے روشناس کرایا۔ جو ادارہ معاشروں کے قیام اور ان کے باہمی روابط استوار کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ادارہ احترام آدمیت، مذہبی آزادی، فکری اظہار اور معاشرتی مساوات کا آئینہ دار بھی ہے۔ یہ ادارہ تہذیبوں کو اپنا تشخص برقرار رکھنے کی تعلیم بھی دیتا ہے، تہذیبوں کے مابین پائی جانے والی خلیج بھی پاٹتا ہے اور باہمی تبادلہ خیال کے ذریعے یہ ادارہ تہذیبوں کو شیر و شکر بھی کرتا ہے۔

اس اہم سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور دینی ادارے سے ہماری مراد رواداری (Tolerance) ہے۔ جو انسانوں کو ملی حمیت، دینی عزت کا درس بھی دیتا ہے اور انسان کے ناروا رویوں کو برداشت کرنے کا درس بھی دیتا ہے۔ یہ ادارہ انسانوں کے حیوانی جذبات اور انتقامی احساسات کو قابو میں لانے اور جادۂ اعتدال پر قائم رکھنے میں بھی ممد و معاون ہے۔

''رواداری'' اس امر سے عبارت ہے کہ ''انسان اپنا موقف چھوڑے نہ اور دوسرے کے موقف کو چھیڑے نہ''۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا مقبول، پسندیدہ اور آخری دین ہے جو مسلمانوں کی شناخت، پہچان، اس دنیا میں ان کے لئے عزت کا نشان اور آخرت میں فوز و فلاح کی کلید ہے۔ اس لئے کسی بھی مسلمان کو سزاوار

نہیں، کہ وہ اپنی دینی پیروی، مذہبی حمیت وغیرت کو کسی بھی طرح کمزور ہونے دے۔ اسی طرح رواداری کا تقاضا ہے کہ کسی بھی مذہب وملت اور دین وفلسفہ سے وابستہ انسان کا احترام کیا جائے۔ انسان کی بطور انسان عزت وتوقیر کی جائے اور اسی انسانی توقیر کے صلے میں اسے اپنا مذہب ومسلک اور دین وملت برقرار رکھنے کا پورا پورا حق دیا جائے اور اسے کوئی خاص عقیدہ، نظریہ حیات یا طریق زندگی اپنانے اور اختیار کرنے پر مجبور نہ کیا جائے بلکہ حق وصداقت کو دلائل وبراہین کے ذریعے واضح کر کے فیصلہ دوسروں پر چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ ''رواداری'' کا یہ تقاضا ہے اور قرآن حکیم نے ''رواداری'' کے اسی پہلو کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے۔

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرہ:256)

''دین میں کوئی جبر نہیں ہے کیونکہ گمراہی کے مقابلے میں ہدایت واضح ہو چکی ہے''۔

کیونکہ انسان صرف حقائق کی نشان دہی کرنے اور انہیں دلائل سے ثابت کرنے کا پابند ہے جبکہ انسانوں کو ہدایت عطا کرنا اور انہیں راہ راست پر گامزن کرنا اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

''رواداری'' کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان جذباتی نہ ہو۔ غصے میں نہ آئے۔ بلکہ معاملات' حالات اور کوائف کا حقیقت پسندانہ انداز میں ٹھنڈے دل سے جائزہ لے۔ حق، صداقت اور سچ وہی ہے' جس کا تعین وحی کے ذریعے سے ہوا، یہی جادۂ حق اور راہ مستقیم ہے۔ جس تک پہنچنے اور جس پر عمل پیرا ہونے کے لئے انسانی عقل وخرد اور ہوش وحواس کو بروئے کار لانا ہوتا ہے' جو حالت سکون میں ہی ممکن ہے۔

دین' انسانی کامرانی اور انسانی طمانیت سے عبارت ہے جبکہ رواداری اس کامرانی اور طمانیت کے حصول کا بہترین ذریعہ، کیونکہ رواداری کا ایک منشاء یہ بھی ہے کہ انسان زمینی

حقائق کو جذباتی انداز، انتہاء پسندی، غلو یا مبالغہ آمیزی سے تعبیر نہ کرے۔ بلکہ انہیں اسی طرح پر کھے جیسے وہ حقیقت میں موجود ہیں۔ اور انہیں پیش نظر رکھ کر انسانوں کو حقوق اور سچائیوں سے آگاہ کیا جائے اور ایسا کرتے وقت شیریں کلامی اور دلنوازی سے کام لیا جائے کیونکہ یہی رواداری ہے۔ قرآن حکیم بھی اسی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:125)

''اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلایئے اور دوسروں کے ساتھ عمدہ دلائل کے ساتھ تبادلہ خیال کیجئے!''

یہ قرآنی حکم رواداری کے اس عمدہ پہلو کا احاطہ کرتا ہے کہ بین المذاہب مکالمات جاری ہوں۔ ان مکالمات میں جذباتیت کا کوئی عنصر داخل نہ ہو۔ بلکہ مکالمے کا پورا پورا تانا بانا باہمی احترام پر مبنی ہو اور مکالمے کا خمیر دلائل سے اٹھایا جائے۔ چنانچہ رواداری ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ہم ایک جانب بین المذاہب مکالمے (Inter Faith Dialog) کو رواج دیں اور دوسری طرف تمام عالمی مذاہب اپنے اپنے دائروں میں مکالمے کو پروان چڑھائیں تاکہ ہندومت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے ماننے والوں میں جو داخلی ناہمواریاں پائی جاتی ہیں انہیں کم کیا جاسکے۔ جبکہ بین المذاہب مکالمہ انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لائے گا۔ اور انسانی سطح پر رواداری کو فروغ دے گا۔ اسوۂ حسنہ کی تعلیمات ''رواداری'' کو پروان چڑھانے کا عمدہ نمونہ ہیں۔ کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ تخریب کاری، انتہاء پسندی، تشدد کی روش، عسکری جنون اور انسان دشمن سرگرمیاں غصہ اور انتقام کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا اور آپ نے اپنی بے کراں رحمت کو عام کرنے کے لئے انسانوں کو درس دیا کہ وہ غصہ پر قابو پائیں کیونکہ قرآن حکیم مسلمانوں کی یہی صفت بیان کرتا ہے کہ:

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ (آل عمران:124)

''وہ غصہ پی جاتے اور انسانوں کو معاف کر دیتے ہیں''۔

اس قرآنی حکم کی تطبیق ہمیں اسوۂ حسنہ سے بھی ملتی ہے۔ کیونکہ ایک بار کسی شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ آپ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ سائل بار بار نصیحت کرنے کی درخواست کرتا رہا اور رحمت عالم اسے یہی نصیحت فرماتے رہے۔

اسی طرح محسن اعداء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی غصے مٹانے کی مثال قائم کی اور آپ انسانوں سے کبھی غصے نہیں ہوئے اور نہ ہی آپ نے غصے سے مغلوب ہو کر انسانوں سے کبھی کوئی انتقام لیا۔ چنانچہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی شخص سے اپنے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ اس اسوۂ رسول کی روشنی میں رواداری کا یہ بھی مفہوم ہے کہ ملی، مذہبی اور دینی معاملات کا تعلق انفرادی امور سے نہیں بلکہ اجتماعی امور سے ہوتا ہے جو انتہا پسندی، عصبیت اور تشدد کی بجائے امن وسکون، اعتماد سازی اور ہوش مندی کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں۔

''رواداری'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ معاشرے کے منفی رویوں کو نئے مفہوم میں ڈھال دیا جائے۔ ہمیں اسوۂ حسنہ سے یہ درس ملتا ہے کہ انسان کی سلبی قوتوں اور منفی رویوں کو جدید معانی پہنائے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقر وغناء کے مفہوم کو بدلا اور فرمایا ''اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ'' کہ انسان مال ودولت اور مادی وسائل کے ذریعے سے تونگر نہیں ہوتا بلکہ غناء اس انسانی رویے اور جذبے سے عبارت ہے جو اسے انفاق فی سبیل اللہ کے لئے تیار کرتا ہے۔ اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رواداری کے منفی رویوں غصہ، انتقام اور تشدد کا مفہوم بھی تبدیل کر دیا، جب آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اصل میں زبردست اور طاقت ور وہ شخص نہیں جو طاقت کے بل بوتے پر

کشتی میں مد مقابل کو پچھاڑ دے بلکہ بہادر وہ ہے جو اپنے غصے پر قابو پا لے'' اور انتقام نہ لے۔ کیونکہ انتقام لینا رواداری اور حسن سلوک کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی لئے کتب حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مسلمانوں میں سب سے اچھا وہ فرد ہے جسے غصہ دیر میں آئے اور جلد دور ہو جائے اور ان میں سب سے برا وہ شخص ہے جسے غصہ جلد آ جاتا ہو اور بہ دیر دور ہوتا ہو۔

اس طرح رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تشخیص فرمایا کہ وہ انسان سب سے اچھا ہے جو کم سے کم وقت غصہ کی حالت میں رہتا ہے۔ کیونکہ غصے سے خالی ہو کر، حالت سکون میں ہی انسان رواداری کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ ''رواداری'' کا ایک عملی مظاہرہ یہ بھی ہے کہ جب انسان کسی برائی، زیادتی اور بے انصافی کا بدلہ لینے، کسی بدسلوکی کا انتقام لینے اور کسی برے رویئے کا برے انداز میں جواب دینے پر قدرت اور طاقت رکھتا ہو لیکن وہ خشیت ایزدی سے متاثر ہو کر، رضائے الٰہی کے حصول یا انسانی اصلاح اور فلاح و بہبود کی خاطر نہ انتقام لے اور نہ ہی بدلہ لے بلکہ قوت اور طاقت ہونے کے باوجود برائی کے مقابلے میں نیکی کا عملی مظاہرہ کرے تو یہ رواداری کا بلند ترین مظاہرہ ہوگا۔ حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایسے واقعات سے پر ہے چنانچہ سفر طائف اس کی عملی مثال ہے۔ آپ اہل طائف کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لئے وہاں تشریف لے گئے۔ اہل طائف نے نہ صرف آپ کا پیغام سننے سے انکار کر دیا۔ بلکہ بدسلوکی کرتے ہوئے انہوں نے آپ پر پتھروں کی بارش کر دی۔ جس سے آپ اس قدر زخمی ہوئے کہ آپ کے جسم اطہر کے خون سے آپ کے نعلین مبارک پُر ہو گئے۔ لیکن آپ نے اہل طائف سے نہ انتقام لیا اور نہ ہی انہیں بددعا دی۔ بلکہ آپ نے رواداری کا اعلیٰ درجہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ "

اے پروردگار! میری قوم کو ہدایت عطاء فرما دے کیونکہ وہ حقیقت حال سے آگاہ نہیں۔

اہل طائف کے نازیبا سلوک کے جواب میں محسن انسانیت نے دعا دی۔ جو رواداری کا بلند ترین درجہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی کے دوران کعبہ کی کلید برداری عثمان بن طلحہ کے سپرد تھی۔ ہجرت سے قبل ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاہا کہ آپ بیت اللہ کے اندر داخل ہو کر تنہائی میں اللہ کی عبادت کریں۔ آپ نے عثمان بن طلحہ سے بیت اللہ کی چابی مانگی۔ لیکن عثمان بن طلحہ نے چابی دینے سے صاف انکار کر دیا اور ساتھ ہی کچھ ناروا کلمات بھی کہے۔ اس پر سب سے زیادہ شفیق انسان نے عثمان بن طلحہ کو بتایا کہ ''عثمان کسی روز تم دیکھو گے کہ یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا یہ چابی دوں گا''۔ یہ سن کر عثمان بن طلحہ نے کہا ''وہ دن قریش کی تباہی اور رسوائی کا دن ہوگا''۔ اور یہ معاملہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔

بعد ازاں جب مکہ فتح ہوا، تو حضور نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں داخل ہوتے ہی بیت اللہ میں تشریف لے گئے، عثمان بن طلحہ سے چابی لی اور دروازہ کھول کر کعبہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں آپ نے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔ جب آپ بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو چابی آپ کے دست مبارک میں تھی اور آپ سورۃ النساء کی یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے کہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾

اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہلوں کے سپرد کر دو۔

خانہ کعبہ سے باہر آ کر آپ نے دریافت کیا کہ عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟ جب عثمان بن طلحہ (رضی اللہ عنہ) آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے خانہ کعبہ کی چابی انہیں

اپنے ہاتھوں سے دیتے ہوئے فرمایا:

''اے عثمان! اپنی چابی لو۔ آج وفا اور حسنِ سلوک کا دن ہے۔ چابی لو اور یہ تمہارے خاندان میں ہمیشہ موروثی طور پر رہے گی ظالم کے سوا کوئی بھی تم سے اسے نہیں چھینے گا''۔

عبداللہ بن ابی بن سلول نامی ایک شخص مدینہ میں رئیس المنافقین تھا۔ وہ ہجرت مدینہ سے پہلے یثرب کا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ لیکن ہجرت مدینہ کی وجہ سے اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتہائی مخالف تھا۔ اور مسلمانوں کے خلاف ہر وقت سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ چنانچہ غزوۂ اُحُد میں وہ اپنے تین سو افراد کے ساتھ مسلمانوں سے علیحدہ ہوگیا۔ واقعہ افک اسی کے ذہنی اختراع اور ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا۔ نیز وہ اپنے کو مدینہ کا معزز ترین فرد اور خدانخواستہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو وہاں کا کمترین انسان تصور کرتا تھا۔ اس کے باوجود محسن اعداء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے بیٹے سے فرمایا ''اسے چھوڑ دو! بخدا، جب تک یہ ہم میں موجود ہیں ہم اُن سے اچھا برتاؤ ہی کرتے رہیں گے''۔

رواداری کا یہ مفہوم حیات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود ہے کہ انتقام کی طاقت حاصل ہو لیکن انتقام نہ لیا جائے۔ بلکہ اپنے بدترین دشمن سے بھی حسن سلوک کیا جائے حیات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فتح مکہ اس کی عمدہ ترین مثال ہے۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی خطبات مدراس میں رقم طراز ہیں:۔

مکہ جب فتح ہوا تو حرم کے صحن میں، کس حرم کے صحن میں، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالیاں دی گئیں آپ پر نجاستیں پھینکی گئیں، آپ کے قتل کی تجویز منظور ہوئی۔ قریش کے تمام سردار مفتوحانہ کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے، جو اسلام کو مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے

تھے۔ وہ بھی تھے جو آپ کو جھٹلایا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جو آپ کا ہجو بیان کیا کرتے تھے وہ بھی تھے جو آپ کو گالیاں دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو اس پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیوں کا حوصلہ رکھتے تھے۔ وہ بھی تھے جنہوں نے آپ پر پتھر پھینکے تھے۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، آپ پر تلواریں چلائی تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آپ کے عزیزوں کا خون ناحق کیا تھا۔ ان کے سینے چاک کئے تھے اور ان کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کئے تھے، وہ بھی تھے جو غریب اور بے کس مسلمانوں کو ستاتے تھے ان کے سینوں پر اپنی جفا کاری کی آتشیں مہریں لگاتے تھے۔ ان کو جلتی ریتوں پر لٹاتے تھے۔ دہکتے کوئلوں سے ان کے جسم کو داغتے تھے۔ نیزوں کی انی سے ان کے بدن کو چھیدتے تھے۔ آج یہ سب مجرم سرنگوں تھے۔ پیچھے دس تلواریں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اشارہ کی منتظر تھیں۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ کی دہلیز پر کھڑے ان قدیم جانی دشمنوں کو اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب سر جھکائے اپنی موت اور سزایابی کے لئے آپ کے حکم کے منتظر تھے۔ کیونکہ انہیں اپنے کرتوت اور کارنامے بخوبی یاد تھے! آپ کی زبان مبارکہ سے یہ الفاظ دفعتہً نکلے:

بتاؤ آج میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ انہوں نے جواب دیا "تو ہمارا کریم بھائی اور کریم بھائی کا بیٹا ہے"۔ دوسرے ہی لمحہ ان لوگوں نے آپ کی زبان مبارکہ سے سنا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ آج تم پر کوئی دوش نہیں! تم سب کے سب آزاد ہو"۔

رواداری کی اس سے بڑی اور اعلیٰ مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں، مسلمانوں کے دشمنوں اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ انہیں کوئی سزا نہیں دی اور ان پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ بلکہ ان کے تمام قصور، ان کی تمام زیادتیاں اور ان کی تمام بدسلوکیاں، اَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ کہہ کر یکسر معاف کر دیں اور انہیں آزادی کی حقیقی روح اور حقیقی لذت سے روشناس کرایا۔ جو اپنی جگہ رواداری کا اچھوتا مظاہرہ ہے۔

اسوۂ حسنہ کی روشنی میں رواداری کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے نے بھی رواداری کی عمدہ مثالیں قائم کی ہیں، چنانچہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) میری والدہ نعمت ایمان سے مشرف نہیں ہوئیں بلکہ وہ مشرکہ ہیں اور وہ مجھ سے مالی امانت چاہتی ہیں۔ کیا میں ان کی مدد کروں؟ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ وہ ہر طرح سے اپنی والدہ محترمہ کی مدد کریں اور انہیں ضروری وسائل فراہم کریں۔

اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابی رسول اور سب سے زیادہ حدیث روایت کرنے والے راوی ہیں۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کی والدہ محترمہ مدینہ منورہ میں ان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھیں۔ چونکہ وہ کافرہ تھیں، اس لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نفرت کرتی تھیں۔ اور آپ کو برا بھلا بھی کہتی تھیں اور گالی گلوچ سے بھی دریغ نہیں کرتی تھیں۔ ان سب باتوں کا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سخت صدمہ ہوتا تھا۔ ایک روز آپ نے یہ سب کچھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں عرض کیا۔ یہ سن کر آپ کے چہرہ پر ذرہ بھر ملال نہ آیا۔ بلکہ آپ نے فوراً ان کے حق میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اور سید الانبیاء علیہ التحیہ والثناء کی دعا بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی اور سیدنا

ابوہریرہ کی والدہ محترمہ مشرف باسلام ہوگئیں رضی اللہ عنہما۔

اسلامی معاشرے میں رواداری کا عملی مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مسلمانوں نے ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس طرح عمل کیا" اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَةٌ "۔کہ میری امت کے افراد میں اختلاف رائے کا پایا جانا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں اختلاف رائے کی آزادی ہے۔ وہ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کرنے کا پورا پورا حق رکھتے اور اس حق کو بخیر وخوبی استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ فقہی مسالک، سلسلہ ہائے تصوف، کلامی مسائل، متکلمین کے گروہ، انواع واقسام کی قرآنی تفاسیر اور فلاحی ریاست کے بارے میں قائم مختلف نظریات اس حقیقت کا عملی مظاہرہ ہیں کہ مسلمانوں میں اظہار رائے کی کامل آزادی ہے اور رواداری کا عملی مظاہر کرتے ہوئے مسلمان تمام فرقوں، گروہوں اور فکری اختلافات کو اپنے معاشرے میں جگہ دیتے اور قبول کرتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اسوۂ حسنہ کی روشنی میں حاصل ہونے والی رواداری کو مسلم معاشروں میں زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے تاکہ معاشرے سے تشدد، تخریب کاری، بے جاسختی اور غلط عصبیت کا ازالہ ہوسکے اور ایک فلاحی معاشرہ پروان چڑھے۔

واضح رہے کہ رواداری کو پروان چڑھا کر مسلمان باہمی شیر وشکر ہوسکتے ہیں، انسانی خدمت کرسکتے ہیں اور انسانیت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوسکتے ہیں۔ اور رواداری کے بغیر انسانی معاشرہ دنگہ، فساد، دشمنیوں اور بے جا عصبیتوں کا شکار رہے گا۔ اس لئے ہمیں مسلمانوں میں حقیقی رواداری کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہنا چاہئے۔

علاقائی، نسلی، طبقاتی اور لسانی تعصّبات کا حل انسان دوستی اور باہمی رواداری کے حوالے سے علماء وصوفیاء کا کردار

مولانا مفتی محمد صدیق ہزاروی
جامعہ نظامیہ اندرون لوہاری گیٹ
لاہور

علاقائی، نسلی، طبقاتی اور لسانی تعصّبات کا حل

انسان دوستی اور باہمی رواداری کے حوالے سے علماء وصوفیا کا کردار

مولانا مفتی محمد صدیق ہزاروی

خاتم النبیین رسول رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جس معاشرے میں تشریف لائے، وہ چھ سو سال سے وحی الٰہی اور فیضان نبوت سے محروم ہونے کی وجہ سے بدعقیدگی اور بدعملی کے ساتھ سماجی خرابیوں کا بھی شکار ہو چکا تھا۔

ان خرابیوں میں سے ایک خطرناک خرابی علاقائی، نسلی، طبقاتی اور لسانی تعصب ہے، جسے عصبیت ہے۔ اِسے عصبیت جاہلیہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ عصبیت یا تعصب وہ خطرناک رجحان ہے جو عدل وانصاف کی راہ مسدود کرتا ہے۔ فیصلہ انصاف کی بنیاد پر تب ہوتا ہے جب مجرم کو مجرم کی حیثیت سے دیکھا جائے لیکن علاقائی تعلق، لسانی ہم آہنگی، طبقاتی وابستگی اور نسلی رشتوں کو سامنے رکھ کے فیصلہ کیا جائے تو انصاف کی چادر تار تار ہو جاتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا:

أَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ؟ قَالَ لَا وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُعِيْنَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ. (1)

کیا کسی شخص کا اپنی قوم سے محبت کرنا عصبیت ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ یہ بات عصبیت سے ہے کہ کوئی شخص ظلم پر اپنی قوم کی مدد کرے۔

گویا جب عصبیت کی بنیاد پر ظالم اور مظلوم کا فرق مٹ جائے تو معاشرے میں انارکی پھیلتی ہے اور نفرتوں کا سیلاب سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اس تعصب نے معاشرے کو کس طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا' اس کی مثال جنگ بعاث ہے' جو اَوْس اور خَــزْرَج دو قبیلوں کے درمیان ایک صدی سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ قریش اور غیر قریش کے درمیان یہی تفاوت تھا' جس کی بنیاد پر قریش عرفات تک نہیں جاتے تھے اور اس سے پہلے واپس آجاتے' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ثُمَّ اَفِيضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ (2)

پھر تم وہاں سے واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس لوٹتے ہیں۔

عرب وعجم کا تصور اسی علاقائی اور لسانی تعصب کا شاخسانہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے عظمتوں کی حامل ہیں۔ قریش خاندان رسول ہونے کی وجہ سے رفعتوں کے امین اور قابل عزت ہیں لیکن اس علاقائی اور لسانی امتیاز کی وجہ سے ایسی خرابی پیدا ہوئی کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہنا پڑا۔

اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ (3)

تمام لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت حاصل نہیں سفید رنگ والے کو سیاہ فام کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر ہاں فضیلت صرف تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ہے"۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لسانی' علاقائی' طبقاتی اور نسلی بنیاد پر پائے

جانے والے تعصب کو دیکھا تو اس کے قلع قمع کے لئے عملی اور قولی اقدامات کئے۔ مثلاً:

سیدنا ابوعقبہ رضی اللہ عنہ اہل فارس میں سے ایک آزاد کردہ غلام تھے' آپ فرماتے ہیں:

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اُحُد میں شریک ہوا تو میں نے مشرکین میں سے ایک شخص کو ضرب لگاتے ہوئے کہا یہ مجھ سے لو اور میں فارسی غلام ہوں۔ فرماتے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ مجھ سے لو اور میں انصاری غلام ہوں۔ (4)

تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس انداز میں علاقائی نسبت کی بجائے دینی نسبت کی طرف متوجہ کیا۔

اور عملاً اس کا توڑیوں فرمایا کہ سیدنا زید اور ان کے صاحبزادے سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہما کو مختلف مواقع پر اسلامی فوج کی کمان سونپ دی جبکہ ان کے زیر کمان جلیل القدر صحابہ کرام بھی موجود تھے۔ بعض صحابہ کرام کے اعتراض کے باوجود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا اور صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا:

وَايْمَ اللّٰهِ لَقَدْ كَانَ خَلِيْقًا لِّلْاِمَارَةِ (5)

اللہ کی قسم وہ امارت کے لائق تھے۔

یعنی تم طبقاتی تعصب کا شکار نہ ہوا گرچہ سیدنا زید بن حارثہ غلام تھے لیکن آپ نے ان کو جس منصب کے لائق سمجھا عطا فرمایا اور یوں پوری انسانیت کو یہ درس دیا کہ اسلام ان تعصبات کا شکار ہونے کی بجائے معیار اور عدل وانصاف کو فوقیت دیتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ میں داخل ہوئے آپ کے ساتھ حاجب کعبہ سیدنا عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ سیدنا اسامہ بن زید اور

سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہما کعبہ شریف میں داخل ہوئے حتیٰ کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو بھی سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے یہ بات پوچھنا پڑی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز کہاں پڑھی تھی۔ (6)

اور یہ بات واضح ہے کہ سیدنا بلال اور سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہما کا تعلق غلاموں سے تھا۔ قریش مکہ یا انصار مدینہ سے نہیں تھا۔

اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کی ایک ادنیٰ جھلک سے آپ کے اقدامات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

آپ نے ان تعصبات کا حل صرف ایک جملہ میں بیان کر دیا۔

آپ نے فرمایا: اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ (7)

آپ نے لسانی، علاقائی، طبقاتی اور نسلی امتیازات کے تمام بتوں کو توڑ کر صرف اسلامی رشتے کو مضبوط کیا۔ گویا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے چاہے دونوں مختلف علاقوں کے باسی ہوں، دونوں کی زبانیں مختلف ہوں، دونوں کے درمیان نسلی امتیاز بھی قائم ہوں اور بظاہر طبقاتی اونچ نیچ بھی ہو۔ اسی رشتہ اسلام کی وجہ سے محمود ایاز کا فرق مٹ جاتا ہے اور بندہ و بندہ نواز کا امتیاز بھی کافور ہو جاتا ہے۔ جب آپ نے مسلمانوں کو تحفظ عطا کیا تو اس میں بھی اسلامی تعلق کو سامنے رکھا اور ارشاد فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ.

کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ (8)

آپ سے پوچھا گیا کہ اسلام کی بہترین خصلت کیا ہے تو فرمایا:

تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتُقْرِیءُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرِفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ

کھانا کھلانا اور سلام کرنا اس کو پہچانتے ہو یا نہیں۔ (9)

یعنی سلام جو سلامتی اور امن کا پیغام ہے اس کے لئے ان تمام تعصبات کو نظر انداز کر دیا۔

چونکہ ان مذکورہ بالا تعصبات کی بنیاد پر فخر غرور اور تکبر کی راہ اختیار کی جاتی ہے اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والے قرآن مجید نے تقویٰ اور پرہیز گاری کو عزت وشرف کا معیار قرار دیا۔ اور ان کی بنیاد پر برتری کے اظہار کا راستہ بند کر دیا۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (10)

اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شاخوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم آپس میں پہچان رکھو' بے شک اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

گویا باعثِ فخر زبان' علاقہ' رنگ' نسل اور عہدہ ومنصب نہیں بلکہ تقویٰ اور پرہیز گاری ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے کہ ان تمام تعصبات کا قلع قمع صرف اسلامی اخوت اور دو قومی نظریہ کے فروغ سے ممکن ہے عزت وشرف کے معیار تقویٰ کے حصول کا درس عام کیا جائے۔ تقویٰ کے صحیح مفہوم سے آگاہی بخشی جائے۔ ''تحریک اخوت اسلامی'' کی داغ بیل ڈالی جائے' تو ان شاء اللہ تعصبات کے بت خود بخود اوندھے گر پڑیں گے۔

انسان دوستی اور باہمی رواداری کے فروغ کے لئے ہمارے مشائخ اور علماء کرام نے جو کردار ادا کیا ہے وہ یقیناً سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ ان کے مواعظ حسنہ انسان دوستی اور باہمی رواداری کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کے آستانے اسی رواداری کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

زمانہ ماضی کی دینی درسگاہوں کو دیکھا جائے تو شاہ و گدا دونوں کی اولاد ایک صف میں استاذ کے سامنے زانوائے تلمذ تہہ کئے ہوئے نظر آتے ہیں اور جب کسی بزرگ کے آستانے میں تقسیم لنگر کی تصویر کشی ہوتی ہے تو اسی چٹائی پر جاگیردار اور سرمایہ دار بھی نظر آتا ہے اور اسی چٹائی پر ایک گداگر اور مفلوک الحال شخص بھی بیٹھا ہوا ہے حتیٰ کہ ان حضرات کے ہاں سب کے لئے ایک قسم کا کھانا اور ایک ہی انداز کے برتن اس بات کا درس دیتے تھے کہ عملی زندگی میں بھی اصحاب ثروت اور مفلوک الحال کے درمیان انسان دوستی اور رواداری کا رشتہ قائم ہونا ضروری ہے۔

رواداری عدم تعصب کا دوسرا نام ہے تعصب کے نتیجے میں ظلم و تعدی اور تکبر و غرور کا بازار گرم ہوتا ہے جب کہ رواداری تواضع اور ایثار کی راہ ہموار کرتی ہے۔

امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا قاصد امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا اور ان سے فرمایا: عنقریب آپ سخت مشکل میں پڑیں گے اور پھر صحیح سالم نکل جائیں گے۔

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس خوشی میں کہ ان کے استاد کا پیغام آیا ہے، اپنی قمیض اتار کر قاصد کو دے دی۔ جب قاصد قمیض لے کر واپس آیا تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کیا یہ قمیض ان کے جسم پر کسی دوسرے کپڑے کے حائل ہوئے بغیر تھی؟ اس نے کہا جی ہاں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے چوما اور آنکھوں سے لگایا پھر ایک برتن میں اس پر پانی ڈالا اور اس کو اچھی طرح بھگو کر اس کا پانی نچوڑا اور وہ پانی شیشی میں ڈال دیا جب ان کے شاگردوں میں کوئی بیمار ہوتا تو اس میں سے کچھ پانی بھیجتے وہ اسے اپنے جسم پر ملتا تو بیماری سے عافیت حاصل ہو جاتی۔ (11)

رواداری کی کتنی عمدہ مثال ہے کہ استاد اپنے شاگرد کی قمیض کو چومتا ہے اور اس کے دھوون کو آبِ شفاء قرار دیتا ہے۔

اکابر علماء و مشائخ کا یہ طریقہ معروف ہے کہ اگر کسی علاقہ میں کوئی جید عالم دین موجود ہوتا اور لوگ دوسرے کے پاس جاتے تو وہ بزرگ اپنے پاس آنے والے سائلین کو اس کی طرف متوجہ کرتا اور یوں تعصب کے خاتمہ کی راہ ہموار ہوتی اگر کوئی شخص کسی صوفی کے پاس بیعت ہونے اور استفادہ کی غرض سے گیا تو اس کو یوں جواب ملا کہ تمہارے علاقہ میں مجھ سے بڑا مرشد و راہنما موجود ہے اس سے استفادہ کرو۔

ان اکابر کے اس رویہ کی وجہ سے نفرتیں ختم ہو گئیں اور باہمی محبت کا دور دورہ ہوا۔

درحقیقت جب تک ایثار نہ ہو رواداری کا وجود ممکن نہیں اور وصف ایثار کے حصول کے لئے اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا اور تعلیمات اسلام کی تابع کرنا ضروری ہے۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اخوت و محبت کے حقوق کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

☆ سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم اسے اپنے غلام یا خادم کی طرح سمجھو اور اپنے زائد مال سے اس کی ضروریات کو پورا کرو۔ جب اسے کوئی حاجت ہو اور تمہارے پاس ضرورت سے زائد مال ہو تو تم اسے خود دو اور اسے سوال کرنے پر مجبور نہ کرو۔

☆ دوسرا درجہ یہ ہے کہ تم اسے (مسلمان بھائی کو) اپنی طرح سمجھو اور اسے اپنے مال میں شریک کرنے اور اسے اپنی طرح سمجھنے پر راضی رہو حتیٰ کہ تم اسے نصف مال دینا گوارہ کر لو۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اسلاف میں کوئی ایک اپنی چادر اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان تقسیم

کرنے کے لئے پھاڑ دیتا تھا۔

☆ تیسرا درجہ جو سب سے بلند ہے وہ یہ کہ تم اسے اپنے اوپر ترجیح دو اور اس کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم کرو۔ یہ صدیقین کا مرتبہ ہے اور باہم محبت کرنے والوں کے درجات کی انتہاء ہے۔ اس رتبہ کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو بھی قربان کرنے کو تیار ہو جائے جیسا کہ مروی ہے کہ صوفیاء کی ایک جماعت کو کسی خلیفہ کے ہاں پیش کیا گیا تو اس نے ان کی گردنیں مارنے کا حکم دیا ان میں حضرت ابوالحسین نوری رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے وہ جلدی جلدی جلاد کے سامنے ہو گئے تا کہ ان کو سب سے پہلے قتل کیا جائے۔ اس سلسلے میں ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ اس وقت دوسرے بھائیوں کو نجات دوں''۔ ان کا یہ قول تمام کی نجات کا باعث بنا۔ (12)

رواداری کی اس اہم مثال سے ہمیں جہاں اس بات کا سبق ملتا ہے کہ ہمارے اکابر علماء اور مشائخ اپنے ارشادات اور وعظ کے ذریعہ ہی نہیں عملاً بھی اس بات کا درس دیتے تھے وہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ رواداری باعث نجات اور تعصب باعث ہلاکت ہے۔

آج کے دور میں تعصبات کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ ایک پیر طریقت کے مرید، دوسرے شیخ طریقت کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ ایک استاد کے شاگردوں کے نزدیک دوسرے استاد کی عزت پر حملہ کرنا عین ثواب قرار پاتا ہے۔ ایک درسگاہ سے متعلق لوگ دوسری درسگاہ کی خامیاں شمار کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ ایک تنظیم کے لوگ دوسری تنظیم کے لوگوں کو اپنا ازلی دشمن سمجھنے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اکابر تک کی پگڑیاں اچھالنا محبوب مشغلہ قرار پاتا ہے حالانکہ ان لوگوں کے درمیان فکری بعد بھی نہیں محض خواہش پرستی اور بے بنیاد تعصب کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔

اس بیماری کا واحد علاج یہ ہے کہ تعلیمات نبوی کی روشنی میں ''اسلامی اخوت'' اور ''فکرِ اولیاء'' کی تبلیغ واشاعت کو عام کیا جائے اور مبلغین اس کا عملہ نمونہ پیش کریں۔ ان شاء اللہ تعالی اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوگا۔

مصادر و مراجع

(1) امام ابن ماجہ سنن ابن ماجہ ابواب الفتن ص:283 مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

(2) البقرہ:199

(3) امام ابوداؤد سنن ابی داؤد باب التفاخر بالاحساب

(4) مشکوۃ المصابیح ص418 باب المفاخرت والعصبیۃ

(5) امام محمد بن اسماعیل بخاری صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوہ زید بن حارثہ جلد2 ص61

(6) امام محمد بن اسماعیل بخاری صحیح بخاری جلد دوم باب فتح مکہ ص641

(7) مشکوۃ المصابیح باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ص422

(8) مشکوۃ شریف کتاب الایمان ص12

(9) مشکوۃ شریف کتاب الاداب باب السلام ص397

(10) الحجرات:13

(11) تنبیہ المغترین ص123، اردو

(12) امام الغزالی احیاء علوم الدین، اردو مطبوعہ پروگریسو بکس جلد2 ص401,399

علاقائی، نسلی، طبقاتی اور لسانی تعصّبات

نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی
صدر مرکز تحقیق فیصل آباد

علاقائی، نسلی، طبقاتی اور لسانی تعصّبات

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

انسانی وجود کا وہ جوہر جو اس کی پہچان ہے اور اُس کے وجود کا اقتضاء بھی اس کی معاشرتی حس ہے۔ انسان کا انسان پن کسی معاشرے یا سماج ہی میں نمو پاتا ہے یہ اس قدر بنیادی حقیقت ہے کہ اس کے بغیر انسان انسانی صفات سے بہرہ مند نہیں ہوتا۔ ارسطو نے کہا تھا کہ جو انسان معاشرے میں رہنے کے قابل نہیں وہ یا تو حیوان ہے یا دیوتا۔ ارسطو کی مراد یہ ہے کہ وہ یا تو انسان کے مرتبہ سے گر کر حیوان ہو گیا ہے یا کوئی ماورائی وجود ہے، یہ ماورائیت کا تصور اُس دور میں عام تھا اور دیوتا اس تصور کے مظہر تھے علماء لغت کا کہنا ہے کہ انسان کا کلمہ یا تو اُنس سے ہے یا نسیان سے دراصل اُنس انسانی وجود کا اساسی حوالہ ہے جس کیلئے معاشرتی ترکیب ناگزیر ہے نسیان بھی شدت اُنس کا ایک مظہر ہے اس لئے یہ بھی سماجی تصور کا حامل ہے مانوسیت کا یہ جذبہ انسانی تخلیق میں ازل سے ہی ودیعت ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً"(1)

ترجمہ: ''اے انسانو، اپنے اُس پروردگار سے ڈرتے رہو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا اور اُس سے ہی اُس کا جوڑا پیدا فرمایا اور اُن دونوں سے کثیر تعداد میں مرد اور عورتوں کو پھیلا دیا۔''

مزید ارشاد ہوا:

''هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْکُنَ اِلَیْهَا ''(2)

ترجمہ: ''وہ ذاتِ خالق جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا فرمایا اور اُس سے اُس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اُس کی جانب سے سکون پائے۔''

اسی حقیقت کا بیان سورۃ الزمر میں بھی ہوا:

''خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا ''(3)

ترجمہ: ''اُسی خالق نے تمہیں ایک نفس سے پیدا فرمایا پھر اُس نے اُس سے اُس کا جوڑا بنایا''

ایک اور تفصیلی ارشاد:

''وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ط قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ''(4)

ترجمہ: ''وہی خالق ہے جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا فرمایا پھر ایک ٹھہرنے کا مقام اور ایک امانت رکھنے کا مقام بنایا بے شک ہم نے آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا اُس قوم کیلئے جو سمجھ رکھنے والی ہے''

ان ارشادت سے واضح ہوا کہ نسلِ انسانی کا سلسلہ ایک نفس سے جاری ہوا خالق، جو واحد دیکتا ہے اُس نے ایک نفس کی تخلیق کی جس سے نسل در نسل انسانی قافلہ رواں دواں ہوا، زوج یعنی جوڑا ایک سے ہی پیدا کیا گیا پھر مرد و عورت کا ایک وسیع سلسلہ پھیلتا گیا۔ ان

آیات سے چند اساسی نقاط واضح ہو گئے مثلاً

- خالق واحد و یکتا ہے اور سب اُس واحد کی تخلیق ہے۔
- نسل انسانی کا سارا سلسلہ ایک وجود سے جاری ہوا۔
- زوج کی تخلیق کا مقصد تسکین و طمانیت ہے۔
- یہ سلسلہ تخلیق اصحابِ فکر و دانش کیلئے دعوتِ فکر ہے۔
- اور یہ کہ اس دعوت کے تمام پہلو واضح ہیں کہیں بھی الجھاؤ نہیں۔

اس حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطبہ حج میں مزید تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا:

"اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اٰبَاکُمْ وَاحِدٌ کُلُّکُمْ لِاٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ" (5)

ترجمہ: اے لوگو بلاشبہ تمہارا رب ایک ہے اور بلاشبہ تمہارا باپ ایک ہے تم سب آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہو اور آدم (علیہ السلام) مٹی سے بنائے گئے۔

قرآنی ارشادت اور فرامین نبوی کا تقاضا یہ ہے کہ

- وحدتِ انسانی نسل پر یقین رکھا جائے۔
- اور اس یقین کو روبہ عمل لا کر وحدتِ انسانیت کی فضا قائم کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے تخریبی عوامل ہیں جو وحدتِ نسل انسانی کے تصور کو داغدار کرتے ہیں اور خالق کے برملا اعلان کے باوجود باہمی آویزش بار بار کیوں سر اُٹھاتی ہے؟ چند ایسے عوامل کی نشاندہی کی جارہی ہے جو اس تصور وحدت پر شب خون مارتے ہیں مثلاً:۔

نسلی تعصبات

یہ وہ منفی رجحانات ہیں جو ہر دور میں تقسیم در تقسیم کے ذمہ دار رہتے ہیں خاندان کی برتر حیثیت، نسبتوں کا غرور اور آباء واجداد پر بے جا فخر یہ سب اس مہلک میلان ورجحان کے مختلف حوالے ہیں حیرت ہے کہ اس خود پسندی کا اظہار اُس وقت بھی ہوا جبکہ تخلیق آدم کی ابتداء ہو رہی تھی قرآن مجید نے اس کا واضح ذکر کیا۔ تخلیق کا اوّلین مرحلہ تھا کہ فرشتوں کو ایک وجود جو عناصر سے ترکیب پا رہا تھا پر اپنے تحفظات کے اظہار کا موقع ملا:

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط" (6)

''میں زمین میں ایک نائب بنانے لگا ہوں'' کی خبر پر فرشتے عرض کرتے ہیں''

"قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ" (7)

''آپ زمین میں ایسے کو بنانے لگے ہیں جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا''

فرشتوں نے صرف اسی تحفظ کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ یہ بھی عرض کیا:

"وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ط" (8)

'اور ہم ہیں کہ تیری حمد کی تسبیح کرتے ہیں اور تیرے لئے پاکیزگی کا بھی بیان کرتے ہیں'

فرشتے یہ سمجھ کر کہ تخلیق کا مقصد ایسی مخلوق ہی ہے جو خالق کی حمد وتقدیس بیان کرے اور وہ خود یہ فرض بخوبی نبھا رہے ہیں اس لئے نائب بنانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ یہ تو فساد کرنے والا اور خون ریزی کرنے والا ہوگا تو وہ یہ منصب کیسے نبھائے گا۔ یہ تحفظ ایک استخراج کی بنیاد پر تھا جو بدایۂ ارتکابِ عمل سے پہلے ہوا تھا اس پیش قدمی حملہ کے باوجود خالق نے ناراضی کا اظہار نہ فرمایا صرف یہ فرمایا:

"قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" (9)

''میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''

واضح کردیا گیا کہ تخلیقِ خلیفہ کے مقاصد اور مدعا کو تم نہیں جانتے ہو اس لئے سوال اُٹھا رہے ہو۔ حیرت ہے اس قدر بڑا حملہ ہوا مگر نہ عتاب ہوا نہ سرزنش بلکہ صرف عدمِ علم کا ذکر کر کے خاموش کرا دیا گیا مگر جب یہ مرحلہ آیا کہ اعتراف عظمت کا اعلان کیا جائے تو شیطان معترض ہوا حکم ملا کہ سجدہ کرو تو فرشتوں نے سجدہ کر دیا وہ معترض ضرور ہوئے تھے، نافرمان نہ تھے ہاں شیطان سجدہ گزاروں میں نہ تھا حکم عدولی کی وضاحت طلب کی گئی۔ ارشاد ہوا:

"قَالَ مَنَعَکَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُکَ ؕ قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ ۚ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ"(10)

ترجمہ: "کہا خالق کائنات نے تجھے کس نے روکا ہے کہ تو سجدہ نہ کرے جبکہ میں نے تجھے حکم دیا کہنے لگا میں اس سے برتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔"

ابلیس کا سجدہ سے انکار اس لیے تھا کہ وہ اپنی برتری کا زعم رکھتا تھا یہ تو حقیقت تھی کہ وہ آگ سے پیدا کیا گیا تھا اور آدم (علیہ السلام) مٹی سے۔ آگ اس کی تخلیقی بنیاد تھی اور مٹی آدم (علیہ السلام) کی واقعہ تو یقینی طور پر یہی تھا اور اسی کو اس نے انکار کی اساس بنایا مگر وہ بھول گیا کہ تخلیق کا عمل تو خالق کا ہے، وہ کہاں سے اور کس عنصر سے تخلیق کرے یہ تو اس کی رضا ہے یہ حملہ خالق کی تخلیق پر تھا اس لیے شدت سے رد کر دیا گیا اور ابلیس اسی بنا پر راندۂ درگاہ ٹھہرا۔

معلوم ہوا نسلی برتری کا وہ عفریت جو آج کل ہر ملک، شہر، بستی اور کوچہ و بازار میں برہنہ ناچ رہا ہے اُسی شیطانی روش کا آئینہ دار ہے کہ شیطان نے روزِ اوّل ہی اس نسلی تفاوت اور گروہ بندی کی بنیاد رکھ دی تھی اس نسلی خمار نے شیطان کی پیروی میں کس کس کو ورغلایا اور کس قدر عدمِ مساوات کا اضطراب پیدا کیا عصرِ حاضر کا انسان اس کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے امتیازات کا یہ فتنہ شیطانی فتنہ ہے خالق جن و بشر نے اس کو ابتداء ہی میں رد کیا بلکہ اس کے پرچار پر سزا بھی دی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسلامی معاشرت کے

قیام کے ساتھ ہی ایسی فتنہ پرور روش پر شدید ضرب لگائی اور انسانی غرور کو اس انسان دشمن رویے سے سختی سے روکا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برملا فرمایا:

"مَنْ قُتِلَ تَحتَ رَايَةٍ عُمِّيَّةٍ يَدْ عُوْ عَصَبِيَّةً اَوْيَنْصُرُ عَصَبِيَّةً فَقِتْلَةٌ جَا هِلِيَّةٌ" (11)

ترجمہ: "جو اندھی عصبیت کے پرچم کے تحت قتل ہوا وہ عصبیت قومی کی بنیاد پر دعوت دیتا تھا یا اسی عصبیت کی خاطر مدد کرتا ہے تو اس کا قتل جاہلیت کے طریق پر ہے"

رنگ وروپ کا افتخار

انسانی معاشروں میں برتری کا خبط رنگ وروپ کے امتیازات سے بھی جنم لیتا ہے گورے کالے کی آویزش بلکہ تصادم کے کئی گھاؤ تاریخ انسانی میں اس قدر گہرے ہیں کہ عقل وشعور کا تریاق بھی ان کو مندمل نہیں کر سکا، حبشی غلاموں کی حالت زار، ریڈ انڈین کا اندوہناک اضطراب، آریاؤں کے ہاتھوں کول، دراوڑ کا اِستیصال، معلوم تاریخ کا وہ سیاہ باب ہے کہ روشن خیالی اور وسیع النظری کا کوئی دعویٰ بھی اس کا سدباب نہیں کر سکا، یہ تو دین اسلام کا پیغام سلامتی ہے اور یہ رحمتِ عالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشفقانہ اور مربیانہ کردار ہے جس نے ایک مقتدر حاکم اور خلیفہ وقت کو جو ہر دورِ حکمرانی کیلئے راہبر وراہنما قرار پایا ہے ایک حبشی غلام کو سیدنا بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کہہ کر خطاب کرنے کا ذوق عطا فرمایا اور احمر واسود کو ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے کا حوصلہ اور سلیقہ عطا کیا، شاہِ حبش نجاشی کی وفات پر فاصلوں کی خلیج کے باوجود اصحابہ اکرام جن میں قریش کے وہ افراد بھی تھے جو نور نبوت سے مستنیر ہونے سے قبل انصارِ مدینہ کو بھی ہمسر نہ گردانتے تھے کو صف در صف کھڑے کر کے نجاشی کی نیک روش کو نبوی استحسان کا مستحق بھی ٹھہرایا اور رنگ وروپ کی خلیج کو بھی اپنے اسوہ سے پاٹ ڈالا، اس طرح خاندانی تفاخر اور رنگ وروپ کے امتیازات کا خاتمہ کر دیا۔

علاقائی اور طبقاتی تعصبات

اللہ تعالیٰ نے ہبوط آدم (علیہ السلام) کے انقلابی لمحہ پر ہی یہ اعلان فرما دیا تھا کہ زمین ساری نسل آدم کیلئے مستقر بھی ہوگی اور اس زمین کے اندر پوشیدہ نعمتیں قیامت تک کیلئے متاع یعنی سامان زیست بھی ہوں گی لابدی تھا کہ نسل انسانی کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ زمین کے مختلف گوشے آباد ہوتے جائیں، مہیا کردہ وسعت کا تقاضا تھا کہ انسان کسی گھٹن کا شکار نہ ہو اور نہ ہی وہ کسی دوسرے کے راستے مسدود کرے یہ ایک سہولت تھی مگر پست خیالی نے اس سہولت کو وجہ تفاخر بنالیا اور علاقائی حوالوں سے نسل انسانی تقسیم ہونے لگی یہ عرب ہے اور وہ غیر عرب، یہ امریکی ہے اور وہ افغانی، یہ ہندی ہے اور وہ جاپانی، حد بندی کی یہ تنگ نائے انسان کو تقسیم کرتی رہی جس سے خود غرضی اور نفرت جنم لینے لگی اور بالآخر یہ باہمی مغایرت نسلی افتراق اور علاقائی تقسیم کا سبب بنی، تاریخ کے سینے میں قتل و غارت گری کی ان گنت اندوہناک داستانیں اسی کج فہمی کا شاخسانہ ہیں، مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی اور انسانی فلاح کا ہمہ جہت پیغام لانے والی اوّلین ریاست کے خدوخال پر ایک طائرانہ نظر ہی یہ حقیقت عیاں کردے گی کہ ایک مثالی انسانی معاشرہ کیسے تشکیل پاتا ہے، قرشی سردار جو طبقاتی سرافرازیوں کے اس قدر گرویدہ تھے کہ کسی کو ہمسر ہی نہ گردانتے تھے کہ ہر غیر موالی تو ہو سکتا تھا عربی نہیں ان کے برابر ہاں بالکل برابر، رومی، فارسی اور حبشی یوں موجود تھے کہ وحدت نسل انسانی کی ایک کہکشاں سجی ہوئی معلوم ہوتی ہے یہ انقلاب اس لیے بالفعل برپا ہوا کہ رحمت عالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ اس کی ترغیب دے رہا تھا اور پھر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کے سامنے موجود کو ہی نہیں اس مستقبل کیلئے بھی پوری وضاحت بلکہ بے لاگ وضاحت سے یہ فرما رہے تھے:

"كُلُّكُمْ لِآدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ لَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى

عَجَمِيٍّ فَضْلٌ اِلَّا بِالتَّقْوٰی" (12)

ترجمہ: ''تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے تھے بے شک تم میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز تر وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی ہے کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقوی کی وجہ سے۔''
معلوم ہوا اسلام نے عربی اور عجمی کی برتری کے ہر علاقائی اور طبقاتی تفاوت کو ختم کر دیا، تقوی وجہِ شرف ہے اور تقوی شعار عرب کا رہنے والا بھی ہو سکتا ہے اور عجم کا رہنے والا بھی، اللہ اللہ کس قوت اور شدت سے علاقائی وطبقاتی تعصبات کو پامال کر ڈالا، تاریخ اسلام اس واضح فرمان کے اثرات اور ثمرات سے بھری پڑی ہے۔

لسانی تعصّبات:

زبان جو اظہار کا ایک ذریعہ تھی کہ اسی سے ترابط کا سلسلہ مستحکم ہوتا ہے بد قسمتی سے انسانی انحطاط کے ساتھ وجہ افتخار وافتراق بن گئی، نسل انسانی پھیلی تو حالات، حوائج اور جو گردہ میں قدرتی مظاہر کی تعبیر نے مختلف گروہوں میں لسانی تفاوت پیدا کر دیا، یہ تفاوت اظہار کے تقاضوں کی بنا پر تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہی تفاوت ذریعہ فخر بن گیا حتی کہ اس کی بنا پر تصادم کی کئی راہیں تلاش کر لی گئیں اسلامی تعلیمات کا اوّل ماخذ عربی زبان میں بیان ہونے والے نوشتے تھے اس لیے اس کی تعلیم وتدریس صحیفۂ ہدایت تک رسائی کیلئے لازم ٹھہری تھی اسی بنا پر متداول زبانوں میں عربی ہی مسلم امت اور علماء کی توجہ کا مرکز رہی مگر تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اس امتیازی حیثیت کے باوجود کوئی دوسری زبان نفرت کا ہدف نہ بنی، فارسی زبان جو اس دور اوّل ہی میں مقابل کھڑی تھی معاند زبان قرار نہ پائی بلکہ اشاعت دین کیلئے مؤثر ذریعہ سمجھی گئی زبان نشرِ خیر کا ذریعہ رہے تو محترم ہے اور انسان کوئی بھی زبان بولتا ہے قابل احترام ہے بشرطیکہ اس میں تقوی کی نمو ہو رہی ہو بد قسمتی سے اس ذریعہ اظہار کو معیار شرف بنا لیا گیا اور اس کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم ہوئی اور محبت ونفرت

کے جذبات پروان چڑھے، لسانی برتری کا عفریت عدم برداشت کا محرک بنا، ملک اس بنیاد پر تقسیم ہوئے، قومیں اس اساس پر تربیت پانے لگیں اسلام زبان کو صرف ذریعہ اظہار و ربط سمجھتا ہے اس لیے سب زبانوں میں اپنی تعلیمات کو فروغ دینے کی ترغیب دیتا ہے قرآن وحدیث کے مختلف زبانوں میں تراجم، ترجمانی کا تنوع اور اسلامی فکر کی وضاحتوں میں السنہ کثیرہ کا استعمال، اسلامی رویے کو واضح کرتا ہے اور اسلام کے میلان کے اس روشن پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔

ان عوامل کے علاوہ امارت و مفلسی، وسائل کی کثرت اور کمیابی، انسانی فکر کی رسائی و نارسائی مرکز عقیدت و محبت میں تفاوت اور دیوتاؤں کی کثرت نے بھی انسانوں کو تقسیم کیا ہے تفاوت و افتراق کے یہ بُت ہر دور میں نئے سے نئے روپ میں تراشے گئے اور تراشے جا رہے ہیں جمعیت اقوام ان تصورات کی یک رخی کا ہمیشہ سے شکار رہی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ امتیازات کے سارے رخ ہر دور میں موجود رہے ہیں اسلام ان کی موجودگی سے انکار نہیں کرتا یہ تسلیم ہے کہ مثلاً نسل کے امتیازات بالکلیہ مٹانا انسانی سماج میں ممکن نہیں تخلیق کا یہ عمل نسل در نسل ہی جاری رہے گا مگر اس کو وجہ شرف نہیں بننا چاہیے کہ اس طرح فاصلے بڑھیں گے اور معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو جائے گا، رنگ و روپ کا فرق بھی مٹایا نہ جا سکے گا، علاقائی و طبقاتی تنگ نائے بھی ہزار نقل مکانی و ہزار حسی روابط کے باوجود اثر دکھاتی رہے گی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ عوامل کبھی بھی وحدت نسل انسانی کی تعبیر نہیں بن سکتے۔ اسلام جو وحدت نسل انسانی کا داعی ہے ان عوامل کو وقتی شناخت یا انتظامی مصلحت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا بلکہ اسلام اُس فکر کا مبلغ ہے جو پوری نسل انسانی کو وحدت کے حصار میں رکھے اور برابر مواقع فراہم کرے، اسلام کا یہ رویہ فکری انقلاب کا پیغام بھی ہے اور مساوی مواقع کی فراہمی کا ذریعہ بھی، اسلام کے سلک وحدت میں عرب آئے یا عجم، گورا آئے یا

کالا، فصیح اللسان یا ژولیدہ بیان، کسی ملک کا شہری آئے یا کسی خطے کا باسی، سب کو قبول کیا جاتا ہے۔ایک معبود کا حوالہ عبدیت کی اکائی کا ذریعہ ہے۔

تخریب وافتراق کے ان عوامل کی نفی کر کے اسلامی تعلیمات نے وحدت نسل انسانی کا راستہ آسان کر دیا، اب ضرورت تھی کہ ''وحدت'' کے حصول کی منزل تک جانے کیلئے محفوظ طریق کار واضح کیا جائے، یہ محفوظ طریق کار ابتداء ہم خیالوں اور مقصدیت کے اساسی شناوروں سے ہی شروع کیا جا سکتا ہے اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی خشت اوّل سے تعمیر انسانیت کے مشن کا آغاز کیا۔جس جس نے اس وحدت کے سفر پر ساتھ چلنے کا عہد کیا پہلے اس کی ذہنی ساخت کو بدلا، ہم خیال جب توحید آشنائی کے خوگر ہو جائیں تو دشوار گزار مراحل کو عبور کرنا آسان ہوگا اسی لئے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کے ذریعے وحدت نسل انسانی کی ابتداء وحدت اہل ایمان و توحید سے ہی ہوئی کہ وحدت سے شناسا ہی وحدت کا درس دے سکتا ہے۔وحدتِ مسلم کیلئے قرآن مجید اور ارشادت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں یہ مرحلہ کیسے طے ہوا۔آئیے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں۔ارشاد ربانی بڑا واضح ہے۔

''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ '' (13)

ترجمہ: ''اے انسانو، بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف گروہ اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو بے شک تم میں سے معزز تر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں زیادہ تقویٰ شعار ہے بے شک اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا خبر رکھنے والا ہے''

گروہ و قبیلے صرف شناخت کیلئے ہیں تا کہ ہر طرف پھیلی ہوئی انسانی نسلوں کا تعارف ہو سکے

یہ تقسیم وجہ شرف نہیں کہ وجہ شرف صرف تقویٰ ہے اور یہ تقویٰ ذریعہ نمائش نہیں کہ اس کا اعلان کیا جائے کہ جس کیلئے یہ تقویٰ ہے وہ علیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ واضح طور پر تقویٰ شعاری کی نمائش کو رد کر دیا گیا کہ تقویٰ لوگوں پر برتری جتانے کا ذریعہ نہیں آداب بندگی کا تقاضا ہے۔

اہل ایمان کو باہمی پیوستگی کیلئے بار بار ترغیب دی گئی۔ کبھی یہ ارشاد ہوا کہ

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اسے بے سہارا چھوڑتا ہے اور نہ اسکی تحقیر کرتا ہے (14) تو کبھی وحدت امت کیلئے حسی مثال دیتے ہوئے واضح کیا گیا:

''مومن دوسرے مومن کیلئے یوں ہے جیسے ایک مضبوط دیوار کہ ہر پتھر ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں ڈال کر مضبوط جال بنایا'' (15)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما کی روایت میں قرب وحدت کے عملی مظاہر کا بھی ذکر ہوا۔

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ نہ تو اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے سہارا چھوڑتا ہے اور جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت میں (مددگار یا ساتھی) ہوگا اللہ تعالیٰ اس کی حاجت میں اس کا (مددگار) ہوگا اور جس نے کسی مسلمان کی کوئی مصیبت دور کر دی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے مصائب میں سے مصیبت دور کر دے گا اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔'' (16)

اس ارشاد میں اخوت کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اخوت کیلئے ضروری تقاضوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی حاجت مندی میں حاجت روائی مصیبتوں میں مصیبت سے رہائی اور خطاؤں کی پردہ

پوشی، یہ انسانی زندگی کے عمومی مصائب ہیں ان میں معاونت معاشرتی ضرورت بھی ہے اور نجات وکامرانی کی نوید بھی۔ باہمی تعلقات میں ہمدردی وغم خواری، راہِ حیات کو آسان کر دیتی ہے اس لئے فرمایا گیا۔

''تو مومنوں کو آپس میں رحم کرنے میں' آپس کے پیار میں اور آپس کی عنایات میں ایک جسم کی طرح پائے گا کہ اگر ایک عضو کو شکایت لاحق ہو تو اس کا سارا جسم بیدار رہ کر مبتلائے درد ہو کر اس کیلئے دعائیں کرتا ہے'' (17)

جسم کے کسی عضو کا درد سارے جسم کو مضطرب کرتا ہے' یہ نہیں ہوتا کہ ایک انگلی کو چوٹ لگے تو باقی جسم اپنی راحتوں میں مگن رہے یہی حالت ملت کی ہے درد کہیں اٹھے پوری ملت چیخ اٹھتی ہے اس مشترک درد کی نفی تب ہوتی ہے جب بے تعلقی، بے رغبتی، باہمی حسد، ایک دوسرے پر غضب ظاہر ہوتا ہے اور یہ ذاتی مفادات کا گرداب پوری ملت کو زہرناک بناتا ہے اس لئے حکماً ارشاد ہوا۔

''لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَاللّٰهِ اِخْوَانًا'' (18)

ترجمہ: '' آپس میں ناراضیاں نہ کرو، آپس میں حسد نہ کرو، ایک دوسرے کے پیچھے سازش نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے بندے ہو کر بھائی بھائی بن جاؤ۔''

بغض، حسد اور پس پشت سازش، وہ اخلاقی ناسور ہیں جو وحدت انسانیت میں دراڑیں ڈالتے ہیں۔ یہ وہ نفسیاتی الجھاؤ ہیں جو نفرت کو فروغ دیتے ہیں اور شخصیتوں کو مجروح کرتے ہیں دنیا کے نقشہ پر ایک ناقدانہ نظر واضح کر دے گی کہ فساد کے جراثیم، افتراق کے فتنے اور باہمی جدال کی تحریکیں کیسے جنم لیتی ہیں خصوصاً مسلم معاشرے کا شیرازہ کیسے بکھرا ہے اور یہ کہ اس منتشر شیرازے کی پیوستگی کیسے ممکن ہے؟ اتحاد کا تصور جب تک اخوت کے

جذبوں سے سرشار نہ ہوگا کسی فلاح کی صورت گری نہ ہوگی۔ قرآن مجید نے حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا اور ہر قسم کے تفرقہ سے بچنے کا ارشاد فرمایا ہے، عرب جاہلی معاشرہ میں باہمی عداوت کو آگ شعار معاشرہ کہا ہے اور امت مسلم میں ڈھل جانے کو اپنی نعمت قرار دیا ہے۔ (19)

اتحاد کے اس درس کے بعد ایک ایسی اُمت کی صورت گری کا حکم دیا گیا جو مبلغِ خیر اور داعیِ حسنات ہو اور یہ کہ وہ اُمت پر بدی اور بُرائی سے روکنے والی ہو کہ کامیابی ایسی اُمت کے افراد کیلئے مقدر ہے۔ فرقہ بندی سے اجتناب کا محرک ایسی وابستگی ہے جو سرشتۂ اتحاد سے مکمل متصل ہو، یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ مقام وحدت تصوراتی اور خیالاتی نوعیت کا ہی نہیں بلکہ اس کو بڑی قوت سے بروے کار لایا جا سکتا ہے اور لایا جا چکا ہے۔ کس قدر ریزہ ریزہ تھا وہ انسانی لبادہ جو جاہلی انسان نے اوڑھ رکھا تھا، وہ انسان بکھرا ہی نہ تھا ٹوٹ گیا تھا وہ اس قدر بے توفیق ہو گیا تھا کہ دوزخ کے کنارے جا نکلا تھا۔ وہ کون سا پیغام تھا اور وہ کونسی تحریک تھی جس نے ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کو استواری بخشی تھی؟ وہ کون تھا جس نے نجات کی راہ دکھائی تھی؟ کیا تاریخ کا روشن صحیفہ نظر نواز نہیں؟ کیا حقائق ہویدا نہیں؟ کیا راستی کا یہ سفر گواہ نہیں کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو کس نے جوڑنے کا اہتمام کیا تھا؟ یہ تو وہ حقیقت ہے جس کا غیروں کو بھی اعتراف ہے۔

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا بنا دیا ۔۔۔ کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

جگن ناتھ آزاد کو بھی اعتراف ہے کہ

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا ۔۔۔ خاک کے ذروں کو ہم دوشِ ثریا کر دیا

تاریخ کا یہ درخشندہ لمحہ جب محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے نظر آنے لگے اور خون کے پیاسے ایک دوسرے کی بلائیں لینے لگے بغیر کسی محنت اور کاوش کے نصیب نہ ہوا تھا۔ یہ تو

کرم تھا نبی آفاق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کہ جنہوں نے شعورِ انسانیت کو اُجاگر کیا ورگرنہ صدیوں کی دوریاں کیسے سمٹ آئیں اس کیلئے تو زمین کی ساری دولت بھی قربان کردی جاتی تو بھی یہ لمحۂ اُلفت نصیب نہ ہوتا۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کا خود تذکرہ کیا۔ (20)

پیغام الفت ومحبت کے اثرات کا ذکر ہوا تو ان کاوشوں اور ریشہ دوانیوں کا رد بھی ہوا جو اس منزلِ اتحاد تک رسائی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں اور اب تک ہیں، ارشاد ہوا۔

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ" (21)

ترجمہ: "اور تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو ہٹ گئے اور انہوں نے اپنے پاس روشن نشانیاں آنے کے بعد اختلاف کیا اور وہی ہیں جن کیلئے بُرا عذاب ہے۔"

اسلام کا تصورِ وحدت، اطاعت شعاری اور فرمان برداری سے ترغیب پاتا ہے جو اپنے خالق کا نہیں بنتا اس کی مخلوق کا کیسے بنے گا؟ اہل کتاب کو جب دعوتِ عام دی گئی تو اس بنیادی شرط کا واضح تذکرہ ہوا ارشاد ہوا۔

"قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ" (22)

ترجمہ: "کہہ دیجئے! اے اہل کتاب اس کلمہ کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور نہ ہی اُس کے ساتھ

کسی چیز کو شریک بنائیں گے اور نہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا ایک دوسرے کو رب بنائیں گے پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو کہہ دیجئے کہ گواہی دیتے رہو کہ بلاشبہ ہم مسلمان ہیں۔"

واضح کر دیا گیا کہ اتحاد و اتفاق پوری نسلِ انسانی کا مقصود ہو یا ملتِ اسلامیہ کے افراد کے درمیان یہ یک جہتی مطلوب ہو اس کیلئے بنیادی اساس تو نظریاتی اتحاد ہے کہ دراصل یہی ہم خیالی نسلِ انسانی کے اتحاد کی کفالت کر سکتی ہے۔ یہ اساس ہے بین المذاہب مکالمے اور بین الممالک تعاون کی، مسلم ملت تو اس مشترک اساس کو اُسی روز تسلیم کر لیتی ہے جب وہ اسلام کو اپنا دین قرار دیتی ہے۔ کلمہ توحید کا اعلان دراصل یک رنگی کا اعتراف ہے۔ "اِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ" نسلِ آدم کیلئے قربت کا پیغام ہے کہ یہ زمینی اور مادی حوالہ ہے۔ "اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ" (23) آفاقیت و یکتائی کا مژدۂ جانفزا ہے، نظریات کی وحدت زمینی حوالے سے ہو یا آفاقی حوالے سے، رویوں کی مماثلت اور اہداف کی یکتائی کا اعلان ہوتا ہے ربّ واحد کو تسلیم کرنے والوں کو اتحاد کی اعلیٰ منزلت نصیب ہوتی ہے اور اس سربلندی کے اہل ثابت نہ ہونے والوں کو ایک جدامجد کا حوالہ زمینی وحدت عطا کرتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات ظاہرہ میں ہر دو قسم کے اتحاد کو پذیرائی بخش کر آنے والی نسلوں کیلئے راہ ہموار کر دی تھی، انصار مدینہ کے ساتھ مہاجرین کا تعلق اخوت کی بنیاد پر قائم ہوا یہ اپنوں کا اتحاد تھا اور یہود کے ساتھ میثاق غیروں کے ساتھ آبرومندانہ زندگی کی پہچان تھا، اس نے ثابت کر دیا کہ اپنے ہوں یا بیگانے اس سرزمین پر بسنے کے مستحسن انداز کیا ہو سکتے ہیں، مکہ والوں کے ساتھ صلح حدیبیہ اس عزم کی شہادت ہے کہ بظاہر اپنے خلاف بھی فیصلے کرنے پڑیں تو حکمت اور بقائے باہمی کا تقاضا ہے کہ کر لینے چاہئیں۔

قرآن مجید میں بقائے نسل انسانی کے ضوابط کو کسی ابہام اور اختصار کے بغیر بیان کیا تو خود نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادت بلکہ عملی اقدامات نے وحدت نسلِ

انسانی کے تصور کو روشن تر کر دیا۔

"یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا" (24)

"یعنی تم دونوں سہولت پیدا کرنا تنگیاں نہ کرنا بشارتیں دینا نفرت نہ کرنا" یہ پیغام محبت زمانہ امن کا نہیں بلکہ حالت جنگ کا ہے قتال کیلئے روانہ ہونے والے لشکروں کو دیا جا تا رہا ہے یہ شفقت بھرے جملے رحمت تمام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے تابدار حوالے ہیں یہی وہ پیغام رحمت تھا جس نے علاقائی، طبقاتی اور نسلی تعصّبات کی شکار قوم کو بنیانِ مرصوص بنا دیا اور پھر یہ ابدی پیغام ہر انسان کیلئے بحیثیت انسان زندہ رہنے کا مژدہ بنا، خطبہ حجۃ الوداع کے پر نور کلمات کا حرف حرف بقائے باہمی اور تحفظ نسل انسانی کا ایسا منشور ہے جو ہر دور میں نکہتیں بانٹتا رہے گا سچ ہے کہ۔

اُس رحمتِ عالم نے حساں کیا کیا نہ دیا انسانوں کو

دستور دیا منشور دیا کچھ راہیں دیں کچھ موڑ دیئے

"اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمٖ"

مصادرومراجع

1۔ النساء ۱

2۔ الاعراف ۱۸۹

3۔ الزمر ۶

4۔ الانعام ۹۸

5۔ مسنداحمد

6۔ البقرہ ۳۰

7۔ البقرہ ۳۰

8۔ البقرہ ۳۰

9۔ البقرہ ۳۰

10۔ الاعراف ۱۲،۱۱

11۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین۔

12۔ مسنداحمد

13۔ الحجرات ۱۳

14۔ صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم المسلم وخذلہ۔

15۔ صحیح البخاری ابواب المظالم والقصاص باب نصر المظلوم۔

16۔ صحیح البخاری ابواب المظالم والقصاص باب لایظلم المسلم المسلم ولایسلمہ۔

17۔ صحیح البخاری کتاب البر باب رحمۃ الناس والبھائم۔

18۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم التحاسد والتباغض والتدابر۔

19۔ سورۃ آل عمران ۱۰۳ کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

20۔ دیکھیے سورۃ الانفال ۶۳

21۔ آل عمران ۱۰۵

22۔ آل عمران ۶۴

23۔ مسند احمد

24۔ صحیح البخاری کتاب المغازی، باب بعث ابو موسی ومعاذ (رضی اللہ عنھما) الی الیمن۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

احترام آدمیت

مسلم معاشرے کے خدوخال، مسلم اور غیر مسلم شہریوں کے حقوق

مسلم ریاست کے غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات

مسلم معاشرے کے خدو خال

پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین آزاد القادری
سیکرٹری
بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن ملتان

مسلم معاشرے کے خدوخال

پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین آزادالقادری

انسانی زندگی کا آغاز توحید پرستی سے ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام نسل انسانی کے جدامجد اور خالق کائنات کے نائب بن کر دنیا میں آئے مگر ان کی اولاد اختلاف وانتشار اور شرک جیسی برائیوں میں مبتلا ہوگئی۔ خالق حقیقی کو معبود ماننے کی بجائے مخلوق خدا کو معبود بنا بیٹھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کو نبوت سے سرفراز فرما کر بھٹکی انسانیت کی رہنمائی کے لئے بھیجا۔ ہر نبی اور رسول نے انسانوں کو نیکی کی طرف بلایا اور برائی سے دور رہنے کی تلقین کی۔ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تک جتنی اقوام کا ذکر تاریخ انسانی میں ملتا ہے، ان سب کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ٥﴾ (فاطر:24)

ترجمہ: کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو۔

انبیاء کا یہ تسلسل اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کے طور پر تھا تاکہ کوئی قوم یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں تو راہ ہدایت دکھانے کے لئے کوئی نہیں آیا تھا۔ قرآن مجید نے اس کا ذکر بھی خاص طور پر کیا ہے:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًاo﴾(النساء:165)

ترجمہ: ان سب کی طرف خوش خبری دینے والے اور خوف سنانے والے پیغمبر مبعوث کیے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ پر ان پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے (اس لئے کہ) اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔

نبوت کے اس سلسلے کی تکمیل پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء پر ہوئی جو ایک کامل دین اور عظیم الشان صحیفۂ آسمانی کے ساتھ اس دنیا میں تشریف لائے۔ اس رسول معظم کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ انسان اپنے آغاز میں توحید کے اصولوں پر قائم تھا۔ شرک اس کی زندگی میں بہت عرصہ بعد داخل ہوا۔ اس حقیقت کا اظہار اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اس طرح فرمایا:

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ.﴾ (البقرۃ:213)

ترجمہ: ایک زمانے میں سب انسان ایک طریق پر تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو انہیں خوش خبری (دیتے) اور خوف دلاتے تھے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابیں بھی نازل فرمائیں تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اختلافی امور میں فیصلہ فرمادیں اور ان کتابوں میں اختلاف کسی نے نہ کیا مگر صرف ان لوگوں کے سوا جن کو ابتدا میں وہ کتاب ملی تھی۔ اس کے باوجود کہ ان کے پاس واضح دلائل آچکے تھے انہوں نے باہمی ضد کی وجہ سے اختلاف کیا۔

آیات متذکرہ بالا سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابتدائے آفرینش سے دنیا توحید

پر قائم تھی۔ جب کبھی وہ راہ راست سے بھٹکی تو اللہ ربّ العزت نے اپنے برگزیدہ انبیاء کو بھیج کر انہیں راہِ راست کی طرف بلایا۔ انسانی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں پایا جس میں راہ ہدایت دکھانے والا نہ آیا ہو۔ ہر قوم کی طرف پیغمبر برحق شریعت مطہرہ کے ساتھ آئے، اس قوم کو راہ حق بتائی، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے اور زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتایا۔ اس قوم کو تہذیب وتمدن اور فلسفۂ زندگی سے روشناس کیا۔ انفرادی واجتماعی زندگی کے اصول وضوابط بتائے۔ جس قوم نے ان اصول وضوابط پر عمل کیا وہ تاریخ انسانی میں زندہ رہیں اور اپنے دائرہ عمل میں رہنے والوں پر دیرپا اثرات چھوڑے۔ ان تمام نظریہ ہائے حیات میں اسلام ہی ایک ایسا نظریہ حیات ہے جس نے انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ اس کی روشن تعلیمات نے ایک ہی جست میں جملہ حسی خداؤں کی نفی کر کے معبودِ برحق سے روشناس کرایا۔ دوسرے مذاہب کے برعکس اسلامی نظریہ حیات کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دین ودنیا کی معتدل راہ کی طرف بلایا اور اس فلسفے کو یوں بیان فرمایا:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ (البقرۃ:201)

یعنی اسلام دین اور دنیا دونوں کی بھلائی کا طلب گار ہے۔ دین کی طلب اسے راہبانہ زندگی گزارنے پر مجبور نہیں کرتی اور نہ ہی دنیا کے امور اسے معبود برحق کی یاد سے غافل کرتے ہیں۔ وہ ہر حال میں راہ حق پر قائم رہتا ہے۔ دین اسلام کے برعکس دوسرے مذاہب کی تاریخ میں دین ودنیا ہمیں الگ الگ نظر آتے ہیں۔ اہل مذہب اپنے آپ کو فرشتہ صفت اور باقی عامۃ الناس کو مادیت پرست قرار دے کر حقیر سمجھتے تھے گویا مذہب وسیاست جدا جدا تھے۔ قرآن مجید میں ہمیں بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کا ذکر ملتا ہے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا زمانۂ نبوت نمرود جیسے ظالم وجابر حکمران کے اقتدار میں تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کا زمانہ بھی بادشاہوں اور وزیروں کا زمانہ تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بھی فرعون جیسا جابر بادشاہ تھا' جو اپنے آپ کو ربّ اعلیٰ سمجھتا تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی وفات

کے بعد ان کی قوم بنی اسرائیل کو ان کے دشمن شکست دینے کے بعد جلاوطن کر دیتے ہیں تو وہ اپنے پیغمبر سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم پر ایک بادشاہ مقرر کر دیں جس کی قیادت میں ہم اپنے دشمن سے اپنی شکست کا انتقام لے سکیں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾(البقرۃ:246)

ترجمہ: یاد کرو جب موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک بادشاہ کو مقرر کرتا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑ سکیں۔

سیدنا داؤد اور سیدنا سلیمان علیہما السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کی ذات اقدس میں نبوت و بادشاہت یکجا نظر آتی ہے۔ انبیاء معصوم ہوتے ہیں جبکہ بادشاہ سراپا خطا ہوتے ہیں۔ بادشاہت جب انبیاء کے دامن سے وابستہ ہوتی ہے تو وہ بھی خطا سے ماورا ہو جاتی ہے۔ معصومیت کا یہ اعزاز انبیاء کو ہی حاصل ہوتا ہے ان کے جانشینوں کو نہیں بشرطیکہ نبی کا جانشین منصب نبوت پر فائز ہو۔ جیسا کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کے وارث و جانشین سیدنا سلیمان علیہ السلام تھے۔

بعض قوموں کا یہ سیاسی نظریہ کہ بادشاہ غلطی سے ماورا ہوتا ہے، قطعی طور پر غلط ہے۔ اسلام نے جو نظریۂ حیات کائنات انسانی کو دیا ہے' اس کے مطابق حقیقی اقتدار کا مالک' خالق کائنات ہے اور اس کے احکامات وقوانین کا نفاذ اس کا نائب کرتا ہے' جسے وہ دنیا کا اقتدار عطا کرتا ہے اور وہ خلیفۂ برحق نبی ہوتا ہے' جسے یہ احکامات بذریعہ وحی براہِ راست عطا کئے جاتے ہیں۔ احکامات الٰہیہ کے نفاذ کے لئے ہر داعی انقلاب نے حکومت کے قیام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ اللہ کے برگزیدہ انبیاء دنیا کے اقتدار کو پسند نہیں کرتے تاہم شریعت الٰہیہ کے نفاذ کے لئے انہیں حکومت کی تشکیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر پیغمبر انقلاب' نبی رحمت علیہ التحیۃ والسکینۃ نے اپنے آبائی شہر مکۃ المکرمہ سے

ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں قیام فرمایا اور وہاں ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کے اندازِ حکمرانی سے انسانی بستی آج تک اکتساب فیض کر رہی ہے اور تا قیامت کرتی رہے گی۔ پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل ام القری مکۃ المکرمہ میں کسی باقاعدہ ریاست کا وجود نہ تھا اور نہ ہی یہاں کے باشندوں نے کبھی باقاعدہ ریاست کے تحت زندگی بسر کرنے کا تصور کیا تھا۔ پورے عرب میں قبائلی بدویانہ سرداری نظام رائج تھا۔ یہ اسلام ہی ہے' جس نے ایک باقاعدہ ریاست کے تحت افراد اور قبائل کو باہمی زندگی بسر کرنے کا تصور دیا۔

معلمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس معاشرے کو قائم کیا اس کی بنیاد اللہ پر ایمان، اللہ کے رسولوں پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، آسمانی کتابوں اور یوم آخرت پر ایمان، اچھی اور بری تقدیر پر ایمان' پر رکھی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا کائناتی نظریۂ حیات تھا جس نے اپنے ماننے والوں کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے اثرات نہایت گہرے اور ہمہ گیر ثابت ہوئے۔ اس نے اہل عرب کی منتشر زندگی کو مرکزیت فراہم کی۔ بکھری سوچوں کو منظم کیا۔ حسی معبودوں کے پجاریوں کو خالق حقیقی سے ملا دیا۔

اسلامی معاشرے کی ابتدائی تشکیل مکۃ المکرمہ سے ہوئی جو جغرافیائی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ عرب وعجم کے تجارتی قافلے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ مکہ کے قریش انٹرنیشنل تاجر تھے۔ شاہراہ مکہ، یورپ، ہندوستان اور چین کی تجارتی شاہراہ تھی۔ قریشی سردار اس بین الاقوامی تجارت کے سربراہ تھے۔ سرداران قریش نے ایک ادارہ ''سبیل'' کے نام سے قائم کیا تھا جو تجارتی قافلوں کی حفاظت پر مامور تھا۔ (1)

ابن حبیب مکہ کی جغرافیائی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عرب تین براعظموں کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے تجارتی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا۔ یورپ اور مشرقی ممالک کے درمیان

اوائل میں تجارت براستہ عرب ہی ہوتی تھی۔ خلیج فارس می دبا کر بندرگاہ عرب کے گودام کی حیثیت رکھتی تھی اور چین، ہند اور سندھ کے تجارتی قافلے عرب کے سالانہ میلوں میں شریت کیا کرتے تھے''۔ (2)

ابن سعد اپنی طبقات میں لکھتے ہیں کہ:

''عرب کے تاجر بھی دور دراز کے ممالک کا سفر کرتے بالخصوص ہندوستان، چین، حبشہ، مصر اور انقرہ کے ممالک کا سامان تجارت اپنے ملک لاتے اور یہاں کا ان کے ممالک میں فروخت کرتے تھے''۔ (3)

چشمۂ زمزم ان تجارتی قافلوں کی مہمان نوازی کرتا تھا۔ قیصر وکسریٰ، شاہ حبشہ اور یمن کے حکمرانوں کے ساتھ حضرت ہاشم نے تجارتی معاہدے کرر کھے تھے۔ ان معاشی معاہدوں کی وجہ سے مکۃ المکرمہ ہر لحاظ سے محفوظ اور پر امن عالمی تجارتی منڈی کی حیثیت اختیار کر گیا۔

مکۃ المکرمہ میں اگر چہ کوئی با قاعدہ حکومت نہ تھی تاہم یہاں سیاسی ادارے موجود تھے' جہاں دیوانی اور فوجداری مقدمات کے فیصلے ہوا کرتے تھے۔ قبائلی سرداروں نے باہمی مشاورت سے ایک Self Govt قائم کر رکھی تھی۔ جس کی مجلس وزارت، انتظامیف امور کی بجا آوری کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ محکمانہ وزارتیں موجود تھیں۔ کعبہ کی تولیت، چاہِ زم زم، فال نکالنے والے پرندوں کی نگرانی اور زائرین کے قیام وطعام کے با قاعدہ وزراء مقرر تھے۔ اسی طرح ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کا محکمہ موجود تھا جس کے انتظام وانصرام کے لئے ایک وزیر مقرر تھا۔ وزیر ٹیکسیشن کی ذمہ داری تھی کہ وہ حج کے دنوں میں باہر سے آنے والے حجاج کی ضیافت ومہمانداری کا بندوبست کرے اور ان کے سواری کے جانوروں کی حفاظت کرے۔ اہل مکہ کا اہم ادارہ دارالندوہ تھا جسے آج کی زبان میں پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ چالیس برس کی عمر تک پہنچنے والا ذی شعور اہل عرب اس مجلس مشاورت کا

ممبر بن سکتا تھا۔ جاہلیت کے اس زمانے میں وزارت خارجہ کے محکمے کا وجود بھی ملتا ہے۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی معاشرے کی تشکیل کا آغاز مکۃ المکرمہ سے کیا جو مختلف قبائل سرداروں کے تسلط میں تھا۔ ایسے سردار جولات ومنات، عزیٰ وھبل اور یغوث ویعوق کے پجاری تھے حسّی معبودوں کے سامنے سجدہ ریز ہوا کرتے تھے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آغاز میں چند جاں نثار ساتھیوں کی ضرورت تھی کیونکہ معاشرے کی تشکیل میں افراد کی اہمیت ہر دور میں مسلّم رہی ہے۔ افراد ہی معاشرے کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ اس اکائی کا تندرست وتوانا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے افراد سازی پر توجہ مبذول فرمائی اور اپنی مکی زندگی کے مختصر تیرہ سالوں میں اتنے ساتھی پیدا کر لئے جو آپ کے فرمان کی تعمیل میں جان ومال سب کچھ قربان کر سکتے تھے۔ آپ نے افراد سازی میں علم، تزکیہ نفس، تصفیہ قلب، مکارم اخلاق، اخوت واتحاد، صدق وامانت اور عفوودرگزر پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ کردار سازی کے ساتھ ساتھ آپ نے پورے عرب معاشرے کی رہنمائی اور اصلاح کے لئے ایسے قوانین بھی مرتب فرمائے جن پر عمل پیرا ہو کر عرب کے بدو اور حجاز کے ساربان دنیا کے تہذیب یافتہ انسان بن گئے۔

نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم اور رہنمائی کے نتیجہ میں ایک ایسا انسانی معاشرہ وجود میں آیا جسے انسانی تاریخ نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ اس معاشرے کے بانی پیغمبر برحق خاتم الانبیا علیہ التحیہ والثناء تھے اور اس مدنی معاشرے کی بنیاد، توحید ورسالت، عدل وانصاف، اخوت ومساوات، حق وصداقت، خوف الٰہی، اجتماعیت ومعمولات، جزا وسزا، صبر واستقامت اور فلاح انسانیت پر رکھی گئی تھی۔ حقوق وفرائض میں توازن تھا۔ نظام معیشت میں اعتدال تھا۔ مرد وزن، امیر وغریب، یتامیٰ ومساکین، آقا وغلام، رعایا وحکمران، اولاد ووالدین، میاں بیوی، شاگرد واستاد کے حقوق

وفرائض متعین تھے یہاں تک کہ مردوں اور جانوروں کے بھی حقوق متعین تھے۔ مدنی معاشرہ صرف تعلیمات و ہدایات پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر رائج تھا۔

کائنات انسانی کے اس منفرد و بے مثال مہذب معاشرے کی تشکیل مرحلہ وار ہوئی۔ اس کا آغاز مکہ مکرمہ سے ہوا اور تکمیل مدینہ منورہ میں ہوئی۔ مکی مسلمانوں کی تعداد اگرچہ مختصر تھی۔ نسبی اعتبار سے وہ مکہ کے تمام معروف قبائل سے منسلک تھے۔ عددی برتری نہ ہونے کے باوجود انہوں نے شہر مکہ میں اپنی الگ دنیا بسالی تھی بلکہ یہ کہنا بہت حد تک درست ہوگا کہ انہوں نے مملکت کے اندر اپنی ایک مملکت قائم کر لی تھی۔ مکہ میں رہنے کے باوجود وہ اپنے معاملات یا دادرسی کے لئے مکی وزارت انصاف کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے رہبر و ہادی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے معاملات طے کراتے۔ مدنی معاشرے کا یہ نکتہ آغاز تھا کہ آپ کے ساتھ اپنی زندگی کا ہر مسئلہ خواہ وہ انفرادی ہوتا یا اجتماعی، معاشی ہوتا یا دفاعی، اس کا تعلق قانون سازی سے ہوتا یا عدل وانصاف سے، جو معاملہ درپیش ہوتا اپنے رہبر و رہنما علیہ التحیہ والثناء کی خدمت میں پیش کرتے۔

حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تبلیغ کے آغاز میں ہی بت پرستی اور تمام تر حسی معبودوں کی بھرپور مذمت کی' جس کی وجہ سے قریش مکہ آپ کے مخالف ہو گئے اور یہ مخالفت آئے دن بڑھتی گئی لیکن آپ کے جانثاروں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ قریش مکہ کے شدید ردعمل کے باوجود آپ ابتدائی ایام میں عبادت بیت اللہ میں کیا کرتے تھے یہاں تک کہ کفار مکہ نے آپ پر بیت اللہ کے دروازے بند کر دیئے۔ ان حالات کے پیش نظر آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنے گھروں میں نماز ادا کرنے کی اجازت عطا فرمادی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے گھروں میں مساجد بنالیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر میں مسجد تھی۔ (4) اسی طرح سیدنا ارقم رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے

گھر میں مسجد تعمیر کر لی' جہاں عبادت کے ساتھ دیگر امور بھی زیر بحث لائے جاتے۔ سیدنا ارقم رضی اللہ عنہ کا گھر دارالارقم کے نام سے مشہور ہو گیا اور پھر آگے چل کر اس نے مسلمانوں کے پہلے تبلیغی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ دارالارقم میں ہی آ کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تھا۔ (5)

مدنی معاشرے کے اس ابتدائی تبلیغی مرکز میں گردونواح کے قبائلی لوگ آتے اور اسلام قبول کرتے۔ صحیح مسلم شریف کی روایت کے مطابق سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے بدر سے آ کر اسلام قبول کیا۔ (6) سیدنا طفیل الدوسی حضرموت سے آئے۔ (7) حضور شفیع امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی مقام پر تشریف فرما ہو کر مسلمانوں کے مسائل سنتے اور فیصلے سناتے اور اسی مقام پر سیاسی و دینی امور زیر بحث آتے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کی جاتی۔ آپ کی تبلیغ کا دائرہ کار وسیع ہوا تو قریش مکہ کی تشویش اور مخالفت میں بھی اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے آپ کا معاشرتی بائیکاٹ کر دیا۔ آپ نے منیٰ کی پہاڑیوں میں رہ کر تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آپ نے ہجرت مدینہ کی منصوبہ بندی کی۔ مختلف وفود سے ملاقاتیں کیں اور ان سے بیعت لی اور ساتھ ہی یثرب کے قبائل سے حفاظت و دفاع کے معاہدے کیے۔ عقبہ کی گھاٹی میں قیام کے دوران، ایام صلح میں یثرب کے معروف قبائل اوس و خزرج سے بھی معاہدہ ہوا۔ ان سے آپ نے فرمایا کہ "تم مجھے تحفظ دو، میرے فرمودات پر عمل کرو، تم بہت جلد قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے مالک بن جاؤ گے"۔ (8)

تیرہ سالہ مکی زندگی میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شبانہ روز پندرہ قبائل کو تبلیغ کی۔ بالآخر یثرب کے چھ رکنی وفد نے آپ کی دعوت کو قبول کیا۔ آپ نے مکہ میں رہتے ہوئے سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو اپنے نظریات مدینہ کے لوگوں تک پہنچانے کے لئے بھیج دیا۔ (9) سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی تبلیغی کوششیں کامیاب ہوئیں اور تین

قبائل کے سوا مدینہ کے تمام قبائل نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسرے سال مدنی قافلہ حجاج جو کہ 570 افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں 71 مرد اور 2 عورتوں نے آپ کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی وساطت سے عقبہ کی گھاٹی میں آپ سے ملاقات کی اور ان کی دعوت پر آپ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ (10) اس معاہدے میں اوس وخزرج دونوں شامل تھے جنہوں نے اپنی جان و مال اور اولاد سے بڑھ کر آپ کی حفاظت کا یقین دلایا۔ آپ نے خزرج کے 9 قبائل میں سے ان کے لئے 9 اور اوس کے تین قبائل کے لئے تین نقیب مقرر فرمائے اور ان سب پر نقیب النقباء سیدنا اسعد بن زیاد کو مقرر فرمایا جن کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا اور انہیں کے ہاں مدینہ منورہ میں سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے قیام فرمایا تھا۔ (11)

نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس معاہدے کے ذریعہ مدنی معاشرے کے قیام کے لئے ایک محفوظ جگہ حاصل کر لی' جو کہ حبشہ جیسے سمندر پار ملک کی نسبت بہت قریب تھی۔ مکی مسلمانوں کے لئے ہجرت کا سفر آسان نہ تھا۔ اپنی اولاد، ماں باپ اور منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کو چھوڑنا انسانی سرشت کے خلاف تھا، تاہم انہوں نے سب کچھ چھوڑ کر مدینہ منورہ کا رخ کیا یہاں تک کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' آپ کے چند قریبی رشتہ دار اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پیچھے رہ گئے۔ آپ کا سفر ہجرت موخر کرنا، فرمان الٰہی کے مطابق تھا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سفر ہجرت کی تیاری مکمل کر رکھی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مشورہ دیا کہ ابھی جلدی نہ کریں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بہت جلد مجھے ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آپ کی ہجرت کے لئے شہر مدینہ منورہ کو منتخب فرمایا تھا۔ آپ نے ایک موقع پر اس کا اظہار اس طرح فرمایا کہ مقام ہجرت مجھے دکھایا گیا ہے۔ یہ نمکیات والی سرزمین ہے۔ دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے

اور اس خطے میں کھجور کے درخت پائے جاتے ہیں۔ (12)

ہجرت کی خبر نے کفار مکہ میں تشویش پیدا کر دی۔ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی ناپاک کوشش بھی کی تاہم اللہ تعالیٰ نے آپ کو کفار کے شر سے محفوظ رکھا۔ (13) آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ کی امانتیں لوٹانے کے لئے مکہ میں چھوڑا اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر آئے۔ (14)

نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینت کی آمد سے قبل مدینہ کو یثرب کہا جاتا تھا۔ (15) مدینہ منورہ کھجوروں کے باغات میں گھرا زرخیز و شاداب خطۂ زمین حرہ واقم اور حرہ وبرہ جیسی دو پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ پانی کی فراوانی نے اسے مزید زرخیز بنا دیا تھا۔ شمال میں جبل احد اور جنوب مغرب میں جبل عیر کا سلسلہ واقع تھا۔ علاوہ ازیں مدینہ منورہ میں کئی وادیاں تھیں جن میں بطحا، مذینیب، مہزور اور عقیق زیادہ مشہور تھیں۔ مدینہ کی قدیم آبادی یہودی قبائل پر مشتمل تھی جن میں بنو نضیر اور بنو قریظہ مشہور قبیلے تھے۔ بنو قینقاع کا شمار بھی یہود کے بڑے قبائل میں سے ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بنو عکرمہ، بنو محمر، بنو زعوار، بنو شطیبہ، بنو حشم، بنو معاویہ، بنو یزید، بنو قصیص اور بنو ثعلبہ جیسے چھوٹے قبائل بھی مدینہ منورہ میں مقیم تھے جن کی تعداد تقریباً 20 تک پہنچتی تھی۔ (16)

اس ریاست کے قیام کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سیاسی بصیرت سے جان چکے تھے کہ طاقت کے بغیر اخلاقیات کا درس بے معنی ہی نہیں بلکہ خطرناک ثابت ہوگا۔ اخلاق سے ناآشنا گنوار لوگوں کے درمیان خدا پرستوں کی مختصر جماعت اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکے گی۔ اس لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنا لائحہ عمل بنائیں اور دین و دنیا کے جملہ معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لیں کیونکہ اس کے بغیر اللہ کی حاکمیت کا قیام ممکن نہیں۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ کی

طرف ہجرت کا فیصلہ کیا تا کہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ مدینہ منورہ میں ریاست کے قیام کی عملی وجوہات میں ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کے تقریباً پانچ قبائل نے آپ کو تعاون کی یقین دہانی کرادی تھی۔ یہ وہ حالات تھے جن کے پس منظر میں مدنی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ (17)

یہود معاشی اور سیاسی اعتبار سے عربوں کی نسبت زیادہ مضبوط تھے۔ انہوں نے علاقہ میں دفاعی قلعے تعمیر کر رکھے تھے جن کی تعداد اُنسٹھ (59) کے قریب تھی۔ (18) زراعت و کاشتکاری میں عربوں سے بہت آگے تھے۔ کھجور، انگور، انار، مرغ بانی اور مویشیوں کی افزائش کے علاوہ پارچہ بافی کی صنعت کو بھی فروغ دینے میں ان کا اہم کردار ہے۔
یہودیوں نے عرب قبائل سے فصاحت و بلاغت، فیاضی و سخاوت، شاعری اور ہتھیاروں کا استعمال سیکھا۔ عرب قبائل میں سے اوس اور خزرج زیادہ مشہور تھے۔ ان دونوں قبائل کا تعلق یمن کے شاہی قبیلہ کے افراد سے تھا۔ 207ء کے لگ بھگ یمن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مقیم ہوئے تھے۔ ان کی آمد سے قبل یہود مدینہ میں آباد ہو چکے تھے اور اس کے سر سبز و شاداب خطۂ زمین پر قبضہ کر چکے تھے۔ قبلہ اوس کو، بنو قریظہ اور بنو نضیر کے ساتھ، العوالی علاقہ میں سکونت اختیار کرنے کے لئے جگہ ملی جب کہ قبیلہ خزرج کو بنو قینقاع کی ہمسائیگی میں رہنا پڑا۔ قبیلہ اوس جہاں مقیم ہوا' وہ علاقہ قبیلہ خزرج کی نسبت زیادہ زرخیز تھا۔ آبادی و طاقت کے اعتبار سے یہ دونوں قبائل یہودیوں سے زیادہ طاقت ور تھے لیکن معاشی و اقتصادی تفاوت نے انہیں ہمیشہ بر سر پیکار رکھا اور رہی سہی کسر یہود اپنی فطری سازشوں سے پوری کرتے رہے۔ ان کے درمیان دشمنی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ چالیس سال سے حالت جنگ میں تھے اور آخری جنگ جسے تاریخ میں بعاث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وہ ہجرت سے صرف پانچ برس پہلے لڑی گئی تھی۔ جس میں اوس نے خزرج کو شکست دے دی تھی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان کے اس باہمی تصادم کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''جنگ بعاث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ آمد سے پہلے لڑی گئی تھی۔ آپ کی تشریف آوری سے قبل اوس وخزرج ایک دوسرے کے حریف تھے اوران کے زعماء قتل کیے جاچکے تھے یا زخمی ہو گئے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی ہجرت سے پہلے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ لوگ تیزی سے اسلام قبول کرنے لگے''۔ (19)

مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے فوراً بعد نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باہمی انتشاراور بدنظمی کودور کرنے پرتوجہ فرمائی۔ یہود کی سازشوں اور منافقین کی ریشہ دوانیوں کے سد باب کے لئے فوری طور پر ایک مشترکہ اجلاس بلایا' جس میں مسلمانوں کے علاوہ مدینۃ الرسول کے تمام مکینوں نے شرکت کی جن میں یہود، عیسائی اور بت پرست سب شامل تھے۔ان سب لوگوں کے سامنے ایک ریاست کی تشکیل کی تجویز رکھی تا کہ اندرونی نظم ونسق اور بیرونی حملوں سے شہر مدینہ کو محفوظ رکھا جائے۔اس کے لئے ضروری تھا کہ اس بستی کے تمام مکینوں کا ایک متفقہ حکمران ہو جو جملہ درپیش مسائل نمٹائے۔ یہ دنیا کا پہلا آئین اور دستور تھا جو آپ نے کائنات انسانی کو عطا فرمایا۔اس تحریری دستور میں سیاسی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا تھا۔خودمختاری، مذہبی رواداری، عدل وانصاف، سماجی تحفظ، دفاع، سفارت کاری، قانون سازی اور غیر مسلموں کے حقوق وفرائض سمیت تمام ضروری پہلوؤں کا ذکر کیا گیا۔ڈاکٹر حمیداللہ نے بڑی محنت سے اس تحریری آئین کی تمام شقوں کو یکجا کیا ہے جنہیں ابن اسحاق اورابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتابوں میں تحریر کیا ہے۔ابوعبیدہ نے کتاب الاوائل میں ابن سیدالناس نے عیون الاثر میں اورابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بیان کیا ہے۔ مدنی معاشرے کا یہ پہلا تحریری دستور العمل تھا جو باون (52) دفعات پر مشتمل تھا۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تمام دفعات کو بیان کر دیا جائے تا کہ مدنی معاشرے کے خدوخال کھل کر سامنے آسکیں۔

مؤاخاتِ مدینہ

یہ ایک حکم نامہ ہے.........جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔ (20)

ہجرت مدینہ کے فوراً بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا تاکہ بے سروسامان مہاجرینِ مکہ کو تنہائی اور بے بسی کا احساس نہ ہو۔ اس مؤاخات کے ذریعے کچھ مخصوص حقوق و فرائض وجود میں آئے جو تاریخ انسانی کے لئے دستور العمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلاذری کے نزدیک مؤاخات مکہ میں وجود میں آئی تھی۔ (21) لیکن دیگر جمہور مؤرخین و سیرت نگاروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مؤاخات مدینہ منورہ میں قائم ہوئی۔ وہ اپنے موقف کی تائید میں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لکھی جانے والی قدیم کتابوں کا حوالہ پیش کرتے ہیں کہ ان مستند کتابوں میں مؤاخات مکہ کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ آپ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مدینہ منورہ پہنچ کر مؤاخات قائم کی۔ درحقیقت مؤاخات کی ضرورت مدینہ منورہ میں ہی پیش آئی۔ (22) کیونکہ مہاجرین مکہ کو معاشی، معاشرتی اور عمرانی و سماجی مسائل کا سامنا درپیش تھا۔ انصارِ مدینہ نے اپنی موروثی فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دل کھول کر مہاجرین کی مدد کی۔ اپنی دولت، مال، باغات، یہاں تک کہ بعض انصار نے جن کی دو بیویاں تھیں، ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کے نکاح میں دینے کی پیش کش کر دی۔ یہ مواخات مدینہ کی درخشندہ مثال ہے۔ تاہم مہاجرین اپنی خودداری اور عزت نفس کی وجہ سے اپنے انصاری بھائیوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے محنت مزدوری اور تجارت و کاشت کاری پر توجہ دی۔

مؤاخات نوے (90) صحابہ کے درمیان ہوئی، ان میں سے پینتالیس (45) انصار تھے۔ کوئی مہاجر ایسا باقی نہ بچا جس کا بھائی چارہ انصاری سے قائم نہ ہوا ہو۔ (23)

نظام مؤاخات کے ذریعے ایسے خاص حقوق و فرائض وجود میں آئے جن کے سامنے خونی

رشتے بھی ماند پڑ گئے۔ (24) مواخات کی بنیاد خالصتاً باہمی تعاون اور جذبۂ ہمدردی پر مبنی تھی۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے گھر پر بھائی چارے کا یہ قیام عمل میں آیا۔ (25)

مدنی معاشرے کے قیام کے ساتھ ہی معاشرتی وسماجی تحفظ، قوانین وراثت، معاشرتی امور، حقوق العباد، والدین واولاد، زوجین، اساتذہ وشاگرد اور ہمسایوں کے حقوق وضع ہوئے۔

مدنی معاشرے میں دین مبین، انسانوں کا میل جول اور ان کے درمیان ہمہ قسم کے اشتراک کی بنیاد عقیدے پر رکھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ نسبی تعلق میں بھی عقیدے کا دخل ہے۔ یہ ایک ایسا اشتراک ہے جس کی بنا پر ایک فرد اپنے ساتھ اور ماموں بھانجے کے ساتھ برسرپیکار نظر آتا ہے یہاں تک کہ سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح اپنے کافر باپ کو قتل کر دیتے ہیں۔ (26)

اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس میں دوستی یا دشمنی کی بنیاد اسلام اور ایمان پر رکھی گئی ہے۔ یہی تعلق دراصل حقیقی تعلق ہے کیونکہ یہ تعلق وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے۔ تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی، دوست اور محافظ ہیں۔ ہمدردی کا جذبہ ان کے خون میں رچا ہوا ہے بلکہ اس کا ہر ایک فرد اخوت کی لڑی میں منسلک ہے۔ اس میں رنگ ونسل، جغرافیائی تفاوت، چھوٹے بڑے اور امیر غریب کا فرق آڑے نہیں آتا کیونکہ اس کی اساس نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان پر ہے:

> ''تمام مسلمان آپس میں محبت، باہمی تعلقات اور ہمدردی میں ایک جسم کی طرح ہیں جب جسم کا ایک حصہ درد میں مبتلا ہوتا ہے تو پورا جسم اس کی مدد کے لئے سرگرم عمل ہو جاتا ہے''۔ (27)

مدنی معاشرے کا ہر فرد دوسروں کے لئے وہی جذبۂ ہمدردی رکھتا ہے جو وہ اپنے لئے محسوس کرتا ہے کیونکہ نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

> ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک حقیقی مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے''۔ (28)

مسلم معاشرے کا ہر فرد خود غرضی اور استحصال سے مبرا ہوتا ہے۔اس کا ہر فعل اپنے مومن بھائی کی بھلائی کے لئے ہوتا ہے۔حقیقی مسلمان وہی ہوتا ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے اس کا دوسرا بھائی محفوظ رہے۔ وہ ہر کام میں اپنے بھائی کی مدد کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔اس معاشرے کے صاحب ثروت لوگ، ضرورت مندوں کی مدد کے لئے ہر وقت آمادہ نظر آتے ہیں اور فرمان الٰہی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنی محبوب ترین اور پسندیدہ اشیاء کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر تیار رہتے ہیں۔

مسلم معاشرے کا بنیادی مقصد انسانیت کی خدمت اور ان کے درمیان عدل وانصاف کا قائم کرنا ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

''ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ مبعوث کیے انہیں کتاب اور میزان عطا کیا تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔ (29)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے''۔ (30)

اللہ تعالیٰ کی حکومت کے قیام سے ان چیزوں کا سدِّ باب کرتا ہے جن کا سدِّ باب صرف تعلیمات کے ذریعے نہیں ہوتا یعنی برائیوں کی روک تھام تبلیغ اور ارشاد ونصائح سے ممکن نہیں ہوتی۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو زمین پر اقتدار عطا کر کے ان برائیوں کا خاتمہ کرتا ہے۔مسلمان معاشرے کی تشکیل کے پیچھے یہی مشیت ایزدی کارفرما ہے۔امن وامان کے قیام، سرحدوں کی حفاظت اور برائیوں کے خاتمے کے ساتھ یہ ان بھلائیوں کو فروغ دیتا ہے جن سے اسلام مخلوق خدا کو تمام تر برائیوں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ان صفات کو انسانی معاشرے میں رائج کرنے کے لئے ضروری اقدامات اٹھائے جاتے ہیں جو اس معاشرے

کا طرۂ امتیاز ہوتے ہیں۔ ان اقدامات کی تفصیل بالا جمال کچھ اس طرح ہے۔

مجلس شوریٰ کا قیام

مسلم معاشرے کے تمام فیصلے باہمی مشاورت سے طے کیے جاتے تھے۔ حضور شفیع امم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکہ معظمہ میں بھی تمام فیصلے باہمی مشاورت سے طے کرتے تھے۔ آپ کے مشیروں میں سے سیدنا ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین سمیت کئی صحابہ اس مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ مدینہ منورہ میں جب اسلامی ریاست وجود میں آئی تو آپ نے اوّلین چودہ مہاجرین کے ساتھ انصار مدینہ کو بھی اس مشاورتی کونسل میں شامل کیا گیا۔ ان میں اس قسم کے لوگ خاص طور پر شامل کیے گئے جو قرآن و حدیث کے عالم اور سیاسی و فوجی اور تبلیغی مہمات میں خصوصی توجہ رکھتے تھے۔

شوریٰ کی اہمیت کا اندازہ قرآن مجید کے احکامات سے ہوتا ہے جو گاہے بگاہے آپ پر نازل ہوتے رہے۔ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور مسلمانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے چلتے ہیں"۔ (31)

اور اے میرے حبیب! وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ:

ان سے معاملات میں مشورہ کرلیا کرو"۔ (32)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ میں نے ایک بار، حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ کے بعد ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم ہو اور نہ حدیث میں تو ہم کیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ عالم لوگوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو آپس کے مشورے کے لئے پیش کرو اور متفقہ رائے سے فیصلہ کرو۔ خلفائے

راشدین نے ہر حال میں مشاورت کی روح کو قائم رکھا۔ اس کی مثال ہمیں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر ملتی ہے کہ جب چند اصحاب سیدنا علی کی خدمت میں آئے اور خلافت قبول کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا:

"یہ معاملہ تمہارے فیصلہ کرنے کا نہیں یہ تو اہل شوریٰ اور اہل تدبیر کا کام ہے جس کو اہل شوریٰ اور اہل تدبیر پسند کریں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے"۔ (33)

اس واقعہ سے صاف نظر آتا ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں تمام فیصلے باہمی مشاورت سے ہوا کرتے تھے۔

مسلم معاشرہ میں حقیقی اقتدار کا مالک خالق حقیقی ہوتا ہے۔ مسلمان درحقیقت اللہ رب العزت کے نائب ہوتے ہیں۔ حقیقی حاکم مطلق کے احکامات پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس فلسفہ کی ترویج واشاعت فرمائی کہ:

"اے مسلمانو! تم پر لازم ہے کہ اللہ کی کتاب پر عمل کرو۔ جسے اس نے حلال کہا ہے اسے حلال سمجھو اور جسے اس نے حرام کہا ہے اسے حرام سمجھو"۔

عدل وانصاف

مسلم معاشرے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے قوانین، امیر وغریب کے لئے یکساں طور پر نافذ العمل ہوتے ہیں۔ امیر وغریب، چھوٹے بڑے، آقا وغلام کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ خود حبیب معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ.

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں''۔ (34)

گویا عدل و انصاف مسلم معاشرے کی روح ہے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پہلو پر خاص طور پر توجہ مبذول کی۔ ایک بار فرمایا:

''تم سے پہلے جو امتیں ہو گزری ہیں وہ اسی لئے تباہ ہوئیں کہ کم تر درجے کے مجرموں کو سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا''۔ (35)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

میں نے اپنی آنکھوں سے نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ذات سے بدلہ لیتے دیکھا ہے۔ (36)

متذکرہ بالا مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ نظام عدل کی مسلم معاشرے میں کتنی اہمیت تھی اور آپ نے انصاف کے عمل کو کس جانفشانی کے ساتھ نافذ فرمایا۔

اخوت و مساوات

مسلم معاشرے کا ہر فرد مساوی حقوق کا حامل ہوتا ہے کیونکہ انما المؤمنون اخوۃ۔ (37) مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے''۔ (38)

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچنے کے فوراً بعد نظام مواخات قائم کیا۔ مدنی معاشرے کے ہر فرد کو تلقین کی کہ تم آپس میں بھائی بھائی ہو۔ ''اللہ تمہاری صورتوں اور دولت کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔'' (39)

خطبہ حجۃ الوداع اخوت و مساوات کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم نے ایسا نظام مساوات نہیں دیکھا ہوگا جو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں پیش کیا۔ آپ نے واضح الفاظ میں اعلان فرمایا کہ

> ''لوگو سن لو! تمہارا رب ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنیاد پر''۔ (40)

حکومت کی ذمہ داری

معاشرے کے افراد کے جان و مال، عزت و حرمت اور تمام تر حقوق کا ذمہ دار امیر المومنین ہوتا ہے۔ ارشادی باری تعالیٰ ہے:

> ''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں، اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو''۔

حضور شفیع اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

> ''خبردار رہو تم میں سے ہر ایک راعی ہے، اور ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے اور مسلمانوں کا سب سے بڑا سردار، جو سب پر حکمران ہے وہ بھی راعی ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ (42)

یعنی معاشرے کے ہر فرد کو احتساب کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاندان کے سربراہ کو اپنے اہل و عیال کا حساب دینا پڑتا ہے کہ اس نے کس طرح ان کے ساتھ انصاف کیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان ہمارے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

"جو شخص حکمران ہے اسے سب سے زیادہ بھاری حساب دینا پڑے گا اور وہ سب سے زیادہ عذاب کے خطرے میں مبتلا ہوگا اور جو حکمران نہیں ہے اسے ہلکا حساب دینا ہوگا اور اس کے لئے ہلکے عذاب کا خطرہ ہے کیونکہ حکام کے لئے سب سے بڑھ کر اس بات کے مواقع ہیں کہ ان کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم ہو اور جو مسلمان پر ظلم کرے وہ اللہ سے غداری کرتا ہے"۔ (43)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں گشت کا نظام رائج کیا تھا۔ وہ خود اس کی نگرانی کرتے اور فرمایا کرتے:

"دریائے فرات کے کنارے بکری کا بچہ بھی اگر ضائع ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھے باز پرس کرے گا"۔ (44)

اطاعت اولی الامر

مسلم معاشرے کی امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اطاعت امیر کا حکم دیتا ہے۔ ایسا امیر جسے انہوں نے متفقہ طور پر منتخب کیا ہوتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ حکمران کی اطاعت، معروف میں واجب ہوتی ہے۔ اگر وہ خلاف شریعت کسی بات کے لئے کہتا ہے تو اطاعت متروک ہو جاتی ہے کیونکہ معصیت میں اطاعت جائز نہیں۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"ایک مسلمان پر اپنے امیر کی سمع و اطاعت فرض ہے خواہ اس کا حکم اسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سمع و اطاعت نہیں"۔ (45)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی مواقع پر مختلف الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ:

"اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں، اطاعت صرف معروف میں ہے"۔ (46)

آپ کے صحابہ کرام نے بھی مدنی معاشرے کی اس روح کو برقرار رکھا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے فوراً بعد جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا' اس کے الفاظ تاریخ اسلام میں محفوظ ہیں' جو ہمارے لئے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرمایا:

"اے لوگو! میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت واجب نہیں"۔ (47)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی یہی ارشاد فرمایا تھا:

"لوگو! میں اللہ کی فرماں برداری کرتے ہوئے تم کو جو حکم دوں اس کی اطاعت کرو۔ خواہ وہ تمہیں پسند ہو یا نہ پسند اور جو حکم میں تمہیں اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دوں تو معصیت میں کسی کے لئے اطاعت نہیں۔ اطاعت صرف معروف میں ہے۔ اطاعت صرف معروف میں ہے۔ اطاعت صرف معروف میں ہے"۔ (48)

مسلم معاشرے کا حکمران اللہ کے احکامات کا تابع ہوتا ہے۔ نافرمان کی اطاعت متروک ہو جاتی ہے۔ امیر المومنین، اقتدار کا طالب نہیں ہوتا بلکہ وہ بارِ خلافت کو ایک امانت قرار دیتا ہے۔ اس کا مظاہرہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبۂ اوّلین میں ملتا ہے کہ:

"اے لوگو! میں اس بارِ امانت کے قابل نہیں ہوں۔ تم چاہو تو کسی اور کو منتخب کر سکتے ہو"۔

اسی قسم کے الفاظ خلفائے راشدین کے خطبات میں ملتے ہیں۔ حضور تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اللہ کی قسم ہم منصب حکومت کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طالب یا حریص ہوتا ہے"۔ (49)

"تم میں سب سے بڑھ کر خائن وہ ہے جو منصب حکومت خود طلب کرتا ہے"۔ (50)

مسلم معاشرے کے ایسے امیر کی اطاعت، اس کے ہر فرد پر واجب ہوتی ہے اور بلاشبہ اسلامی ریاست کا حکمران معصیت کا حکم نہیں دیتا۔

بنیادی حقوق کا تصور

مسلم معاشرے کے ہر فرد کو اسلام نے بنیادی حقوق کی ضمانت فراہم کی ہے۔ یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے انسان کو حقوق کا شعور دیا ہے۔ قتل انسانی کے اوّلین واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد قرآن نے واضح الفاظ میں اعلان کیا:

"جس نے کسی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے قتل نفس کا ارتکاب کیا ہو، یا زمین پر فساد پھیلایا ہو، قتل کر دیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے اسے زندہ رکھا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو زندہ رکھا"۔ (51)

یہ آیت کریمہ ایک انسان کے بلاوجہ قتل کو پوری انسانی دنیا کا قتل قرار دیتی ہے اور کسی ایک کی جان بچانے والے کو پوری دنیا کی جان بچانے والا تصور کرتی ہے۔ گویا جان کی حرمت اور جینے کے حق کی ضمانت مدنی معاشرے کی امتیازی خصوصیت ہے۔ مسلم معاشرے کا ہر فرد محترم و مکرم ہوتا ہے، بچے، بوڑھے، جوان، مرد و زن، بلاتفریق جینے کا حق رکھتے ہیں۔ ان کی عزت و عصمت اور مال و دولت کی حفاظت اسلامی ریاست کی اوّلین ذمہ داری ہوتی ہے۔ عورتوں کا احترام اور ان کی عزت اسلام ہی نے سکھائی ہے۔ اسلامی معاشرے کی ہر عورت، ماں، بہن اور بیٹی کے روپ میں نہایت ہی محترم ہے۔

معذوروں، کمزوروں اور محتاجوں کی مدد اور ان کو تحفظ فراہم کرنا اس بے مثال معاشرے کی بہت بڑی خوبی ہے۔ عدل و انصاف، معاشی و اقتصادی تحفظ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، حق مساوات، معصیت سے اجتناب اور معروف کی طرف التفات، ظالم کی

مذمت اور مظلوم کی حمایت، اسلامی معاشرے کے ہر فرد پر واجب ہوتی ہے۔ اس معاشرے کا ہر باشعور فرد سیاسی و مذہبی اور دفاعی معاملات میں مشورہ دینے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ تحریر و تقریر اور عبادت و مذہبی امور میں آزاد ہوتا ہے۔ ظالم کے خلاف آواز احتجاج بلند کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اس معاشرے کے ہر فرد کے حقوق متعین ہیں اور معاشرہ اس کا ضامن ہے۔ عام مسلمانوں کے حقوق کا بھی تعین کرتا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

''ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں، سلام کا جواب دینا، بیمار کی عیادت کرنا، جنازے کے ساتھ چلنا، دعوت قبول کرنا، چھینک آنے پر یرحمک اللہ کہہ کر اس کے لئے دعائے مغفرت کرنا''۔ (52)

اسلام، ہر مسلمان کو ایک دوسرے کا بھائی اور ہر مومن کو دوسرے مومن کا آئینہ قرار دیتا ہے اور برملا اس کا اظہار کرتا ہے کہ مومن ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں اور ہر نقصان دہ چیز سے اسے بچاتے ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں اس کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں۔ (53)

اس معاشرے کا ایک فرد دوسرے فرد کو مشورہ دیتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ:

''ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہوتا ہے جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے فرمایا یوں''۔ (54)

یہ تو مسلم معاشرے کے عام افراد کے حقوق ہیں۔ اسلام نے ان افراد کے خاص حقوق متعین فرمائے ہیں جو نسبی اعتبار سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں جن میں والدین، اولاد اور زوجین کے حقوق سرفہرست ہیں۔ اس کے علاوہ ہمسایوں، اساتذہ، مہمانوں، یتیموں، مسکینوں، عزیزوں، غلاموں، حاجت مندوں، یہاں تک کہ مُردوں اور

حیوانوں کے بھی حقوق کا تعین کر دیا گیا ہے۔ صرف تعین ہی نہیں بلکہ اس معاشرے کے بانی نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حقوق کو عملی طور پر نافذ کیا ہے۔ انہی عملی تعلیمات کی وجہ سے مسلم معاشرہ خالصتاً فلاحی ومثالی معاشرے کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

نظامِ تعلیم

تعلیم انسان کا بنیادی حق ہے۔ اس کی اہمیت وضرورت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی تعلیم کے متعلق تھی۔ کسی بھی معاشرے کی فلاح اور ترقی کے لئے دو باتوں کی بیک وقت ضرورت ہوتی ہے' جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لئے فوجی دفاع کی' اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لئے تعلیم کی۔ علم ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے کوئی بھی نظریاتی وفلاحی معاشرہ اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے۔ علم کی اسی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے مکی زندگی میں ہی دار ارقم کو خفیہ درسگاہ کے طور پر استعمال کیا۔ (55)

ہجرت کے بعد بھی تعلیم کے نظام پر خصوصی توجہ فرمائی اور مسجد نبوی میں ایک مقام مخصوص کر دیا جہاں آپ صحابہ کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مدنی معاشرے کا یہ اوّلین مدرسہ "صفہ" کے نام سے معروف ہوا۔ حصول تعلیم کے طلب گار یہاں ٹھہرتے، ان کے قیام وطعام کا اہتمام شفیع اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر صحابہ کے ذمہ ہوتا تھا۔ آپ خود اصحاب صفہ کا خیال رکھتے۔ ان کے پاس روزانہ جاتے اور ان میں سے اگر کوئی بیمار ہوتا تو تیمارداری کرتے۔ (56)

اصحاب صفہ قرآن کی تجوید کے علاوہ احکام دین اور لکھنے پڑھنے کا طریقہ سیکھتے۔ سیدنا عبادہ بن صامت انہیں لکھنے پڑھنے اور قرآنی احکامات کی تعلیم دیتے۔ یہ پہلا اقامتی مدرسہ تھا جہاں ہر طالب علم کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ خلفائے راشدین کے زمانہ خلافت میں جب مسلم معاشرے کا دائرہ کار وسیع ہوا تو ہر شہر میں مدرسے اور درسگاہیں کھولی گئیں۔

جہاں طلباء کو مفت تعلیم دی جاتی تھی اور معلّمین کی تنخواہیں بیت المال سے ادا کی جاتی تھیں۔ طلباء کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ قرآن حکیم کے علاوہ حدیث، فقہ، سیرت و قانون، عربی ادب، علم الانساب اور کتابت باقاعدہ سکھائی جاتی تھی۔ (57)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم کو ہر چھوٹے بڑے پر لازم کر دیا تھا۔ آپ تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تعلیم کی اہمیت کا اندازہ غزوۂ بدر کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب قیدیوں کی رہائی کا مرحلہ درپیش ہوا تو آپ نے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا کہ سب کو قتل کر دیا جائے اور ہر مسلمان اپنے کافر رشتہ دار قیدی کو اپنے ہاتھوں سے خود قتل کرے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان میں بھی حکمت تھی کہ کفار مکہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ قتل سے ان کے حوصلے پست کیے جاسکتے تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ انہیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ آپ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا اور اس پر عمل کیا۔ ان میں کچھ ایسے تھے جن کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لئے رقم نہ تھی۔ آپ نے فرمایا: جن کے پاس فدیہ نہ ہو اور لکھنا پڑھنا جانتا ہو تو اَن پڑھ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے تو اسے بھی رہا کر دیا جائے گا۔ مسلمانوں پر یہ شرط عائد کر دی کہ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ان پر لازم ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ اس واقعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معلّمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتنے سخت ترین مشکل حالات میں تعلیم کو ترجیح دی اور دوسری طرف اپنے صحابہ پر لازم کر دیا کہ وہ ضرور بالضرور تعلیم حاصل کریں۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ مہد سے لے کر لحد تک علم سیکھو اور یہ بھی فرمایا کہ علم سیکھو چاہے تمہیں چین ہی کا سفر کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ آپ کے ارشادات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم معاشرے میں تعلیم کو کس قدر اہمیت حاصل تھی۔

نظام حکومت

مدنی اسلامی ریاست کا نظام حکومت آمرانہ نہ تھا کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام معاملات میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ فرماتے تھے یہاں تک کہ نماز کی طرف بلانے کے طریقہ پر بھی اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔(58) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کے قائم کردہ معاشرے میں جمہوریت بھی نہ تھی کیونکہ حتمی فیصلے کا اختیار انسان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ تمام فیصلے قرآنی احکامات کے مطابق ہوتے یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فہم و فراست سے کرتے اور بعض اوقات صحابہ کرام سے بھی مشورہ فرماتے۔ مدنی معاشرہ کے نظام سیاست کو ''تھیا کریسی'' کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وحی کا سلسلہ متروک ہوگیا تھا اور آپ کے خلفاء کو یہ سہولت میسر نہ تھی۔ آپ کے دور نبوت میں تمام مذہبی اور سماجی معاملات حکومت کے دائرہ کار میں تھے۔ تاہم انسانی فہم وادراک اس میں شامل تھا۔ سیاست وروحانیت الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی مددگار تھیں۔ خلیفۂ وقت بیرونی واندرونی نظام مملکت کا سربراہ ہوتا تھا۔ تمام سیاسی و مذہبی فیصلے خود کرتا، نماز خود پڑھاتا، حج بیت اللہ کی قیادت خود کرتا، قرآن کے جملہ فوجداری ودیوانی اور بین الاقوامی قوانین کا نفاذ خود کرتا تھا جب کہ روحانی اعتبار سے سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر اور سیدنا علی سے صحابہ وتابعین اکتساب فیض کرتے نظر آتے ہیں۔ امت مسلمہ کا سیاسی فلسفہ ایک رہا جب کہ روحانی خلفاء کی تعداد ایک سے زائد رہی کیونکہ ابوبکر وعمر سے بھی روحانی سلسلہ وابستہ نظر آتا ہے اور سیدنا علی سے بھی اور پھر اس کے بعد بے شمار روحانی سلاسل امت مسلمہ میں نظر آتے ہیں۔

حضور شفیع امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض اوقات اپنی رائے کا استعمال کرتے اور بعض اوقات فرماتے کہ اللہ کا فرمان یہ ہے تو صحابہ کرام سر تسلیم خم کردیتے اور بعض اوقات اپنی رائے پر جمہور کی رائے کو فوقیت دیتے۔ مثلاً غزوۂ اُحد میں اکثریت کی رائے کو تسلیم کرتے

ہوئے شہر سے باہر نکل کر کفار سے جنگ کی۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا اگر ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میں ان کی رائے کے خلاف کام نہیں کروں گا۔ (59)

شفیع اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں عصر حاضر کی طرح ووٹنگ نہیں ہوا کرتی تھی۔ تاہم جنگ ہوازن کے بعد کچھ مسلمان آپ کی تحریک پر جنگی قیدیوں کو آزاد کرنے پر تیار ہو گئے لیکن چند مسلمانوں نے تأمل اختیار کیا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو دو کے سوا سب نے جنگی قیدی آزاد کرنے کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ آپ نے جمہور کی رائے کا احترام کرتے ہوئے تمام قیدیوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا اور جن دو صحابہ نے اختلاف کیا انہیں سرکاری خزانے سے معاوضہ عطا کر کے قیدیوں کو رہا کرا دیا۔ (60)

دفاعی نظام

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں قدم رنجہ فرمانے کے فوراً بعد مواخات قائم کی تا کہ مہاجرین کا معاشی مسئلہ حل ہو جائے۔ اس کے بعد اس امر کی ضرورت تھی کہ کفار مکہ کے حملوں کا دفاع کیسے کیا جائے؟ اس کے لئے آپ نے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور متفقہ طور پر اس ریاست کے حکمران بن گئے۔ آپ نے اہل مدینہ اور یہود کے ساتھ معاہدے کئے۔ مدینہ منورہ کے مغرب میں چار بڑے قبائل تھے۔ ضمرہ، مدلج، جہینہ اور مزین۔ ضمرہ اور مدلج، بدر کے قریب آباد تھے اور مزینہ ینبوع میں' جہینہ مدینہ منورہ کے شمال میں واقع تھا۔ آپ نے سب سے پہلے ان سے معاہدات کئے کہ اگر باہر سے کوئی حملہ آور ہوگا تو مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ (61) مقابلہ کہاں ہوگا اور اس میں کون کون حصہ لے گا اس کا فیصلہ نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں گے۔ گویا ریاست کے حکمران ہونے کے ساتھ آپ کو سپہ سالار اعظم کی حیثیت بھی حاصل ہوتی تھی۔ مدنی معاشرے کا ہر فرد رضا کارانہ بلا تنخواہ جنگ میں حصہ لیتا بلکہ اپنا اسلحہ بھی خود خریدتا تھا۔ اسی طرح عدالتی نظام بھی قبیلے کا سردار کرتا تھا۔ قبیلہ مختلف ہونے کی صورت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خود فیصلہ فرماتے۔ اس طرح قاضی القضاۃ کے عہدۂ جلیلہ پر بھی آپ خود فائز تھے۔ قانون سازی کا اختیار بھی آپ کے ہاتھ میں تھا۔

ہجرت مدینہ کے بعد صرف دس سال میں اسلامی ریاست کی سرحدیں تیس لاکھ مربع میل تک پھیل گئیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریاست کے نئے قوانین اور نیا نظام عطا فرمایا۔ نئے آباد ہونے والے شہروں کی سڑکیں کھلی رکھیں، اتنی کشادہ جس سے دو لدے ہوئے اونٹ آسانی سے گزر سکیں۔ قانون وراثت و وصیت عطا فرمایا۔ سماجی و عمرانی نظام سے روشناس کیا۔ آپ کی قانون سازی کا دائرہ صرف دینی معاملات تک محدود نہ تھا بلکہ دنیاوی معاملات پر بھی آپ نے توجہ دی یہاں تک کہ دو مکانوں کے درمیان راستہ رکھنا بھی شامل تھا۔ دینی و دنیوی معاملات کا نظام درست رکھنے کے لئے ایک دفتر قائم تھا جسے کاتبین لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔ زکوٰۃ اور صدقات کا باقاعدہ اندراج اور حساب ہوتا تھا۔ مال غنیمت اور وظائف کا حساب کتاب رکھا جاتا تھا۔

خارجہ حکمت عملی

اقتصادی اور دفاعی اطمینان کے بعد نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیگر حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی اور انہیں خطوط لکھے جن میں حبشہ کے نجاشی حکمران اصحمہ بن الجر، مصر کے قبطی سردار مقوقس (Muqauquais) اور عمان کے سردار حارث ابن ابی شمر کے اسماء ابتدائی طور پر سامنے آتے ہیں۔ (62) اسلام کی ترویج و اشاعت میں صلح حدیبیہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ قریش مکہ کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد آپ نے اس وقت کے دو بڑے طاقتور حکمرانوں کو اسلام کی طرف بلایا۔ روم کے بادشاہ ہرقل اور ایران کے بادشاہ کسریٰ (پرویز) کو دعوت اسلام دی۔ ہرقل کی طرف سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ اور ایرانی فرمانروا خسرو پرویز کی طرف سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے۔ (63)

مدنی ریاست کی خارجہ پالیسی کا یہ سفر آغاز تھا۔ روم و ایران جیسی بڑی طاقتوں کے علاوہ

قبائلی سرداروں اور چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کے ساتھ بھی تعلقات قائم کیے جو درحقیقت ایران یا روم کے حکمرانوں کے تسلط میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایران کی مقبوضہ ریاست بحرین، عمان، مشقر، ہجر (الھفوف) کے حکمران منذر بن ساویٰ کے ساتھ تعلقات قائم کیے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ سفارت کے فرائض سیدنا علاء ابن حضرمی رضی اللہ عنہ نے انجام دیئے۔ (64)

منذر بن ساویٰ کو دعوت اسلام دینا اور ان کو اپنے ساتھ ملانا، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ منذر بن ساویٰ عرب میں بہت زیادہ اثر و رسوخ کا حامل تھا۔ تمیم قبیلہ کے ساتھ تعلق ہونے کے سبب صحرائے عرب کے جملہ بدو قبائل پر ان کا اثر تھا اور پھر قبیلہ تمیم کو مکہ مکرمہ میں بھی خاص مقام حاصل تھا۔ میدان عرفات کا انتظام اور حج کی رسومات کا اختتام انہیں کے سر تھا۔ (65) اس اعتبار سے قبیلہ تمیم کے ساتھ خوشگوار تعلقات خارجہ پالیسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس قبیلے کو اسلام میں داخل ہوتا دیکھ کر بحرین کے مضافاتی قبائل میں سے ایک معروف جنگجو قبیلے بکر بن وائل نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ (66) اسی طرح بنو تغلب، بنو قیس اور نجد کے قبیلہ بنو حنیفہ کو دعوتی خطوط لکھے۔ بنو حنیفہ بڑا طاقتور قبیلہ تھا۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ثمامہ بن اثال اور یہودہ ابن علی کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔ ثمامہ بن اثال نے ہی اپنی طاقت کے گھمنڈ پر مکہ مکرمہ کی ایک نشست میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (نعوذ باللہ) قتل کی دھمکی دی تھی۔ (67)

نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گرد و نواح کی خود مختار ریاستوں کو بھی سفارتی خطوط لکھے۔ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو عمان کے دو حکمران بھائیوں جیفر اور عبید پسران جندا کی طرف بھیجا جنہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کر کے اپنی حکومت برقرار رکھی۔ (68)

سماوا جو مدنی ریاست کے انتہائی شمال کے ملک عراق میں واقع تھا، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے حکمران نفاشہ بن فروہ جو کہ ایرانی اثر و رسوخ میں تھا، کو بھی نامہ

مبارک کو استعمال فرمایا۔ صرف و نحو کے پہلے عالم ابو الاسود الدؤلی کا تعلق اسی قبیلے سے تھا۔ یمن مدنی ریاست کے انتہائی جنوب مغرب میں واقع تھا۔ یہاں کا حاکم باذان، ایرانی بادشاہ کا باجگذار تھا۔ اس کے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفارتی تعلقات تھے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے اسلام قبول کر چکا تھا۔ انہیں دنوں یمن میں جب ایرانیوں کے خلاف قوم پرست تحریک نے سر اٹھایا تو آپ کی تبلیغی حکمت عملی نے مہمیز کا کام دیا اور یمنی قبائل گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کی تفصیل امام سرخسی نے اپنی کتاب مبسوط میں بیان کی ہے۔(69)

خارجہ حکمت عملی اور سفارتی عمل اور سفارت کاری نے باقاعدہ شعبے کی حیثیت اختیار کر لی۔ سیدنا عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو اسلام کا پہلا باقاعدہ مستند سفیر کہا جا سکتا ہے۔ شاہ حبشہ کی طرف دونوں بار سفارت کے فرائض آپ نے ہی انجام دیے تھے۔ ابن سعد کے نزدیک پانچ مرتبہ انہوں نے سفارت کا فریضہ انجام دیا۔(70) علاوہ ازیں آپ نے عرب کے تمام قبائل کو بذریعہ سفیر امن و سلامتی کا پیغام دیا۔ بنو خزاعہ کے سردار نوفل بن ورقا اور بسیر کے ساتھ بنو عمیر کو دعوت اسلام دی۔ بنو سلیم جو کہ مدنی ریاست کے جنوب مشرق میں آباد تھے اور ان کا علاقہ حجاز اور نجد تک وسیع تھا، ان کے ساتھ تعلقات قائم کیے۔(71) طائف کے معروف قبیلہ ہوازن کے ساتھ معاہدے کیے جن کی تفصیل کتاب الخراج میں موجود ہے۔(72) طائف کے مضافاتی قبائل ازد، جرش، بنو غطفان، طی، بنو قضاعہ، بنو کلب اور جذام جیسے قبائل کے ساتھ آپ کے سفارتی تعلقات آپ کی خارجی حکمت عملی کا حصہ تھیں۔

معاشی و اقتصادی حکمت عملی

معاشی و اقتصادی بحران پر قابو پانے کے لیے اوائل ہی میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم کر دی۔ تاہم مہاجرین بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ 2 ہجری میں غزوات کا آغاز ہوا تو مال غنیمت کا 4/5 حصہ مجاہدین

کا ذریعہ معاش بن گیا اور اسی طرح 1/5 حصہ بیت المال میں بھی جمع ہونے لگا جس سے غریبوں، یتیموں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا اور ریاست کے ترقیاتی کاموں کے علاوہ دفاعی امور میں بھی صرف ہوتا۔ دوسرا اہم ذریعہ زکوٰۃ تھی جو امیروں کے زائد مال سے لے کر غریبوں، یتیموں، مسکینوں، فقیروں، مسافروں اور قیدیوں کو دی جاتی ہے۔ مدنی ریاست کا معاشی نظام درحقیقت الہامی تھا جس کی وضاحت ہمیں قرآن مجید کے بے شمار مقامات پر ملتی ہے اور بالخصوص سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 60 جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبِهِمْ......﴾ (التوبہ:60)

ترجمہ: بے شک صدقات فقراء، مساکین، حکومت کے کارندوں اور نو مسلم حضرات کی تالیف قلوب اور قیدیوں کے لئے ہیں۔

عاملین کا لفظ اس میں قابل توجہ ہے یعنی ایسے لوگ جو خوش حال زندگی گزارتے رہے ہوں اور اچانک کسی حادثے نے انہیں محتاج کر دیا ہو، ایسے لوگوں کی مدد کو اسلام نے اہمیت دی ہے۔ اسی طرح اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو اہم مقام دیا گیا ہے۔ قرآن نے گویا مدنی ریاست کے اصول معیشت کو متعین کر دیا کہ صدقات و زکوٰۃ کو صرف ان آٹھ مدّات میں خرچ کیا جائے یعنی فقراء، مساکین، عاملین، مولفۃ القلوب فی الرقاب، غارمین، فی سبیل اللہ اور ابن سبیل پر خرچ کی جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت تک مدنی ریاست معاشی طور پر اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ آپ زکوٰۃ میں سے غیر مسلم ضرورت مندوں کی بھی مدد کیا کرتے تھے۔(73) عہد نبوی اور حضرت ابوبکر و عمر کے دور خلافت میں حکومت خود زکوٰۃ وصول کیا کرتی تھی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جب مدنی ریاست کی سرحدیں بلخ و بخارا اور کاشغر تک پہنچیں تو اس کے طریقِ کار میں تبدیلی آ گئی۔

عُشر اور ملا تیات وغیرہ پر لاگو زکوٰۃ تو بدستور حکومت وصول کرتی رہی لیکن سونا چاندی، مال وزر اور نقدی پر عائد زکوٰۃ، انفرادی طور پر مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی۔ عہد نبوی کا نظام معیشت جس کا اہم حصہ صدقات وزکوٰۃ ہوا کرتے تھے' آنے والے وقتوں میں محض خیراتی ہوکر رہ گیا۔

مسلم اور غیر مسلم شہریوں کے حقوق

مسلم معاشرے کا دستور العمل درحقیقت تکریم انسانیت کا داعی ہے اور وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ کا فرمان الٰہی اس پر شاہد ہے۔ اللہ کی جملہ مخلوق پر بنی آدم کو فضیلت کا شرف حاصل ہے اور پھر اس کی عزت وآبرو اور جان کو کعبہ کی حرمت سے بھی زیادہ محترم قرار دیا گیا ہے۔ انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا ہے۔ (74) حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ کائنات انسانی کے لئے منشور اعظم کی حیثیت رکھتا ہے اس منشور انسانی کی ایک شق یہ بھی ہے کہ تمہارے خون تمہارے اموال اور تمہاری عزت وآبرو اتنی ہی محترم ومقدس ہے جس قدر اس ماہ کا یہ دن۔ اس شہر مکہ میں معزز وحرمت والا ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کسی قسم کی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔ (75)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ملک شام کے سفر کے دوران چند لوگوں کو دیکھا جنہیں دھوپ میں کھڑا کر کے ان کے سروں پر گرم تیل انڈیلا جا رہا تھا۔ آپ نے پوچھا کہ ان لوگوں نے کیا جرم کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ ذمّی ہیں جن پر جزیہ واجب ہے جس کی ادائیگی وہ نہیں کر سکے۔ انہیں جزیہ ادا نہ کرنے کی سزا دی جا رہی ہے تا کہ وہ آئندہ وقت پر جزیہ ادا کریں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا ان کا عذر کیا ہے۔ بتایا گیا کہ جزیہ ادا کرنے کیلئے ان کے پاس کچھ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو اور ان کی طاقت سے بڑھ کر انہیں تکلیف نہ دو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا کہ:

''لوگوں کو عذاب نہ دو جو لوگ دنیا میں لوگوں کو سزائیں دیتے ہیں اللہ تعالیٰ روزِ قیامت انہیں سزا دے گا۔'' (76)

نبی محترم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ جس کسی نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو تک نہیں پائے گا حالاں کہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک آئے گی۔ (77)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اہل الذمہ کا خون ہمارا خون ہے قصاص میں برابر ہے اور ان کا خون بہا وہی ہے جو ایک مسلمان کا خون بہا ہے۔ سیدنا علی نے اپنے اس فرمان کو عملی طور پر نافذ بھی فرمایا۔ (78)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس نے کسی ذمی کو جس کا ذمہ اللہ اور اس کے رسول نے لیا ہے، قتل کیا اس نے اللہ کے ذمہ کو توڑ دیا۔ (79)

اسلام احترامِ آدمیت کا درس دیتا ہے تاہم مسلم ریاست میں رہنے والے غیر مسلم اگرچہ وہ قدیم النسل ہی کیوں نہ ہوں، ان کا شمار اقلیت میں ہوگا لیکن حقوق و فرائض کے اعتبار سے وہ اس ریاست کے برابر کے شہری ہوں گے جو حقوق مسلمانوں کو حاصل ہوں گے وہی غیر مسلم شہریوں کو حاصل ہوں گے۔ مسلمان کی تعریف یہ ہے جو اللہ، اس کے آخری رسول، آسمانی کتابوں، فرشتوں، یوم آخرت اور اچھی بری تقدیر پر ایمان رکھتا ہے جو ان شرائط پر پورا نہ اترتا ہو غیر مسلم ہوگا۔ گویا یہود و نصاریٰ، کفار و مشرکین، جیسے دہریے و منکرین سب کے سب غیر مسلم شمار ہوں گے۔ مسلم معاشرے میں ان کے حقوق وہی ہوں گے جو ایک آزاد مسلم شہری کے ہوں گے۔

اسلامی ریاست کے قدیم باسی یہودی النسل تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے منتظر تھے۔ عربوں اور یہودیوں کے مابین جب کبھی اختلاف واقع ہوتا تو یہودی

بڑے ہی فخر سے کہتے اس وقت کا انتظار کرو جب خاتم الانبیاء تشریف لائیں گے تو ہم ان پر ایمان لا کر تمہارا وجود مٹا ڈالیں گے۔ مشیت ایزدی دیکھیے کہ عرب قبائل مشرف بہ اسلام ہو کر آپ کے معاون و مددگار بن گئے اور یہود کو اپنے فطری و نسلی تعصب کی بنا پر مدینہ منورہ چھوڑنا پڑا۔ تاہم اسلام قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ نا انصافی یا غیر اخلاقی برتاؤ نہیں کیا گیا۔ قرآن نے اعلان کر دیا کہ اسلام کے قبول کرنے میں کسی پر جبر کرنے کی ضرورت نہیں۔(80) اسلامی ریاست کے آئینی دستور میں غیر مسلموں کو ان کے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کھلی اجازت دی گئی یہاں تک کہ وہ اپنے معتقدات اور اختلافی امور اپنے قانون کے مطابق طے کیا کرتے تھے۔(81)

اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندوں کو جنگ سے بھی مستثنیٰ کر دیا گیا البتہ ان میں سے ان پر ایک ٹیکس عائد کیا گیا جسے جزیہ کہا جاتا ہے۔ یہ ٹیکس در حقیقت ان کے جان و مال کی حفاظت کے عوض میں تھا۔ مستشرقین نے اسلامی ریاست کے اس عائد کردہ ٹیکس کو غیر انسانی قرار دیتے ہوئے اسے اسلام کی ایجاد کہا ہے حالانکہ یہ ٹیکس روم و ایران کے فرمانرواؤں کی حکومتوں میں پہلے سے موجود تھا اور یہ اس شخص پر عائد ہوتا تھا جو جنگ میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ اسلامی ریاست کے آئینی دستور میں بھی اس ٹیکس کو شامل کر لیا گیا جو صرف غیر مسلموں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے عوض وصول کیا جاتا تھا کیونکہ وہ غزوات سے مستثنیٰ تھے لہٰذا مدنی ریاست کے غیر مسلم باسیوں کی اس حد تک حفاظت کی جاتی تھی کہ اگر ان کا کوئی بچہ بھی بیمار ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی بیمار پرسی کے لئے خود تشریف لے جاتے تھے۔ یہودیوں کا جنازہ مدینہ کی گلیوں(82) سے گزرتا تو آپ اظہار ہمدردی و یکجہتی کے طور پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ آپ کے حسن اخلاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے باہمی خانہ جنگی میں کبھی بھی یہود و نصاریٰ اس سے بد ظن نہ ہوئے۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت میں قیصر روم نے اسلامی ریاست میں مقیم عیسائیوں کو اکسانا چاہا تو

بھیجے کہ تم مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرو' ادھر میں ان پر حملہ کروں گا اور اس طرح ہم ان سے نجات حاصل کر لیں گے تو انہوں نے جواباً کہا کہ ہم ان حکمرانوں کو تم جیسے ہم مذہب عیسائیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صلیبی جنگوں تک یہود و نصاریٰ کے مذہبی راہنماؤں کا یہ رویہ برقرار رہا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ مسلم حکمران اپنی غیر مسلم رعایا پر اسلام قبول کرنے کے معاملے میں جبر نہیں کیا کرتے تھے۔ مذہباً وہ کلی طور پر آزاد تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کی ایک اہم شہادت تاریخ میں آج تک محفوظ ہے کہ ایک عیسائی اپنے دوسرے ہم مذہبوں کو جو دوسری مملکت میں مقیم تھے یہ کہتا ہے کہ آج کل ہم ایسے حکمرانوں کے محکوم ہیں جو ہم پر ظلم نہیں کرتے بلکہ وہ ہمارے گرجاؤں اور خانقاہوں کی حفاظت اور مدد کرتے ہیں۔

عربی زبان میں غیر مسلم رعایا کے لئے ذمّی کا لفظ آیا ہے جس کے معنی عہد کفالت و حرمت اور ذمہ داری و حق کے ہیں۔ رجل ذمی اس شخص کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی عہد و پیمان لیا گیا ہو۔ ارشاد نبوی کے مطابق ذمہ کے معنی امان کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلم معاشرے کا ایک فرد کسی غیر مسلم کو امان دے دیتا ہے تو پوری قوم اس کی حفاظت کی ذمہ دار بن جاتی ہے۔ (82) لغوی طور پر ذمہ عہد کا مفہوم ادا کرتا ہے جس کا معنی ایمان اور ضمانت لیا جاتا ہے اور معاہد کو ذمّی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی نسبت ذمہ کی طرف یعنی عہد کی طرف کی گئی ہے۔ (83) اصطلاح میں یہ وہ ذمہ داری ہے جو مسلم معاشرہ اپنی غیر مسلم رعایا کو جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا ذمہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو ذمّی یا اہل الذمہ کہا جاتا ہے۔ (84) غیر مسلموں کے حقوق کے متعلق فقہ کی کتابوں میں ایک فقرہ بطور محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ لَھُمْ مَا لَنَا وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْنَا جو ہمارے حقوق ہیں وہی ان کے حقوق ہوں گے اور جو ہمارے فرائض ہیں وہی ان کے فرائض ہوں گے۔ مسلم معاشرے میں غیر مسلم رعایا کے حقوق کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

مذہبی آزادی

مسلم معاشرہ اپنے ذمّی کو عقیدہ و مذہب کی آزادی دیتا ہے۔ مذہب کے معاملے میں زبردستی نہیں کرتا۔(85) اور نہ ہی کسی کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔(86) بلکہ اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ان کے غیر حقیقی خداؤں کو گالی تک نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جہالت کی بنا پر تمہارے حقیقی معبود کو گالیاں دینے لگیں۔(87) مسلم معاشرے کا دستور تو اس حد تک تکریمِ انسانیت کی پاسداری کرتا ہے کہ ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارنا بھی گوارا نہیں کرتا۔(88) نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کو ایک امان نامہ لکھ کر دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ مسلم معاشرے میں بطور رعایا رہتے ہوئے ان کے گرجوں کی حفاظت کی جائے گی انہیں منہدم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی راہب یا پادری کو ان کے گرجوں سے نکالا جائے گا اور نہ ہی انہیں اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ کوئی ایسا نیا کام نہ کر دیں یا سود خوری نہ کرنے لگیں۔(89)

عہد نبوی کے بعد خلفائے راشدین نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ ان معاہدات کو برقرار رکھا اور انہیں ان کے عقیدے کے مطابق عبادت و رسومات ادا کرنے کی مکمل آزادی دی۔ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اہل ایلیاء اور اہل عانات کو تحریری طور پر لکھ کر دیا کہ وہ ان کے کسی گرجا کو نہیں گرائیں گے۔ اوقات نماز کے علاوہ انہیں دن اور رات کے کسی وقت میں ناقوس بجانے کی اجازت ہوگی اور اپنی عیدوں کے دنوں میں صلیب لٹکانے کی بھی اجازت ہوگی۔(90) تاریخ شاہد ہے کہ مسلم حکمرانوں نے کبھی کسی غیر مسلم رعایا کو مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا اور نہ ہی انہیں ان کے مذہبی شعائر کو بجا آوری سے منع کیا ہے۔ کاسانی نے اپنی کتاب بدائع الصنائع میں اور ابن قدامہ نے اپنی معروف تصنیف الشرح الکبیر میں اس کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔

اسلام اہل الذمہ کو عبادت گاہوں کی تعمیر کی آزادی بھی دیتا ہے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ

کے دور خلافت میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب حیرہ فتح کیا تو یہی معاہدہ لکھ کر دیا کہ انہیں مذہب کی آزادی ہوگی اور وہ اپنی مرضی سے عبادت کر سکیں گے۔ ان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی اور انہیں صلیب نکالنے سے نہیں روکا جائے گا۔ (91) سیدنا خالد بن ولید کے اس معاہدے کو تمام خلفاء نے برقرار رکھا۔ مقریزی لکھتے ہیں کہ مسلم حکمرانوں نے نہ صرف غیر مسلم ذمی لوگوں کی عبادت گاہوں کو قائم رکھا بلکہ انہیں نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت بھی عطا کی اور ان کے ساتھ ملحقہ تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کو بحال رکھا۔ ان عبادت گاہوں کے پادریوں اور مجاوروں کے جو وظیفے مقرر تھے انہیں بھی جاری رکھا۔ سیدنا عمرو بن العاص نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب مصر فتح کیا تو جتنی زمین ان کے گرجاؤں کے ساتھ ملحق تھی انہوں نے اسے بحال رکھا۔ (92)

حرمت مال و جان

مسلم معاشرے کے ہر فرد کی جان و مال کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ مسلم معاشرے کا ہر شہری خواہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم مساوی حقوق کا حامل ہوتا ہے۔ مسلم یا غیر مسلم کا خون برابر ہوتا ہے۔ اگر مسلم معاشرے کا کوئی آزاد شہری کسی غیر مسلم ذمی کو قتل کر ڈالے تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائے گا جس طرح ایک مسلمان کا لیا جاتا ہے کیونکہ

﴿إِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ﴾ (المائدہ: 45)

یعنی جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ۔

یہ حکم عام ہے اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی قید نہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى﴾ (البقرہ: 178)

مقتولین کے بارے میں قصاص کو تم پر فرض کیا گیا ہے۔

۔ معروف فقیہ ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں کہ مقتول ذمی کے بدلہ میں قاتل مسلمان کا قتل واجب ہے کیونکہ عام حقوق میں ایک ذمی اور ایک مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور قصاص کے واجب ہونے کا حکم عام ہے۔(93) یحییٰ بن آدم القرشی یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ ایک مسلمان نے ایک اہل کتاب کو قتل کر دیا۔ مقدمہ فیصلہ کے لئے بارگاہ نبوت میں آیا۔ رسول برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اہل ذمہ کا حق ادا کرنے میں سب سے زیادہ حق دار ہوں چنانچہ آپ نے قاتل کو قصاص میں قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔(94) [illegible]

مسلم معاشرے کا ہر فرد مساوی حق تحفظ کا حامل ہوتا ہے۔ اہل الذمہ کے جان و مال کی حفاظت کی حکومت وقت اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح وہ آزاد مسلم شہری کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ان کا داخلی و خارجی دفاع ریاست کا فرض بن جاتا ہے۔ شیرازی لکھتے ہیں کہ مسلم ریاست کے حکمران پر اہل الذمہ کا دفاع کرنا، مسلم یا غیر مسلم کے آزار سے انہیں بچانا، ان کے قیدیوں کو رہائی دلانا اور ان کے چھینے گئے اموال کو واپس دلانا مسلم حکومت کا فرض ہوتا ہے چاہے وہ مسلم معاشرے میں بطور ذمی مقیم ہو یا اپنے الگ وطن میں جزیہ دے کر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یہ فرض مسلم حکومت پر اس لئے عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان اور مال کی حفاظت کے عوض ریاست اسلامیہ کو جزیہ ادا کر رہے ہوتے ہیں۔(95) [illegible]

نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد اس ضمن میں بڑا واضح ہے کہ جس نے کسی معاہد (ذمی) پر ظلم کیا یا اس کا حق چھینا یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اسے تکلیف دی یا اس کی مرضی کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو قیامت کے روز میں اس کی طرف سے مدعی ہوں گا۔(96)

۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ذمیوں کے جان و مال کے تحفظ کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ یہاں تک کہ اپنی وصیت میں بھی انہیں یاد رکھا کہ اہل الذمہ کے جان

و مال کی حفاظت اور ان کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کو نبھانا اور ان کی جان بچانے کے لئے قتال کرنا ضروری ہے۔(97)

امام ابو یوسف نے ہارون الرشید عباسی کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ

"اللہ آپ کو اپنی نصرت سے نوازے۔ تم پر لازم ہے کہ تم اپنے نبی اور اپنے چچا کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل الذمہ لوگوں کے ساتھ نرمی اختیار کرو اور ان کے حالات کو نگاہوں میں رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ظلم وستم کا نشانہ بن جائیں اور ان کی استطاعت سے بڑھ کر ان سے کام لیا جائے اور انہیں دکھ پہنچایا جائے اور ان کے اموال میں سے ناحق طور پر کچھ چھین لیا جائے۔(98)

مسلم معاشرہ اپنے اہل الذمہ لوگوں کی جان و مال کی حفاظت میں اس حد تک محتاط ہے کہ اگر کوئی آزاد مسلم شہری کسی ذمّی کا مال چوری کرلے تو اس کو وہی سزا دی جائے گی جو ایک مسلمان کے مال چوری ہونے پر کسی عام شہری کو دی جاتی ہے۔ شفیع امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اس ضمن میں شاہد ہے کہ آپ نے نجران کے عیسائیوں کے وفد کے ساتھ جو معاہدہ فرمایا اس میں اموال کی حرمت بھی شامل تھی بلکہ ان کی زرہوں کی ضمانت شامل تھی جو ان سے آپ نے ادھار لی تھیں۔(99) مسلم معاشرے کا ہر غیر مسلم و شہری صنعت و حرفت میں برابر کے حق رکھتا ہے وہ ہر پیشہ اختیار کرنے کا حق رکھتا ہے جس کی اجازت ہر مسلمان شہری کو ہے۔

تحفظ عزت و آبرو

اسلام احترام آدمیت کا داعی ہے۔ مسلم معاشرے کے ہر فرد کو اس کا مساوی حق حاصل ہے۔ جہاں تک اہل الذمہ کو گالی گلوچ دینے اور اُن پر تہمت لگانے کا معاملہ ہے تو وہ اس ضمن میں مسلمانوں کے برابر حقوق رکھتے ہیں۔(100) علامہ قرانی لکھتے ہیں کہ اہل

الذمہ کو نیکی کی طرف بلانا تاکہ وہ صالح حضرات میں شامل ہو جائیں اور ان کے تمام دینی ودنیوی معاملات کی خیر خواہی کرنا نیکی میں شامل ہے۔ اگر کوئی شخص اہل الذمہ کو اذیت دینے پر تل جائے تو غائبانہ طور پر ان کے اموال وعیال اور ان کی عزت وآبرو کی حفاظت کرنا ان کے ساتھ نیکی کرنے کے مترادف ہے۔(101) اہل الذمہ کے ساتھ زیادتی کرنا چاہے زیادتی بدزبانی کی شکل میں ہو یا غیبت کی شکل میں ہو یا اسی طرح کی اذیت کی کوئی شکل ہو تو یہ سب کچھ اللہ، اس کے رسول اور دین اسلام کے ذمہ کو ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔(102) اہل الذمہ کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے اذیت پہنچانا، گالیاں دینا، مارنا پیٹنا یا ان کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح ایک مسلمان کے حق میں ناجائز ہے۔ عابدین اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ ذمّی کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جس طرح ایک مسلمان کی غیبت حرام ہے۔(103)

تحریر وتقریر کی آزادی

مسلم معاشرے میں رہنے والے ہر غیر مسلم کو تحریر وتقریر کی وہی آزادی حاصل ہے جو ایک آزاد مسلم شہری کو حاصل ہوتی ہے۔ غیر مسلموں کو ان کے یا ان کی مرضی کے خلاف عقیدہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ ہر ذمّی کو ان کے ضمیر کے مطابق کام کرنے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ اسلامی ریاست کے قانون کے خلاف نہ ہوں۔(104) اسلامی ریاست کا آئین، اہل کتاب کے ساتھ احسن طریقے سے مناظرہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے کہ:

> "اے مسلمانوں اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر احسن طریقے سے، صرف ان سے جھگڑا کرو جو ان میں سے بے انصاف ہیں"۔

تحریر وتقریر کی آزادی مسلم معاشرے کا امتیاز ہے۔ معروف اسکالر حسن الزین کے مطابق اگر اظہار رائے کی آزادی نہ ہوتی تو علوم وفنون پر جمود طاری ہو جاتا کیونکہ تحقیقی علوم

کے لئے مطالعہ، تجربہ اور بحث و مباحثہ ضروری ہے اور انسانی عقل ظلم و ستم کے سائے میں کبھی نہیں پنپ سکتی۔ (105)

قانونی تحفظ

فوجداری و دیوانی قانون، مسلم معاشرے کے مسلم و غیر مسلم جملہ شہریوں کے لئے یکساں طور پر نافذ ہے۔ دونوں کے لئے مساوی درجہ رکھتا ہے۔ چوری، بدکاری، ڈاکہ زنی یا دیگر فوجداری جرائم میں جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی سزا غیر مسلم کے لئے ہوگی۔ مسلمان شہری کا مال غیر مسلم چرا لے یا مسلم شہری غیر مسلم ذمی کا مال چوری کرلے، سزا کے اعتبار سے دونوں برابر ہوں گے۔ چوری کی سزا دونوں پر یکساں طور پر نافذ ہوگی۔ ایک ذمی کسی پر زنا کی تہمت لگاتا ہے یا مسلم شہری ذمی پر لگاتا ہے دونوں صورتوں میں ایک ہی حد قذف جاری ہوگی۔ اسی طرح زنا کی سزا میں بھی دونوں کی حیثیت ایک ہوگی۔ (106) دیوانی قانون بھی ریاست کے دونوں شہریوں پر یکساں طور پر نافذ ہوتا ہے۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا قول ہے کہ اموالھم کاموالنا یعنی ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذمی کے مال کی اسی طرح حفاظت کی جائے گی جس طرح مسلمان کے مال کی کی جاتی ہے اور دیوانی قانون میں وہ دونوں برابر ہوں گے۔ تجارت کے جو اصول ہم پر نافذ ہوں گے وہی اہل الذمہ پر نافذ ہوں گے۔ سود جس طرح مسلمانوں پر حرام ہے اسی طرح غیر مسلموں پر حرام ہے۔ مسلمان تاجروں کی طرح ذمیوں سے بھی تجارتی ٹیکس لیا جائے گا۔ (107)

مذکورہ بالا حقوق کے علاوہ غیر مسلموں کو حق سکونت بھی حاصل ہے وہ اسلامی ریاست کے جس شہر میں چاہیں رہائش پذیر ہو سکتے ہیں۔ کاروبار کر سکتے ہیں اور جا سکتے ہیں روک ٹوک آ جا سکتے ہیں البتہ انہیں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حدود حرم میں جانے کی اجازت نہیں۔ ہنگامی صورت حال میں اسلامی ریاست مسلم و غیر مسلم دونوں کی نقل و حرکت پر پابندی لگا

رکھتی ہے جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مشاورت کی غرض سے مدینہ سے باہر جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ (108)

حقوق کی طرح غیر مسلموں کے فرائض بھی متعین ہیں۔ عشر، جزیہ اور خراج کی ادائیگی غیر مسلموں پر لازم ہے کیونکہ حقوق اور فرائض لازم و ملزوم ہیں۔ فرائض کی ادائیگی کے بغیر حقوق کا تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ ماوردی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے جزیہ و خراج کے علاوہ چند اور شرائط کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ غیر مسلموں پر لازم ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہ طعن کریں اور نہ تکذیب و توہین کے مرتکب ہوں اور نہ دین اسلام پر تنقید کریں۔ مسلمان خواتین سے نکاح نہ کریں اور نہ کسی مسلمان کے مذہب و مال سے تعرض کریں۔ جنگ کے دنوں میں اسلامی ریاست کا ساتھ دیں۔ اہل حرب کی مدد نہ کریں، جاسوسی نہ کریں اور ان کے دولت مند لوگوں سے راہ و رسم رکھیں۔ (109)

مسلم ریاستوں کے غیر مسلم ریاستوں سے تعلق

اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی آفاقی اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کے قواعد و ضوابط نے بین الاقوامی قوانین کو بنیاد فراہم کی۔ اسلامی ریاست کی تشکیل کے وقت روم و ایران اور چین جیسی طاقتور سلطنتیں دنیا کے نقشہ پر موجود تھیں تاہم ان کے پاس تحریری صورت میں کسی قسم کا قانون موجود نہ تھا۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے میثاق مدینہ کی صورت میں انسانی معاشرے کو پہلا تحریری دستور دیا۔ تکریم انسانیت اور احترام آدمیت کی پاسداری جس انداز سے مسلم معاشرے کا دستور العمل کرتا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی اور قانون میں نہیں ملتی۔ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی اپنی جامعیت کے اعتبار سے بین الاقوامی معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتی ہے۔ مسلم ریاستوں کے غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات کے ضمن میں تمام تر تفصیلات اس میں پائی جاتی ہیں۔ لفظ میثاق خاص طور پر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

علاوہ ازیں، معاہدہ، عہد، صلح اور حلف جیسی اصطلاحات بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ (110)

سیدنا سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کے مابین سفارت کاری کا اشارہ قرآن مجید کی اس آیت سے ملتا ہے:

ترجمہ: میں انہیں ایک ہدیہ بھیجنے والی ہوں، پھر دیکھوں گی کہ قاصد کیا جواب لے کر واپس آتے ہیں۔ (111)

ملکہ سبا کے سفیروں کا قافلہ جب سیدنا سلیمان کی خدمت میں پہنچتا ہے تو قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ سیدنا سلیمان نے ملکہ سبا کے تحائف قبول نہ کیے۔ (112) اس سفارت کاری سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مخالف اور دشمنی کے باوجود سفیروں کا احترام اور تحفظِ جان موجود تھا۔

نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینت نے جن قوانین کو متعارف کرایا وہی بین الاقوامی خارجہ پالیسی کے رہنما اصول بنے۔ صلح حدیبیہ اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ یہ معاہدہ ایک مسلم ریاست کا غیر مسلم ریاست کے ساتھ تھا' جس کے تحت دس (10) سال تک جنگ ممنوع قرار پائی تھی۔ اس معاہدے کے تحت یہ قرار پایا تھا کہ اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ سے بھاگ کر ریاست مدینہ منورہ میں آئے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا اور اگر مدنی ریاست سے کوئی مکہ معظمہ چلا جائے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ اس معاہدے کے بعد جب ابوجندل اور ابوبصیر مکہ سے بھاگ کر مدینہ منورہ آئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں واپس کر دیا تھا۔ (113) ابوجندل کو جو کہ سہیل بن عمرو کے بیٹے تھے جو کہ حدیبیہ کے معاہدے میں مکہ کی طرف سے متعین کردہ فریق تھے، وہ مکہ سے بھاگ نکلے۔ اگرچہ معاہدے کے تحت آپ نے انہیں واپس کر دیا لیکن وہ واپسی کے وقت ان سے فرار ہو کر میدان بدر کی ایک خفیہ گھاٹی عیص پر مقیم ہو گئے۔ حضرت ابوبصیر بھی ان سے وہیں آ کر ملے۔ اس مقام پر انہوں نے قریش مکہ کے تجارتی قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا اور ان کے کئی

افراد کو قتل کر ڈالا۔ ان کاموں کو دیکھ کر مکہ مکرمہ کے اور مجبور مسلمان بھی فرار ہو کر ان سے مقام عیص پر آ کر ملے۔ اس طرح ان کی تعداد ستر (70) کے قریب ہو گئی اور ان کی طاقت نے قریش مکہ کے قافلوں کا ادھر سے گزرنا محال کر دیا۔ یہ دیکھ کر کفار مکہ نے یک طرفہ واپسی کی اس دفعہ کو منسوخ کر دیا اور مقام عیص کے مجبور مسلمان مدینہ منورہ آ گئے۔ اس معاہدہ کے تحت خیبر کے یہودیوں نے کفار مکہ کی امداد سے محروم ہو کر اسلامی ریاست کی اطاعت قبول کر لی۔ کفار مکہ اور یہودیوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حضور نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر مسلم حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لئے سفیر اور خطوط بھیجے۔ معاہدہ حدیبیہ فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ مکہ معظمہ فتح ہو جانے کے بعد آپ نے سب سے پہلے مضافاتی عرب قبائل سرداروں سے تعلقات قائم کئے کیونکہ یہ عرب قبائل سردار' ایک آزاد ریاست کے حکمران کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ قبائلی سردار، سرارانِ مکہ سے کسی طرح کم طاقتور نہ تھے' اس لئے ان سے تعلقات استوار کرنا' خارجی حکمت عملی کے تحت بہت ضروری تھا۔ ان میں یمن، بحرین، عمان اور دومۃ الجندل کے غیر مسلم قبائل بہت جلد حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اسلامی ریاست کے شمال مشرق میں آباد قبائل مثلاً بنو غطفان، بنو خزاعہ، بنو سلیم اور جنوب مشرق کے بنو ہوازن ایرانی حکومت کے زیر تسلط ہونے کی بنا پر تذبذب کا شکار تھے۔ آپ نے ان کے ساتھ بھی معاہدات کر کے کامیاب تعلقات قائم کر لئے جو کہ آپ کی فہم و فراست اور خارجی حکمت عملی کا بیّن ثبوت ہیں۔

یہودیوں کے ساتھ تعلقات

حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کے یہودی قبائل جو کہ شام سے یمن اور عمان تک پھیلے ہوئے تھے' ان کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات قائم کئے۔ یہودیوں نے دفاعی قلعے تعمیر کر رکھے تھے۔ خیبر اُن کا مرکز تھا۔ بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنو نضیر' ان میں

زیادہ طاقتور تھے لیکن یہ فطرتاً اور اخلاقاً انحطاط کا شکار تھے۔ بنو قینقاع کے یہودیوں کا یہ حال تھا کہ انہوں نے معاہدے کے باوجود شرارتاً ایک مسلمان عورت کو برہنہ کر دیا جس کی وجہ سے وہ اسلامی ریاست سے نکال دیئے گئے۔ بنو نضیر کے گھٹیا پن کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ہاں بطور مہمان بلا کر قتل کرنے کی کوشش کی۔ بنو قریظہ جن پر آپ نے بے شمار احسانات کئے تھے انہوں نے بنو نضیر کے بہکانے پر معاہدہ توڑ دیا اور بغاوت کر دی جس کے نتیجے میں وہ اپنے تجویز کردہ منصف سعد بن معاذ کے ہاتھوں (یعنی ان کے فیصلے کے مطابق) قتل ہوئے۔ یہود کے معاہدے کی خلاف ورزی ہی فتح خیبر کا سبب بنی۔ امام سرخسی کے بقول خیبر کے یہودی قریش مکہ کے حلیف تھے اور ان کے درمیان دفاعی معاہدہ تھا کہ وہ کسی ایک پر حملہ ہونے کی صورت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ (114) آپ یہودیوں کی فطرت کو جانتے تھے اس لئے آپ نے قریش مکہ کے ساتھ معاہدہ کو ترجیح دی کیونکہ وہ بت پرست ہونے کے باوجود عہد شکن نہ تھے۔ یہی معاہدہ اسلامی ریاست کی وسعت اور اسلام کی اشاعت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

جب اسلامی ریاست مدینہ منورہ کی سرحدوں کا دائرہ وسعت اختیار کر گیا اور یہ اولین اسلامی ریاست معاشی و معاشرتی اور دفاعی لحاظ سے مستحکم ہو گئی تو اس نے غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات استوار کرنے کی طرف قدم بڑھایا اور ان کے ساتھ معاشی و اقتصادی اور سیاسی و دفاعی معاہدے کئے جن میں بین الاقوامی تجارتی و سفارتی اور جنگ کے قوانین متعین کئے۔ اس وقت کی غیر مسلم ریاستوں اور قبائلی سرداروں سے مختلف المیعاد معاہدات کئے۔ اہل ہجر کے مجوسیوں، اہل حنین، خیبر اور مقنا، کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ امن مصالحتی، معاشی و تجارتی اور دفاعی معاہدات کئے۔ روم و ایران اور حبشہ کے عیسائی حکمرانوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لئے سفارتی وفود بھیجے۔ تبلیغی حکمت عملی کے ساتھ خارجہ حکمت عملی پر بھی بھرپور توجہ دی۔ آپ کی کامیاب خارجہ پالیسی کی وجہ سے اسلامی ریاست کی

سرحدیں دس سال کے مختصر عرصہ میں تیس لاکھ مربع میل تک پھیل گئیں۔

قیصر روم کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی کوشش

7 ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روم وایران اور مصر وحبشہ کے حکمرانوں کی طرف اپنے پیغام کے ساتھ ایسے سفیر روانہ کیے جو ان ممالک کی زبان اور جغرافیائی حیثیت سے آشنا تھے۔ روم کا بادشاہ ہرقل تھا جو کہ ایک خودسر اور عرب باشندوں سے نفرت ہی نہیں بلکہ ان سے ملاقات کرنا بھی اپنی بے عزتی سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے ایک سردار کو محض اس لئے پھانسی دے دی کہ اس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس کی خود سری کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمان سفیر کو قتل کرنے والوں کو پناہ دے رہا تھا۔ ہرقل کی حکومت کا دائرہ اثر عرب قبائل تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح ایرانی حکومت کا دائرہ کار عرب کے مضافات اور اندرون عرب تک وسیع تھا۔ آپ نے ان دونوں طاقتور حکمرانوں کو دعوت اسلام دینے اور ان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے سے پہلے انہیں دعوتی خطوط لکھے۔

پہلا خط حارث بن ابی شمیر کو لکھا دوسرا خط ان کے جانشین حکمران جبلہ بن الایہم کو تحریر کیا۔ دمشق کے مضافاتی معروف شہر بصریٰ کے حکمران کی طرف سیدنا حارث بن عمر الازدی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ (بصریٰ میں رومیوں کا مضبوط قلعہ تھا اور یہ ریاست بازنطینیوں کے تسلط میں تھی۔ یہاں بہت بڑا کلیسا تھا' جس کا راہب بحیرہ تھا۔ یہ وہی بحیرہ راہب ہے جس نے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی برحق ہونے کی بشارت دی تھی) بصریٰ کے حاکم شرجیل ابن عمرو غسانی نے اسلامی ریاست کے اس سفیر اوّل کو شہید کر ڈالا۔ سفیر کا قتل بین الاقوامی اصولوں کے خلاف تھا۔ آپ نے ہرقل سے قتل سفیر کا تاوان طلب کیا لیکن ہرقل نے مثبت جواب دینے کی بجائے اس قاتل کو پناہ دے دی۔ جس کے نتیجہ میں قیصر روم ہرقل اور مسلمانوں کے درمیان موتہ کے مقام پر زوردار معرکہ ہوا۔ اسی جنگ میں سیدنا زید بن حارث، سیدنا جعفر الطیار ابن ابی طالب بحیثیت سپہ سالار شہید ہوئے اور ان کے بعد

سیدنا خالد بن ولید نے اسلامی فوج کی کمانڈ سنبھالی۔ اسی جنگ میں سیدنا خالد بن ولید کے ہاتھوں نو (9) تلواریں ٹوٹ گئیں اور آپ نے بڑی بہادری سے دشمن کی ایک لاکھ فوج کو پسپا کر دیا۔ 9 ہجری میں شفیع معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ تیس ہزار پر مشتمل لشکر جرار کو روانہ فرمایا جنہوں نے دومنہ الجندل، مقنہ، ایلہ، جرباء اور اذرح جیسی تمام رومی ریاستوں پر قبضہ کر کے وہاں مساجد تعمیر کیں۔ عرب کا شمالی حصہ اور فلسطین کا جنوبی حصہ مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ ان فتوحات میں ایلہ کی تسخیر خاص اہمیت کی حامل تھی۔ 9 ہجری کے بعد سیدنا اسامہ بن زید کی کمانڈ میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس مہم کو برقرار رکھا جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا۔ اس طرح بہت جلد فلسطین تک اسلامی ریاست کا دائرہ کار پھیل گیا۔

مصر کی ریاست، رومیوں کے تسلط میں تھی، وہاں کا حکمران مقوقس تھا جو کہ قبطی النسل تھا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا صالح بن ابی تبعہ کو اس کی طرف امن وسلامتی کا پیغام بھیجا جس کا اُس نے مثبت جواب دیا۔ آپ کا یہ دعوتی خط استنبول کے عجائب گھر میں آج بھی محفوظ ہے۔ حبشہ کے نجاشی حکمران اصحم کی طرف جو کہ بازنطینیوں کی حلیف ریاست تھی اور یمن کے مضافات میں واقع تھی، اپنا سفیر بھیجا۔ اس نامۂ مبارک کا مسودہ دمشق کی مشہور لائبریری الظاہریہ میں موجود ہے۔ نجاشی نے نامۂ مبارک کو چوم کر پلکوں پر رکھا اور اسلام قبول کر لیا۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا تعلق حبشہ سے تھا۔

ایران کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی کوشش

ایران اس عہد کی دوسری طاقتور سلطنت تھی' جس نے رومیوں کی طرح ملک عرب میں نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ حرہ اور کوفہ کے حکمران، ایرانیوں کے حلیف اور ان کے بہت معتمد ساتھی تھے مگر ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز نے حیرہ کے حکمران سے اس کی بیٹی حرم کے لئے طلب کی' لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا' جس پر شہنشاہ ایران نے اسے مدائن

میں طلب کر کے مروا ڈالا۔ عربوں کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور ایک زوردار معرکہ ذوقار کے مقام پر وقوع پذیر ہوا' جس کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس لڑائی میں عربوں کا جنگی نعرہ ''یا محمد'' تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں لکھا ہے کہ یہ 2 ہجری کی بات ہے جب مسلمان کفار مکہ سے میدان بدر میں برسر پیکار تھے۔ ایرانیوں کو اس جنگ میں بری طرح شکست ہوئی جب ان کی شکست کی خبر ریاست مدینہ منورہ میں پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ عربوں نے ایرانیوں سے انتقام لیا ہے اور انہیں یہ فتح میری وجہ سے ہوئی ہے۔ (115)

نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 7 ہجری میں شہنشاہ ایران خسرو پرویز کو تحریر فرمایا جس کا اس نے مثبت جواب نہ دیا۔ انہی دنوں ایرانیوں کو رومیوں کے ہاتھوں زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایرانی حکومت ان ہزیمتوں کی وجہ سے اندرونی خلفشار کا شکار بھی تھی۔ ایرانی شہنشاہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ امام ترمذی کی ایک روایت کردہ حدیث کے مطابق ایرانی ملکہ نے ان حالات میں تحفے تحائف کے ساتھ ایک سفارت ریاست مدینہ منورہ کے والی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ارسال کی جس کا مقصد شہنشاہ ایران کی زیادتیوں کی تلافی تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس ایرانی ملکہ کا نام ''بوران دوخت'' تحریر کیا ہے اور غالباً وہ ملکہ ریاست مدینہ منورہ سے خوف زدہ تھی۔ (116) شہنشاہ ایران کی بے ادبی اور بے رخی کی وجہ سے آپ نے اپنی خارجہ حکمت عملی کا رخ عرب نو آبادیاتی ریاستوں کی طرف موڑ دیا جو کہ یمن، عمان اور بحرین پر مشتمل تھیں۔ اہل یمن نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ آپ نے سیدنا علی اور سیدنا خالد بن ولید کو سفیر بنا کر وہاں بھیجا۔ یمن کے معروف گورنر باذان نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے تعلقات کو مضبوط کرنے کے لئے باذان کی ولایت کو برقرار رکھا۔ یمن کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنے کے لئے آپ نے سیدنا ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کو وہاں کا

چیف جسٹس بنا کر بھیجا جو یمنی النسل ہونے کے ناطے وہاں کے حالات کو بہتر سمجھتے تھے۔ سیدنا معاذ بن جبل کو ناظم تعلیمات بنا کر وہاں تعینات فرمایا جنہوں نے یمن کے تعلیمی نظام کو بہت بہتر بنا دیا۔ بنو نجران کا عیسائی وفد اپنے پادری کی رہبری میں بارگاہ نبوی میں مدینہ منورہ پہنچا تا کہ مناظرہ کر کے اپنے موقف کو ثابت کر سکے کہ عیسائی مذہب برحق ہے۔ یہ مذاکرات مسجد نبوی میں شروع ہوئے۔ ابھی بحث و تمحیص جاری تھی کہ بنو نجران کے عیسائیوں کی عبادت کا وقت آ گیا۔ انہوں نے اپنے مقام رہائش پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تا کہ وہاں جا کر اجتماعی عبادت کر سکیں۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل نجران کے ارادے کو جان کر فرمایا اگر آپ پسند کریں تو اپنی اجتماعی عبادت اسی مسجد میں کر سکتے ہیں۔ نجران کے عیسائیوں نے اپنی صلیب نکالی اور مشرق کی طرف رخ کر کے وہیں عبادت کی۔ اس کے بعد آپ نے انہیں معاہدہ کی دعوت دی جس پر انہوں نے خراج دینا قبول کیا اور صلح پر تیار ہو گئے۔ صلح نامہ تحریر ہوا جسے سیدنا ابوبکر صدیق نے بھی برقرار رکھا۔ (117)

ریاست عمان کے ساتھ تعلقات

عرب کے جنوب مشرق میں عمان کی ریاست واقع تھی جس پر جلندیٰ کے دو بیٹوں، جیفر اور عبد کی مشترکہ حکومت تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر وہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ عمان معاشی و تجارتی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی بندرگاہیں بین الاقوامی تجارتی حیثیت رکھتی تھیں۔ سالانہ میلوں پر مختلف ممالک سے تجارتی قافلے شریک ہوتے تھے۔ قبیلہ بنو قیس نے بھی اپنا وفد، آپ کی خدمت اقدس میں بھیجا جس نے براہ راست آپ سے مذاکرات کئے جو کہ بہت کامیاب رہے۔ دبا اور مشقر کے مقامات سالانہ تجارتی میلوں کے لئے بین الاقوامی کشش رکھتے تھے۔ دبا عرب کی دوسری دو بڑی بندگاہوں میں سے ایک تھی۔ اس کے تجارتی میلہ میں محض عرب کے قبائل ہی نہیں بلکہ ہند، سندھ، چین اور مشرق و مغرب کے ممالک تجارتی وفود بھیجتے تھے۔ ان ریاستوں کے

ساتھ آپ نے اپنے تعلقات کو مضبوط کیا اور وہاں کے ایک مقامی مسلمان کو دبا کا گورنر مقرر کیا۔ (118) بحرین کی ریاست، جزیرہ نما عرب کے مشرق میں واقع تھی۔ یہ سعودی عرب کے موجودہ ضلع الحساء کا علاقہ تھا جو کہ خلیج عرب و فارس سے متعلقہ تھا۔ قطر کی موجودہ ریاست بھی اس وقت کے بحرین میں شامل تھی۔ بحرین کا گورنر منذر بن ساوہ تھا جو عربی النسل تھا۔ آپ نے انہیں دعوت اسلام دی جو کہ اس نے قبول کی۔ منذر کو آپ نے نصف درجن سے زائد خطوط لکھے جو کہ برلن سے شائع ہو چکے ہیں۔ (119)

اہل حیرہ سے تعلقات

عرب کے شمال مشرق مین قبیلہ بنو تمیم آباد تھے جو کہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اس کے آگے جنوبی عراق میں حیرہ (موجودہ کوفہ) کی ریاست تھی، جہاں عربی النسل لوگ مقیم تھے۔ اس کے ساتھ ہی دریائے دجلہ کے کنارے مدائن میں کسریٰ کا محل تھا جسے دار الخلافہ کی حیثیت حاصل تھی۔ سماوہ کی ریاست کے جنوب میں مشرق میں واقع تھی۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نامہ مبارک سماوہ کے حکمران تعاشہ الدیالی کو تحریر فرمایا۔

ہندوستان کے ساتھ تعلقات

بعض روایات کے مطابق عہد نبوی میں بعض صحابہ ہندوستان کا سفر بھی اختیار کر چکے تھے۔ یمن کی حکومت کے ساتھ ہندوستانی تاجروں کے مضبوط تعلقات تھے۔ جب یمن کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستانی نظر آتے ہیں۔ (120) سیدنا ابو ہریرہ جو یمنی النسل تھے، اکثر کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں ایک مہم ہندوستان ضرور روانہ کروں گا۔ اگر میں وہاں شہید ہو جاؤں تو بہترین شہیدوں میں سے ہوں گا اور اگر غازی بن کر لوٹوں تو میں وہی آزاد کردہ غلام ابو ہریرہ رہوں گا۔ (121) تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور حدیث بھی مروی ہے کہ مجھے ہندوستان سے

تازہ ہوا آتی ہے۔(122) غلام علی آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان اور تحقیقی مقالہ "شَمَامَۃُ الْعَنبرِ فِیْ مَا وَرَدَ عَنِ الْھِنْدِ عَنْ سَیِّدِ الْبَشَرِ" میں لکھا ہے کہ ہند کے مغربی ساحلی علاقہ "مالابار" میں چکرورتی فرماس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تو اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کر کے مکہ کا رخ کیا۔ مکہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی برحق ہیں جنہوں نے معجزے کے طور پر چاند کو دو ٹکڑے کیا ہے۔ چنانچہ اس نے آپ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا اور واپس ہندوستان روانہ ہو گیا لیکن راستے میں یمن کی بندرگاہ ظفار کے نزدیک اس کا انتقال ہو گیا۔ یہاں اس کی قبر آج بھی موجود ہے جسے لوگ ہندوستانی بادشاہ کے مزار کے نام سے جانتے ہیں اور فاتحہ خوانی کے لئے حاضری دیتے ہیں۔ زین الدین المعبری نے اپنی تصنیف تحفۃ المجاہدین میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی اہل ہند میں سے ایک ہندی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ابن حجر نے رتن ہندی اور سرباتک ہندی کا تذکرہ اپنی معروف تصنیف الاصابہ میں کیا ہے کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست اقدس پر اسلام قبول کیا اور طویل عمر پا کر فوت ہوئے۔ (123) ہندوستان کی طرف، ترکستان کے ایک شخص مقلاب ابن ملکان الخوارزمی (م 311ھ) نے بھی صحابی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔(124)

چین کے ساتھ تعلقات

چین کے باشندوں سے بھی شفیع الامم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اہل چین کے تجارتی میلے میں آیا کرتے تھے۔ چونکہ اہل چین کئی ماہ کی طویل سمندری مسافت بڑی ثابت قدمی سے طے کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اسی لئے آپ نے فرمایا تھا کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ غالباً یہ اس لئے تھا کہ آپ ان کی ثابت قدمی سے متاثر ہوئے تھے۔ مسعودی نے اہل چین

کے تجارتی قافلوں کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے کہ وہ اپنے سامان تجارت کے ہمراہ بحرین اور عمان کی بین الاقوامی تجارتی منڈیوں میں آیا کرتے تھے۔ (125) قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینت نے چین کے بادشاہ کی طرف سیدنا ابوعبیدہ کو سفیر اسلام بنا کر بھیجا تھا' جس کی تصدیق تاریخ چین کرتی ہے۔ سیدنا ابوعبیدہ نے غالباً دوسری دفعہ بھی چین کا سفر کیا تھا کیونکہ آپ کا مقبرہ چین کے شہر سنگاتو میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔ (126)

خلفاء راشدین

مسلم ریاست کے خارجی اصول اور قواعد وضوابط تو ریاست کے بانی خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضع کر دیئے تھے تاہم اس کو وسعت خلفائے راشدین کے دور خلافت میں ملی۔ سیدنا زید بن علی بن امام حسن رضی اللہ عنہ (م 120ھ) نے سب سے پہلے مجموعہ فی الفقہ کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جس میں کتاب السیر کے نام سے ایک باب باندھا جو بین الاقوامی قوانین پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد سیدنا ابوحنیفہ نے کتاب السیر کے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی۔ بعدازاں ان کے شاگردوں میں سے امام ابویوسف، امام محمد، امام زفر اور امام ابراہیم نے اسی موضوع پر مفصل کتابیں تحریر کیں۔ امام اوزاعی، امام واحدی اور ابن حجر عسقلانی نے بھی اس موضوع پر لکھا۔ امام شافعی کی کتاب الام اس موضوع پر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ (127) ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی حالت امن اور حالت جنگ میں غیر جانبدارانہ قواعد پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ وہ غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے خواہاں ہوتے تھے۔ مسلم ریاستوں اور غیر مسلم ریاستوں کو ایک اکائی ماننے کی بجائے ان سے الگ

تعلقات استوار کرنے کے خواہش مند ہوا کرتے تھے۔ امام سرخسی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

اِنَ اَھْلَ الْحَرْبِ اَھْلَ دُوْرٍ بِاِ خْتِلَافِ الْمَنْعَاتِ لَھُمْ

غیر مسلم ریاستوں سے اپنی قوت مزاحمت کی بناء پر تعلق رکھتے ہیں۔ (128)

خلفائے راشدین کے دور تک ایک ہی اسلامی ریاست تھی جب اسلام کا حلقہ سمرقند، بخارا اور کاشغر تک پھیلا تو ایک سے زائد کئی اسلامی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں 13ھ تک ریاست مدینہ منورہ کی جغرافیائی حدیں، ایران، شام، انبار اور اجنادتک پہنچ گئیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو دنیا کی دو بڑی طاقتور سلطنتیں روم اور ایران زیر نگیں ہوگئیں۔ بیت المقدس اور مصر پر بھی مسلمان قابض ہو گئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان مقبوضہ مملکتوں کے ساتھ امن وسلامتی اور جان و مال کی حفاظت کے ساتھ مذہبی آزادی کے معاہدات کئے۔ مقبوضہ ممالک کے شہریوں کی عبادت گاہوں اور ان کی جان و مال کی حفاظت کے امان نامے جاری کئے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ بکر بن وائل کے قبیلے کے ایک فرد نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر ڈالا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حکم جاری فرمایا کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ قاتل جس کا نام حقین تھا، اسے مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا گیا اور انہوں نے قاتل کو قتل کر ڈالا۔ (129) 20ھ میں جب سیدنا عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک تحریری امان نامہ لکھ کر بھیجا اور مصر کے پیٹریارک کو ان کے عہدے پر بحال کر دیا۔ (130) کلیساؤں کے اوقاف بحال کئے اور پادریوں کے وظائف مقرر کر دیئے۔ (131) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان نئی مقبوضہ مملکتوں سے تعلقات بہتر بنانے کے لئے وہاں کے غیر مسلم شہریوں کو جان و مال اور مذہب کی آزادی کے ساتھ انہیں خراج کی ادائیگی میں بھی سہولت دی۔ ایک بار جزیہ کا مال زیادہ آ گیا

تو اس کی اچھی طرح چھان بین کی کہ کہیں یہ زائد مال ظلم کے ساتھ تو وصول نہیں کیا گیا۔(132) جب کبھی خراج کی وصولی میں تاخیر ہو جاتی تو اس کا بھی احتساب کرتے۔ ایک بار سیدنا سعید بن عبدالعزیز سے باز پرس کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ نے خراج کی رقم بیت المال میں تاخیر سے کیوں جمع کرائی۔ جناب سعید نے جواباً عرض کی کہ آپ کا فرمان ہے کہ کاشتکاروں سے چار دیناروں سے زائد وصول نہ کئے جائیں۔ ان کی فصلوں کو پکنے میں دیر تھی۔ میں نے انہیں فصلوں کے کٹنے تک مہلت دے دی۔ یہ سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا'' کہ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں اس عہدے پر بحال رکھوں گا''۔(133)

مصر کے گورنر سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو آپ نے یہ ہدایت فرمائی کہ عیسائیوں کے گرجاؤں کے ساتھ قیمتی اراضی منسلک ہے، انہیں بحال رکھا جائے۔(134)

سیدنا ابوعبیدہ بن جراح جب شام کی فتوحات میں مصروف تھے تو اس وقت روم کے بادشاہ ہرقل نے مسلمانوں پر حملے کے لئے لشکر جرار جمع کیا۔ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے حکم جاری کیا کہ ملک شام کے تمام غیر مسلموں کا جزیہ واپس کر دیا جائے کیونکہ یہ رقم ہم آپ کی حفاظت کے لئے لیتے تھے۔ اب ہمارے علم میں آیا ہے کہ قیصر روم لشکر جرار کے ساتھ عساکر اسلام پر حملہ آور ہو رہا ہے تو ہو سکتا ہے ہم آپ کی حفاظت نہ کر سکیں اس لئے' ہم نے آپ سے جو جزیہ لیا ہے' وہ واپس کر دیا ہے۔ اگر ہم نے قیصر روم پر کامیابی حاصل کر لی تو آپ کے ہمارے درمیان معاہدہ جاری رہے گا۔ شام کے عیسائی' مسلمانوں کا یہ رویہ دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ اللہ ہم پر تمہاری حکومت کو قائم رکھے اور رومیوں پر تمہیں فتح عطا کرے کہ تم بہت اچھے حکمران ہو۔ اگر ہمارے ہم مذہب رومی ہم پر حکمران ہوتے تو ہمیں کچھ واپس نہ کرتے بلکہ جو ہمارے پاس ہوتا وہ بھی لے لیتے۔(135) حاکم مصر کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے لئے خراج کی ادائیگی میں نرمی کی اور سیدنا عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ خراج کے معاملے میں لوگوں کو شامل کرو۔

"سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے 20ھ میں سرس کا محاصرہ کیا تو شہنشاہ ایران یزدگرد نے اپنے ایک سپہ سالار کو مقابلے کے لئے بھیجا لیکن وہ مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور چند شرائط کے ساتھ سیدنا ابوموسیٰ سے صلح کی درخواست کی۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعری مشروط صلح پر رضامند نہ ہوئے لیکن اس واقعہ کی اطلاع سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بھجوادی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تمام شرائط منظور کرتے ہوئے صلح نامہ لکھ دیا اور اس کے ساتھ گرفتار افسران' جن میں معروف سپہ سالار' شہریار' شرویہ شامل تھے انہیں بصرہ میں رہنے کی اجازت دے دی اور ان کی باقاعدہ تنخواہ بھی مقرر کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام فوجی سردار مسلمانوں سے تعاون پر تیار ہو گئے۔ ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حسن سلوک کی وجہ سے ان افسران نے مسلمانوں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور بعد میں تستر کا معرکہ ان افسران بالخصوص سیاہ کی تدبیر سے سر ہوا۔ (136)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب ایرانی بادشاہ یزدگرد کے لشکر کو مقام سوس پر شکست دی تو ان کے لشکر میں سندھ کے جاٹ بھی شامل تھے۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ اہل عرب انہیں زط کہتے تھے۔ سوس کی فتح کے بعد یہ مشرف بہ اسلام ہو کر بصرہ میں آباد ہوئے۔ (137)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ اسلامی لشکر میں غیر مسلم بھی شامل تھے اور برابر کے حقوق رکھتے تھے۔ (138) آپ غیر مسلم ذمیوں سے باقاعدہ مشاورت کرتے تھے۔ عراق کے بندوبست میں عجمیوں سے مشورہ کیا۔ مصر کے انتظام و انصرام میں مقوقس کی رائے کو اہمیت دی۔ (139) آپ کے دور خلافت میں اسلامی ریاست کی سرحدیں ایشیائے کوچک تک پہنچ چکی تھیں۔ عراق و ایران اور مصر و شام زیر نگیں ہو چکے تھے۔ اتنی بڑی سلطنت میں کہیں نہ کہیں بغاوت سر اٹھاتی رہتی لیکن آپ بڑے صبر و تحمل سے اس کو دبا دیتے۔ بغاوت کچلنے کے بعد عام معافی کا اعلان فرما دیتے۔ اگر پھر بھی وہ باز نہ آتے تو شہر چھوڑنے کا حکم صادر فرما دیتے تاہم ان کے جان و مال سے تعرض نہ

فرماتے۔(140) آپ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو آپ نے وصیت نامہ لکھوایا کہ میں ان لوگوں کے متعلق تمہیں وصیت کرتا ہوں جنہیں اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ دیا گیا ہے۔ان سے جو معاہدہ ہوا ہے اسے ہر حال میں قائم رکھا جائے اور اس معاہدے کی حمایت میں لڑا جائے اور انہیں ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔(141) مذہبی رواداری کی یہ عظیم مثال کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد 24ھ تا 35ھ میں اسلامی سلطنت بہت زیادہ وسعت اختیار کر گئی۔ یہاں تک کہ سمندر پر بھی اسلامی فوجیں راج کرنے لگیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد آپ خلیفہ مقرر ہوئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو نصیحت فرمائی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمیوں کی دیکھ بھال تمہیں سونپتا ہوں۔ان کے ساتھ جو معاہدے ہوئے ہیں انہیں قائم رکھا جائے اور بیرونی دشمنوں سے ان کی حفاظت کی جائے اور ان کی طاقت سے بڑھ کر ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔(142) حضرت عثمان غنی فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم میں نے ان پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈالا بس رفاہِ عامہ کے لئے ان سے تھوڑا بہت وصول کیا۔(143) آپ نے اہم انتظامی امور میں غیر مسلموں کو بھی شامل کیا۔(144)

نجران کے عیسائیوں کے متعلق کوفہ کے گرنر ولید بن عقبہ کو لکھا کہ ان کے اکابرین مجھ سے ملے ہیں اور اپنی مشکلات و تکالیف میرے سامنے بیان کی ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تحریر کردہ معاہدہ بھی مجھے دکھایا ہے جس میں یمن کی متروکہ جائیداد کے عوض عراق و شام میں انہیں اراضی دینے کا عدہ موجود ہے۔ان پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں انہیں آپ جانتے ہیں اور یہ زیادتیاں مسلمانوں کی طرف سے ہو رہی ہیں۔ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ان کے جزیہ میں سے تیس فیصد چھوڑ دیا ہے۔اس کے ساتھ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ عہد کے تحت انہیں اراضی عطا کی جائے اور مسلمانوں کو تنبیہ کی جائے کہ وہ نجرانیوں کے

ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئیں جو کہ ہماری ذمہ داری ہے۔ جو تحریر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں لکھ کر دی تھی اسے خود پڑھو اور اس پر عمل کرو اور اس معاہدے کو پڑھنے کے بعد انہیں واپس کر دو تا کہ وہ معاہدہ ان کے پاس محفوظ رہے۔ (145) حضرت عثمان غنی کے عہد خلافت میں اہل توبہ کے ساتھ کیا گیا معاہدہ تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ یہ معاہدہ عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے تحریر کیا تھا جس کا مفہوم و مضمون کچھ اس طرح ہے:

"اے اہل توبہ تم اب اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں ہو۔ نہ ہم تمہارے ساتھ جنگ کریں گے اور نہ ہی تمہیں خوفزدہ کرنے کیلئے فوج لائیں گے۔ ہماری طرف سے چند شرائط ہیں کہ تم اگر اسلامی بستیوں سے گزرو تو بغیر اقامت اختیار کیے آگے نکل جاؤ۔ اسی طرح اگر ہم آپ کی بستیوں سے گزریں گے تو بغیر stay کے آگے نکل جائیں گے۔ دونوں فریق اس دوران ایک دوسرے کی جان و مال کی حفاظت کے پابند ہوں گے۔ اگر کسی مسلمان کا کوئی غلام بھاگ کر تمہارے پاس آ جائے تو تم اسے واپس کر دو گے۔ مسلمانوں نے جو مساجد تمہارے علاقے میں تعمیر کی ہیں تم ان کی حفاظت کرو گے۔ 360 غلام جزیہ کے طور پر مسلمانوں کو پیش کرو گے۔ ان شرائط کی خلاف ورزی کی صورت میں معاہدہ ختم سمجھا جائے گا"۔ (146)

خلفاء راشدین کی مذہبی رواداری اور غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ غیر مسلم بھی اس کی مثال دیا کرتے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مرو کے بطریق نے ایران کے اسقف اعظم کو ایک خط لکھا جس کا متن کچھ اس طرح ہے:

"عرب، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بادشاہی عطا کی ہے وہ عیسائی مذہب پر حملہ نہیں کرتے بلکہ ہمارے مذہب کی حمایت کرتے ہیں۔

ہمارے پادریوں اور خداوند یسوع مسیح کی عزت کرتے ہیں۔ گرجاؤں اور خانقاہوں کے لئے عطیات دیتے ہیں"۔ (147)

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ "سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم ایک بار قاضی شریح کی عدالت میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں پیش ہوئے۔ مقدمہ کا فریق ایک ذمّی تھا۔ قاضی شریح، سیدنا علی کو عدالت میں پا کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ سیدنا علی نے فرمایا: یہ تمہاری پہلی ناانصافی ہے، تم عدل کیسے کرو گے"۔ (148)

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے دور خلافت میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ آپ نے قاتل کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ مقتول کا بھائی یہ انصاف دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور حاضر خدمت ہو کر کہا کہ میں قتل معاف کرتا ہوں۔ آپ نے مقتول کے بھائی سے فرمایا: کہیں ایسا تو نہیں کہ ان لوگوں نے تجھے ڈرایا ہو اور تو یہ بیان مجبوراً دے رہا ہو۔ اس شخص نے عرض کی: نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں نے مجھے خوں بہا ادا کر دیا ہے اور پھر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آئے گا۔ آپ نے قاتل کو چھوڑ دیا اور فرمایا:

مَنْ كَانَ لَهُ ذِمَّتُنَا فَدَمُهُ كَدَمِنَا وَدِيَتُهُ كَدِيَتِنَا۔ (149)

جو ہمارا ذمی ہے اس کا خون ہمارے خون کی مانند ہے اور اس کی دیت ہماری دیت کی مانند ہے۔

ملک ایران کے ساتھ آپ نے بہت اچھے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ ایرانی آپ کے حسن سلوک کی وجہ سے برملا کہا کرتے تھے کہ اس عربی نے نوشیرواں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ (150)

قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں کہ غیر مسلم ذمیوں نے مسلمانوں کے حسن سلوک اور وفاداری سے متاثر ہو کر وہ مسلمانوں کے دشمنوں کے دشمن بن گئے۔ (151)

اموی وعباسی عہد حکومت اور غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات

خلفاء راشدین کے دور خلافت کے بعد امویوں اور عباسیوں نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ اس حسن سلوک کو جاری رکھا۔ حضرت معاویہ 40ھ تا 48ھ کے عہد امارت میں غیر مسلموں کو ذمہ دار عہدے عطا کئے گئے۔ ابن آثال نصرانی کو حمص کا کلکٹر اور سرجون بن منور رومی کو کاتب کے اہم عہدے پر مأمور کیا گیا۔(152) خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد کا مشہور واقعہ ہے کہ جب انہوں نے جامع مسجد دمشق کو وسعت دی تو عیسائیوں کے ملحقہ گرجے کو اس میں شامل کر لیا۔ دمشق کے نصرانیوں کو خطیر رقم بطور معاوضہ پیش کی لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ تب ولید بن عبدالملک نے گرجا مسمار کر کے مسجد میں شامل کر دیا۔ جب سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو آپ نے معاملے کی تحقیق کے بعد مسجد کا وہ حصہ عیسائیوں کو واپس کرنے کا حکم دے دیا۔ اہل دمشق سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچے کہ ہم زمین کے اس ٹکڑے پر کئی نمازیں با جماعت ادا کر چکے ہیں لہٰذا اسے واپس نہ کیا جائے لیکن آپ نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا یہاں تک کہ مسلمانان دمشق نے عیسائیوں کو معاوضہ دے کر راضی کر لیا اور انہیں سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں لے گئے۔ ان کی رضا مندی کے بعد خلیفۃ المسلمین نے مسجد کے اس حصہ کو گرانے کا اپنا حکم واپس لے لیا۔(153)

انسانی تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے غیر مسلموں کے ساتھ کس طرح سلوک کیا اور ان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں کس حد تک حسن اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنی مملکت کے تمام گورنروں کو حکم دے رکھا تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ اپنے رویے درست رکھو اور جس کے ذمہ کسی ذمّی کی کفالت ہے وہ مرتے دم تک اس ذمہ داری کو نبھائے۔ اِن کے خون کو مسلمانوں کے خون کے برابر سمجھو۔ حیرہ کے ایک مسلمان قاتل، جس نے ایک غیر مسلم کو قتل

کیا تھا، آپ نے حکم جاری کیا کہ اسے مقتول کے ورثاء کے حوالے کردو۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان قاتل کو غیر مسلم مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا گیا اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ (154) عباسی حکمرانوں میں ابوجعفر منصور 136ھ تا 158ھ اور مہدی 158ھ تا 169ھ کے عہد حکومت میں غیر مسلموں کو اتنے اہم عہدوں پر مأمور کیا گیا کہ عوام الناس نے تنگ آ کر انہیں ہٹانے کی اپیل کی۔ ہارون الرشید 170ھ تا 193ھ نے عیسائیوں کے گرجا گھروں اور ان کے پادریوں کو مراعات کے ساتھ ان پر خراج اور جزیہ بھی معاف کر دیا۔ (155) ایک عباسی نامور جرنیل کو صرف اس لئے معزول کر دیا گیا کہ وہ غیر مسلموں کی تحقیر کا مرتکب ہوا تھا۔ (156) مامون الرشید 198ھ تا 218ھ تو تاریخ انسانی میں اس حوالے سے بہت روشن خیال سمجھا جاتا ہے۔ روم اور ایران کے ساتھ اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ان کے دور میں بے شمار یونانی و ایرانی اور دیگر مذاہب کی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ ان کی حکومت میں عیسائیوں کے تقریباً گیارہ سو (100) گرجا گھر یہودیوں کے سینکڑوں صومعہ اور زرتشتیوں کے آتش کدے تھے جہاں وہ آزادی سے عبادت کرتے تھے اور اُن کی اِن عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری مسلم حکومت پر تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اہم عہدوں کے علاوہ اسلامی لشکر میں بے شمار غیر مسلم اہم عہدوں پر متمکن تھے اور ان کی مجلس شوریٰ میں شامل تھے اور یہ روشن خیال مسلم حکمران ان کے تمام حقوق کا تحفظ کرتا تھا۔ (157)

عہد بنو فاطمہ

عہد بنو فاطمہ میں غیر مسلموں کو اس قدر مراعات دی گئیں کہ ابن تیمیہ نے ان کے اس فیاضانہ سلوک پر سخت تنقید کی جس میں انہوں نے اسلامی قواعد وضوابط کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ عہد بنو فاطمہ میں غیر مسلموں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کا یہ عالم تھا کہ قاہرہ میں جو ان کا وزیر ہوا کرتا تھا وہ کبھی یہودی ہوتا تو کبھی عیسائی ہوتا۔ ان کی

وزارت کی وجہ سے یہودیت اور عیسائیت جڑ پکڑ گئی۔(158) ابن تیمیہ اور عہد بنی فاطمہ کی تنقید اپنی جگہ لیکن ایک بات جو فاطمی حکومت کے حق میں جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی مذہبی رواداری اور حسن اخلاق کے نقوش غیر مسلموں کے قلوب پر بٹھا دیئے۔ مقتدر باللہ 295ھ تا 320ھ نے یہود و نصاریٰ کے وہ گرجے دوبارہ تعمیر کرانے کا حکم دیا جنہیں ایک ہنگامے میں مسلمانوں نے گرا دیا تھا۔(159) آرنلڈ نے Preaching of Islam میں لکھا ہے کہ خلیفہ معتصم باللہ نے ایران کے آتش پرستوں کے آتش کدوں کو تحفظ فراہم کرنے کا خاص اہتمام کیا یہاں تک کہ ایک مسلمان سپہ سالار نے معتصم باللہ کے حکم پر ایک امام مسجد کو محض اس لئے کوڑوں کی سزا دی کہ اس نے ایک شہر میں ایک آتش کدہ مسمار کر کے اس کی جگہ ایک مسجد تعمیر کر دی تھی۔(160)

برعظیم ہند اور مسلم معاشرہ

دوسری صدی ہجری میں برعظیم ہند اسلام کی روشنی سے منور ہوا۔ محمد بن قاسم کے حسن سلوک نے ہندوؤں کو بہت متاثر کیا۔ انہیں وہ تمام حقوق دیئے جو اسلام میں فقط اہل کتاب کا حق بنتا ہے مشرکوں کا نہیں۔ ڈاکٹر تارا چند نے محمد بن قاسم کے اخلاق حسنہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ ہندو پجاریوں کو مذہبی آزادی دی۔ جزیہ میں نرمی کی۔ برہمنوں کا جزیہ معاف کیا اور ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے عطا کئے جو کہ ان کی مذہبی رواداری کا بیّن ثبوت ہے۔(161)

سلطان محمود غزنوی جس نے سومنات کے بتوں کو پاش پاش کیا تھا انہوں نے اپنے حسن اخلاق سے ہندو سرداروں کے دل موہ لئے یہاں تک کہ ہندوؤں نے اسلامی لشکر میں شامل ہو کر وسطی ایشیاء کے کئی معرکوں میں بے جگری سے حصہ لیا۔ ان ہندو سرداروں میں سویندرائے، تلک اور ناتھ خاص شہرت کے حامل ہیں۔(162)

سلاطین دہلی 1186ء تا 1526ء کے عہد میں غیر مسلم اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

انہیں معاشی اور معاشرتی حقوق عطا کیئے گئے۔ (163) مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے ہندوؤں کے ساتھ بہت روادارانہ سلوک کیا۔ مذہبی اختلاف کی وجہ سے کسی کا خون نہیں بہایا۔ مغل بادشاہ اکبر کی مذہبی رواداری تو حد سے بھی تجاوز کر چکی تھی۔ اس نے ہندو عورتوں سے صرف شادیاں ہی نہ کیں بلکہ ان کی بے شمار رسومات اپنالیں۔ ہندو سرداروں کو اسلامی لشکر کی کمان سونپی، انہیں اعلیٰ عہدے عطا کیئے۔ انہیں جزیہ معاف کیا اور انہیں وہ مقام دیدیا جو مسلمانوں کو اسلامی معاشرے میں حاصل تھا۔ (164) شہنشاہ نور الدین جہانگیر نے بھی اپنے باپ کی روش کو جاری رکھا۔ ہندوؤں کے ساتھ، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے غیر مسلموں کو بھی برابر کے حقوق عطا کیئے۔ ہندوؤں کے دل رکھنے کے لئے ان کے تہواروں میں شرکت کرتا، ان کی ہندووانہ رسومات کا احترام کرتا، انہیں اعلیٰ ملازمتیں عطا کرتا یہاں تک کہ ان کے ہاں دیوالی کی پوجا کا دربار ہوتا اور وہ آفتاب کے برج عقرب میں داخل ہونے پر ایک ہزار تولہ چاندی اور ایک ہزار روپے خیرات کرتا۔ ہندوؤں کے راکھی بندھن کا تہوار مناتا اور اپنی کلائیوں پر راکھی بندھواتا۔ (165)

شہاب الدین شاہجہاں نے بھی ہندوؤں سے جزیہ نہ لیا۔ ہندوستانیوں اور جوگیوں کو احترام دیا۔ (166) اورنگ زیب عالمگیر ان کے فیصلے کیا کرتے۔ (167)

مغل عہد مذہبی رواداری کے اعتبار سے تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ پاکستان جسے عصر حاضر میں اسلام کا قلعہ کہا جاتا ہے اس کے بانی قائداعظم محمد علی جناح نے بھی اپنے اسلاف کے طریقہ کار کو اپناتے ہوئے غیر مسلموں سے بہت اچھے تعلقات استوار کیئے۔ اپنے ملک کے اندر اقلیتوں کو ان کے مکمل حقوق دیئے۔ اگرچہ اس کے باوجود کہ انہوں نے تشکیل پاکستان میں نہ صرف یہ کہ رکاوٹیں پیدا کیں بلکہ ظلم کی بھی انتہا کر دی تھی تاہم انہوں نے فرمایا ''غیر مسلموں سے انتقام نہ لینا، میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کو ہر مقام پر سخت نقصان پہنچا ہے اور اب تک پہنچ رہا ہے''۔ (168)

قائداعظم کے عہد سے لے کر لمحۂ موجود تک کی تاریخ شاہد ہے کہ پاکستان نے غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کیا ہے اور پاکستان میں تمام غیر مسلموں کو مذہبی آزادی کے ساتھ وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کہ ایک مسلمان کو حاصل ہیں۔

Dc Gobineau ایک غیر مسلم سکالر ہیں، وہ اسلام کی مذہبی رواداری سے متاثر ہو کر واضح الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں کہ ''اسلام جیسا کوئی اور مذہب روادار اور ایسا صلح جو نہیں نظر آتا جس نے دوسرے مذہب والوں کو اس قدر مذہبی آزادی دی ہو۔ رواداری مسلمانوں کا خاصہ ہے اور مذہبی آزادی ان کے مذہب کا دستور العمل ہے''۔ (169)

تعلقات باہمی کے لئے بین المذاہب مکالماتی ضرورت واہمیت

متذکرہ واقعات و دلائل سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس میں فکری و ثقافتی، سیاسی و سماجی اور ہمہ قسم کی مذہبی رواداری پائی جاتی ہے جو سراپا اطاعت و تسلیم ہے جس میں جبر واکراہ نام کی کوئی چیز نہیں۔ امن و سلامتی اس کا پیغام ہے۔ اس کی آغوش میں آنے والا خود بھی امن پاتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی امن کا خواہاں ہوتا ہے۔ اسلام اپنے اندر بے پناہ قوت برداشت رکھتا ہے۔

اسلام کے دستور العمل اور ضابطۂ حیات کی حقانیت کو اگر مذاہب عالم کی تعلیمات کے تناظر میں دیکھیں تو فرق نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ہندو مذہب جو دنیا کے قدیم مذاہب میں شمار ہوتا ہے اس کی تعلیمات کا خلاصہ سوامی دیانند ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ''دھرم کے مخالفین کو زندہ جلا دو، دشمن کے کھلیان اجاڑ دو''۔ (170) ہندوؤں کے ایک رہنما مہاشہ پرتاب سنگھ نے 1927ء کے ایک جلسۂ عام میں کہا تھا کہ:

> ''اگر تم ایک گائے کی خاطر کراچی سے لے کر مکہ تک تمام مسلمانوں کو ختم کر دو تو بھی کوئی بات نہیں، ہندوؤں میں جانوروں کا گوشت کھانا منع ہے لیکن مسلمانوں کا خون پینا منع نہیں۔ کسی ہندو کو ایک مسلمان کا خون لینے

میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے"۔

ہندو مذہب، اسلام کے برعکس جبراً پوجا پاٹ پر مجبور کرتا ہے۔ بلا شدھی کوئی مسلم کسی ہندو کے ساتھ تعلقات استوار نہیں کر سکتا' یہاں تک کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو مذہب نہ اختیار کرلے۔(172) مسلم ریاست اپنے اہل الذمہ کو مساوی حقوق عطا کرتی ہے جب کہ ہندوستان کا پورا کو چک ہندوؤں کا ہے جہاں وہ ہزاروں برس سے رہ رہے ہیں جب کہ مسلمان یہاں اجنبی اور غیر ملکی ہیں۔(173)

ہندو مذہب کی طرح یہودی مذہب بھی مذہبی رواداری اور تحمل و برداشت سے تہی دامن نظر آتا ہے۔ اپنے آپ کو خدا کی لاڈلی قوم سمجھنے والے یہود وحشت و بربریت اور مکاری و منافقت کا پیکر مجسم ہیں۔ انہوں نے تعلیمات الٰہیہ کو اپنی مرضی کے مطابق بدل لیا ہے۔ بائبل جو صحیفۂ آسمانی تھا، اس میں تحریف کر کے اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق قوانین شامل کر دیئے ہیں۔ عہد نامہ قدیم کی اس عبارت کو قرآنی تعلیمات کے تناظر میں تقابلی نظر سے دیکھتے ہوئے سوچیں کہ کون سا مذہب اپنے اندر کس قدر رواداری اور تحمل و برداشت کا عنصر رکھتا ہے:

> "جب خداوند تیرا خدا انہیں تمہارے قبضہ میں دے دے تو تم وہاں کے تمام مردوں کو قتل کر ڈالو لیکن عورتوں، بچوں، مویشیوں اور لوٹ کے مال کو اپنے قبضہ میں لے لو۔ جن شہروں پر تم قابض ہو جاؤ وہاں کے کسی ذی روح کو زندہ نہ چھوڑو بلکہ ان کو یعنی حتی، اموری، کنعانی، فرزی، حوی اور یبوسی قوموں کو خداوند قدوس کے حکم کے مطابق نیست و نابود کردو"۔(174)

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف نظر آ رہا ہے کہ یہودیت میں غیر یہودی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس میں ایک نہایت غلط بات کو پیغمبر برحق

موسیٰ علیہ السلام سے منسوب کر کے اسے بائبل کا حصہ بنا دیا ہے۔ عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے:

''موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سرداروں سے فرمایا کیا تم نے سب عورتوں کو زندہ بچا رکھا ہے؟ پس تم ان سب میں جتنے لڑکے ہیں ان سب کو قتل کر دو اور جو عورتیں مردوں کا منہ دیکھ چکی ہیں ان سب کو بھی مار ڈالو لیکن وہ لڑکیاں جنھوں نے مردوں کا منہ نہیں دیکھا انہیں اپنے لئے زندہ رکھو''۔ (175)

تاریخ انسانی شاہد ہے کہ یہودیوں نے ہر دور میں ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں۔ انسانی خون کے دریا بہائے اور آج بھی وہ بے گناہ مخلوق خدا پر ستم ڈھا رہے ہیں۔ بستے شہروں کو جلا رہے ہیں۔ لہلہاتے کھیتوں اور شاداب کھلیانوں کو اجاڑ رہے ہیں۔ ارض فلسطین اور لبنان کے کہساروں پر آگ برسا رہے ہیں۔ قبلہ اوّل کی گلیوں اور بیروت کے بازاروں میں لاشوں کے انبار لگا رہے ہیں۔ انسانی خون ان کی سرشت میں شامل ہے بلکہ وہ اسی کو اپنا دستور العمل سمجھتے ہیں جو عہد نامہ قدیم کی درج ذیل عبارت میں دیکھا جا سکتا ہے:

''خداوند ہمارے خدا نے انہیں ہمارے قابو میں کر دیا تب ہم نے اسے ان کے بیٹوں اور ان کی پوری قوم کو تہہ تیغ کر دیا۔ ان کے شہروں پر قبضہ کر کے عورتوں، بچوں اور تمام شہریوں کو قتل کر ڈالا اور کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا''۔ (176)

یہودیت کی تاریخ، دجل و فریب، سازش و مکاری، افتراق و انتشار اور فتنہ انگیزی سے عبارت ہے۔ امریکی سکالر ہنری فورڈ کا کہنا ہے کہ مسجد اقصیٰ کو شہید کرنا یہودیوں کا اوّلین مقصد ہے اور اس کام کے لئے جتنی دہشت گرد تنظیمیں مصروف عمل ہیں ان سب کے پس پشت امریکہ کا ہاتھ ہے۔ وہ یہودیت کو عالم انسانیت اور امن کا قاتل سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی معروف کتاب کا عنوان بھی اسی قسم کا رکھا ہے کہ ''یہودیت سے عالم انسانیت کو

خطرہ'' اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

''امریکی معاشرے میں جہاں کہیں بھی اخلاقی انحطاط اور فساد نظر آتا ہے اس کے پس پشت یہودیوں کا ہاتھ ہے۔ شراب و شباب، جوأ و بدکاری، رشوت و حرام کاری، جنسی و مالی بدعنوانی، قتل و غارت و خون ریزی، ڈاکہ زنی و معرکہ آرائی، مہلک ہتھیار سازی اور ہمہ قسم کے غیر فطری عزائم میں یہودیوں کا حصہ 90% ہے''۔ (177)

عیسائی مذہب کی تاریخ، یہودیت و ہندومت کی قتل و غارت، عدم برداشت اور اپنی تمام تر ہولناکیوں کے اعتبار سے ان سے بھی آگے نکل چکی ہے۔ عیسائیت کا اندر، باہر ایک نہیں۔ اس کے دو چہرے ہیں۔ ایام مصائب میں امن و سلامتی اور عفو و درگزر کی تبلیغ کرتی رہی لیکن اقتدار میں آنے کے بعد ہر دور میں مخالفین کا لہو بہا کر انتقام کی آگ بجھائی۔ کلیسا کا مذہب یہی ہے کہ مخالفین کو بزور طاقت کچل دو۔ غیر مذہب رکھنے والوں کے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے کہ یا تو وہ عیسائی مذہب اختیار کر لیں یا موت کو گلے لگا لیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ (178)

حضور رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل 610ء کے لگ بھگ عیسائی بادشاہ فوقا (Phocas) نے یہودیوں کی بغاوت کچلنے کے لئے اپنے ایک فوجی جرنیل بنوسوس (Bonosus) کو ایک لشکر جرار کے ساتھ بھیجا جس نے پورے شہر کو تباہ کر ڈالا۔ بچوں، بوڑھوں اور مرد و زن کو قتل کر کے دریا برد کر دیا۔ کچھ کو درندوں کے سامنے ڈال دیا اور بچے کھچے شہریوں کو زندہ جلا ڈالا۔ (179) اسی طرح قیصر روم ہرقل (Heraclius) نے مفتوحہ علاقوں کے تمام یہودیوں کو عیسائی پادری رہنماؤں کے ایماء پر قتل کر ڈالا۔ صرف وہی یہودی بچ سکے جو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ (180) عیسائیوں کا یہی رویہ مسلمانوں کے ساتھ نظر آتا ہے جب کہ وہ اپنی سفاکانہ روش میں یہود اور ہندوؤں کو بھی

پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ پکتھال نے عیسائیوں کے ستم کی تاریخ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہسپانیہ، صقلیہ اور اپالیہ میں مسلمانوں کا ایسا قتل عام ہوا کہ ان ملکوں میں مسلمانوں کا نام لینے والا بھی باقی نہ رہا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یونان کی 1821ء کی بغاوت میں مسلمانوں کو چن چن کر اس طرح قتل کیا گیا کہ ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہا اور ان کی مساجد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی''۔ (181)

1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے خون کے دریا بہا دیے گئے۔ کیپٹن ہڈسن نے مغل شہزادوں کو قتل کرنے کے بعد نہ صرف انہیں سولی پر لٹکایا بلکہ ان کا خون نکال کر چلو بھر کر پیا اور کہا:

''اگر میں ان کا خون نہ پیتا تو میرا دماغ خراب ہو جاتا''۔ (182)

ہیروشیما اور ناگاساکی کی فضا آج بھی مسموم ہے اور عیسائیوں کے ظلم کی داستان بیان کر رہی ہے اور ایک لاکھ دس ہزار بے گناہ معصوم شہریوں کی روحیں قیامت تک اپنی بے گناہی کا حساب مانگتی رہیں گی۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کو نشانہ بنانے والا عیسائی ملک امریکہ آج عالمی سپر طاقت بن چکا ہے۔ ماضی کے دشمن آج شیروشکر ہو چکے ہیں اور ان دونوں کا ٹارگٹ عصر حاضر کا وہ مسلمان ہے جس کا مذہب اپنی رواداری کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ لمحۂ موجودہ کے یہود و نصاریٰ ایک ہو کر مسلمانوں کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کوہ طور سے کشمیر کہساروں تک، ارض فلسطین سے ارض ایران تک، لبنان کے پہاڑوں سے لے کر افغانستان کے پہاڑوں تک، اردن وشام سے لے کر پاکستان تک اور عرب کے صحراؤں سے لے کر فرات کے پانیوں تک، ہر اس ملک پر آگ برسائی جا رہی ہے جو مسلمانوں کا ملک ہے۔ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے وہ اپنے تشکیل کردہ نئے عالمی نظام کو جبراً (impose) کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نظام کا مقصد ومفہوم

دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ لمحۂ موجودہ کی واحد سپر طاقت امریکہ ہے اور اس حقیقت کو طوعاً و کرہاً دنیا کو تسلیم کرنا ہوگا۔ امریکہ کے نظام معیشت، نظام تعلیم اور ان کے کلچر کو اپنانا ہوگا اور فقط امریکہ کا ہی حکم چلے گا تاہم اسے اقوام متحدہ کی چھتری کا سایہ حاصل ہوگا جسے امریکہ سلامتی کے خلاف سمجھے گا صرف اسے خطرہ سمجھا جائے گا۔ دنیا کے کسی مشرقی و مغربی ملک کو عالمی قوت کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا البتہ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو ہر قسم کا تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ اسے عربوں میں ایک ابدی سچائی کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اگر کوئی اس حیثیت کو تبدیل کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ کوشش امریکہ کے خلاف متصور ہوگی۔ امریکی مفادات کو دنیا بھر کے تمام ممالک کے مفادات پر فوقیت حاصل ہوگی۔ بالخصوص تیل کا معاملہ سرفہرست سمجھا جائے گا۔ ہمہ قسم کے ایٹمی و جنگی اسلحہ کی تیاری اور تحقیق و ترسیل امریکہ کے کنٹرول میں ہوگی۔ پروفیسر زبگینو بریزنسکی نے کچھ عرصہ قبل نیو ورلڈ آرڈر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> ''مشرق وسطیٰ کے لئے امریکہ کی فوجی چھتری ناگزیر ہے۔ حالات جو بھی ہوں اس علاقے میں امریکہ کی فوجی موجودگی مستقل نوعیت کی ہوگی''۔ (183)

اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے امریکہ سب سے پہلے مسلمانوں کی اسلامی تنظیموں کو کچل رہا ہے جو احیائے اسلام کے لئے کام کر رہی ہیں۔ اسلام جو امن و سلامتی اور اطاعت و تسلیم کا دین ہے، اس کے ماننے والوں کو دہشت گرد اور بنیاد پرست قرار دے کر پوری مغربی دنیا کو ان کے مقابلے میں لا کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہیں باور کرا رہا ہے کہ اگر تمہیں خطرہ ہے تو صرف اور صرف مسلمانوں سے ہے اس لئے ان کی طاقت کو کچلنا اور انہیں ہر لحاظ سے کمزور کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں وہ اسرائیلیوں کو شہہ دے رہا ہے، انہیں ہر قسم کا اسلحہ اور پیسہ فراہم کر رہا ہے، انہیں مضبوط بنا رہا ہے تاکہ فلسطین پر ان کا

قبضہ مضبوط ہو جائے۔ وہ پاکستان، ایران، افغان اور چین کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اسرائیل کی طرح اس خطہ میں ہندوستان سے کام لیا جا سکے۔ پاکستان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت فقط نرم گرم ہے تاکہ ضرورت کے وقت اس سے کام لیا جا سکے۔ پہلا ٹارگٹ عراق اور افغانستان ہیں اس کے بعد ایران و پاکستان اور سعودی عرب و شام ہیں اور اس منصوبے میں بعض اور ممالک بھی شامل ہیں۔ اسلام کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کرنے کے لئے وہ ہر قسم کے حربے استعمال کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب تو امریکی صدر بش نے، اسلام کو فاشزم کا نام دے کر اپنے اندر کے زہر کو اگل دیا ہے اور بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے خلاف مسلسل سازشوں کے جال بن رہا ہے۔ انڈیا اور اسرائیل کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے برابر استعمال کر رہا ہے۔

سعودی عرب جو امریکہ کا قدیم دوست تصور کیا جاتا ہے اس کے بارے میں امریکہ کے معروف تجزیہ نگار لارینٹ موریوک نے ڈیفنس پالیسی بورڈ کو بریفنگ دیتے ہوئے 10/جولائی 2002ء کو یہ بیان دیا کہ:

> ''سعودی عرب، شہری دہشت گردی کے پورے سلسلے سے وابستہ ہے۔ ہمارے دشمنوں کا مددگار ہے اور ہمارے اتحادیوں پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ سعودی عرب برائی کا منبع ہے۔ وہ سب سے بڑی متحرک قوت ہے اور مشرق وسطیٰ میں ہمارا سب سے خطرناک دشمن ہے۔ اگر سعودی عرب امریکی مطالبات پورے نہ کرے تو اس کے تیل کے چشموں پر قبضہ کرنا بہت ضروری ہے''۔ (184)

امریکیوں نے سعودی نظام تعلیم کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ تھامسن فریڈ مین نے نیویارک ٹائمز کی 12/دسمبر 2001ء کے ایک اشاعتی مضمون میں یہ بیان دیا تھا کہ دینی مدارس اور دینی ادارے دہشت گردی کے مراکز ہیں، انہی اداروں سے دہشت گرد قیادت

جنم لیتی ہے۔ دہشت گردوں کے ان چشموں کو خشک کرنا ہوگا۔ ان مدرسوں کا نظام تعلیم، یہود ونصاریٰ کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکاتا ہے اور ان کے خلاف لڑائی پر اکساتا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ سعودی عرب کو خبردار کر دیا جائے کہ وہ ان دینی مدارس کی پشت پناہی چھوڑ دے۔ (185)

افغانستان میں روسی مداخلت پر امریکہ نے افغانستان کی بھرپور مدد کی بلکہ اس مقصد کے لئے پاکستان کو بھی استعمال کیا۔ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو فوراً آنکھیں پھیر لیں اور وسطی ایشیا پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے افغانستان پر قبضہ کرنا ضروری سمجھا اور نائن الیون جیسے واقعہ کی آڑ میں 8/اکتوبر 2001ء کو اپنی اتحادی فوجوں سمیت حملہ کر دیا اور اپنے جدید جنگی جہازوں سے اتنی آگ برسائی کہ انسانی تاریخ نے آج تک ایسا کربہہ منظر نہیں دیکھا تھا۔ صرف پہلی چھ راتوں میں پانچ ہزار سے زائد حملے کئے اور پانچ لاکھ ڈیزی کٹر بم برسا کر افغانستان کو خاکستر کر دیا۔ کتنے بے گناہ شہری اور معصوم بچے لقمۂ اجل بنے کوئی نہیں جانتا۔ وہی امریکہ جو افغانستان کا حامی بن کر آیا تھا اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے اس نے کس طرح پورے ملک کو برباد کر ڈالا۔

رہا پاکستان کے ساتھ تعلقات کا معاملہ تو اس کی تاریخ بھی کچھ اتنی خوشگوار نہیں۔ پاک امریکہ تعلقات کا آغاز 1950ء سے لے کر اپریل 1979ء تک، پاکستان اور امریکی تعلقات میں اتار چڑھاؤ رہا لیکن دسمبر 1979ء کی افغانستان، روس جنگ نے پاکستان کو امریکہ کے بہت قریب کر دیا۔ اسی دوران کئی دفاعی معاہدے ہوئے۔ ریگن حکومت نے فوجی واقتصادی امداد کے پانچ سالہ معاہدے بھی کئے لیکن مئی 1988ء میں جب روسی فوجیں افغانستان سے چلی گئیں اور پاکستان کی ضرورت باقی نہ رہی تو امریکہ نے فوراً آنکھیں پھیر لیں۔ پاکستان کا ایٹمی پلانٹ انہیں کھٹکنے لگا۔ اکتوبر 1990ء میں امریکی صدر بش نے پاکستان پر اقتصادی وفوجی پابندیاں عائد کر دیں۔ یہاں تک کہ

ایف 16 طیارے جن کی پاکستان قیمت بھی ادا کر چکا تھا، وہ بھی پاکستان کو نہ ملے اور آج تک نہیں مل سکے۔ امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ نے انڈو پاک کا 7 / اپریل 2000ء کو دورہ کیا اس دوران اس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"بھارت میں جمہوری ادارے زندگی سے بھرپور ہیں بنگلہ دیش میں نمو پارہے ہیں جب کہ پاکستان میں خطرے سے دوچار ہیں"۔ (186)

آج کل پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کی نوعیت اس قسم کی ہے کہ ہم اپنے بچاؤ کے لئے امریکہ کے ہر حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ صدر پاکستان کا اپنا بیان ہے کہ:

"ہم کوشش کر رہے ہیں کہ عراق کے بعد ہمارا نمبر نہ آجائے"۔ (187)

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ امریکہ اپنی طاقت کے نشے میں چور ہو کر مسلمانوں پر ستم ڈھا رہا ہے۔ 11 / ستمبر کا واقعہ مسلمانوں اور احیائے اسلام کی تحریکوں کو کچلنے کی ایک عالمی سازش تھی۔ اس حملے میں اسامہ بن لادن کو مجرم قرار دے کر، عالم اسلام کی ساکھ برباد کرنے کی کوشش کی جاری ہے۔ ایک معروف مغربی تجزیہ نگار رابرٹ فسک نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں اپنا تسلط جمانے کے لئے کافی مشکلات کا سامنا تھا 11 / ستمبر کے واقعہ نے اس کی راہ ہموار کر دی۔ اس حملے کی ذمہ داری، اسامہ بن لادن پر عائد کر کے مغربی ممالک کو، عرب دنیا کے خلاف متحد کرنے کی کوشش ہے"۔ (188)

متذکرہ بالا حالات و واقعات اور مسلم وغیر مسلم تعلقات کو حقائق کے آئینے میں دیکھیں تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ دنیا کے امن کو برباد کرنے والا صرف ایک ہی ملک ہے اور وہ ہے امریکہ کیونکہ وہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر کو جبراً دنیا پر impose کرنے کے لئے آئے دن سازشوں کے نئے جال بن رہا ہے۔ وہ اپنا کلچر اور اپنی اقدار کو عالم انسانیت پر

تھوپنا چاہتا ہے۔اس کے ارادوں میں آڑے آنے والے ممالک کو بزورقوت مطیع کرنے پر تلا ہوا ہے۔ایک مفکر والٹرلپ نے امریکی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے نہایت سخت الفاظ میں خبردار کیا ہے کہ:

> ''اگر ایک قوم محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر، پوری دنیا میں اپنا نظام impose کرنے پر تل جائے تو گویا وہ پوری دنیا کو اپنے خلاف متحد کرنے کی دعوت دے رہی ہوتی ہے۔امریکی سلامتی کے لئے کوئی خوش کن راستہ نہیں۔دنیا بھر میں تبدیلی لانا اور انہیں اپنے اشاروں پر چلانا امریکہ کی خام خیالی ہے۔اگر وہ اپنی اس خام خیالی پر قائم رہے تو دنیا میں امن تو اپنی جگہ خود امریکیوں کو کہیں امن نصیب نہ ہوگا''۔(189)

کالم جانسن نے تو امریکی جارحیت اور دہشت گردی کو کھلی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ امریکہ، عراق اور شمالی کوریا کو سرکش ریاستوں کا نام دیتا ہے۔اسے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کہ کہیں وہ خود تو سرکش سپر پاور نہیں بن گیا۔(190) کالم جانسن نے اندر کی بات کہہ دی ہے۔حقیقت یہی ہے کہ امریکہ طاقت کے نشے میں چور ہوکر نوع انسانی کا قتل عام کر رہا ہے۔وہ مرکزی حیثیت کے حصول کے لئے دنیا کا اقتصادی، تہذیب وتمدن، ابلاغ عامہ اور مالیاتی وتجارتی کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں صرف اس کا نام ہو، اسی کا راج ہو، اس کا کلچر ہو۔وہ اس مقصد کے حصول کے لئے پیش بندی کے طور پر بے دریغ طاقت کا استعمال کر رہا ہے اور خاص طور پر مسلم دنیا اس کی جارحیت کا نشانہ ہے۔فلسطین، بیروت، افغانستان اور عراق، تختہ مشق بنے ہوئے ہیں۔اردن، سعودی عرب، کویت اور عرب امارات چپ سادھے ہوئے ہیں۔شام، ایران اور پاکستان اس کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔امت مسلمہ آج موت کے دہانے پر کھڑی سسک رہی ہے۔ڈیڑھ ارب مسلمان جو دنیا کے اِکسٹھ (61) ممالک میں پھیلے

ہوئے ہیں، جن کے پاس قدرتی وسائل اور جوہری طاقت بھی موجود ہے، آئے روز وہ بے بسی کے پاتال میں اترتے جا رہے ہیں۔ امن و سلامتی کے علمبرادروں کو مغربی دنیا دہشت گرد قرار دے کر تختۂ مشق بنا رہی ہے۔ پورا عالم کفر عالم اسلام کے خلاف متحد ہو چکا ہے، جب کہ امت مسلمہ افتراق و انتشار کا شکار ہے۔ فرقہ واریت کی آگ میں جل رہی ہے اور فرقہ واریت کی آگ لگانے والے یہود و نصاریٰ ہیں۔ تہذیبوں کی جنگ عروج پر ہے۔ اس جنگ کا آغاز بھی امریکہ ہی نے کیا ہے امریکی تہذیب، ایک منصوبے کے تحت ہر ملک پر یلغار کر رہی ہے۔ سپر طاقت ہونے کے ناطے، امریکہ فقط اپنی تہذیب کی نشوونما چاہتا ہے۔ کسی اور تہذیب کو برداشت کرنا، اس کے لئے ناممکن ہو چکا ہے۔ یہ فقط دین اسلام ہی ہے جو دوسروں کو جینے کا حق دیتا ہے، مذہبی آزادی دیتا ہے، غیر مسلموں کو مساوی حقوق دیتا ہے، اپنا عقیدہ کسی پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اپنی عبادت گاہوں میں غیر مسلموں کو عبادت کی اجازت دیتا ہے۔

امریکہ نے ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ مغربی دنیا اسلام سے خوف زدہ نظر آتی ہے۔ اسلام جو اپنے اندر اطاعت و تسلیم کے سوا کچھ نہیں رکھتا اسے فاشزم قرار دے کر اس کے ماننے والوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ اس تہذیبی تصادم اور کشمکش کی مسموم فضا کو خوشگوار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مذہبی رواداری کو عام کیا جائے۔ بین المذاہب سیمینارز کا انعقاد کر کے موجودہ تہذیبی تصادم کو ختم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ ہر مذہب کو قابل احترام سمجھا جائے اور اسلام کے دستور العمل کو اپناتے ہوئے دوسروں کے مذاہب کا احترام کیا جائے۔ OIC جو ستاون (57) اسلامی ممالک پر مشتمل ہے اس کے کردار کو فعال بنایا جائے۔ اسلام کی حقانیت اور اس کی تعلیمات کو عام کرنے کا اہتمام کیا کائے کیونکہ عصر حاضر کے مسائل کا واحد حل اسلام کے دستور العمل کو اپنانے میں پوشیدہ ہے۔ عالم اسلام اگر اپنی نا اتفاقی کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہے تو مغربی دنیا بھی اسی قسم کے کرب سے گزر

رہی ہے۔ امریکہ طاقتور ہونے کے باوجود اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ وہ ایک روحانی اضطراب میں مبتلا ہے اور یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ مضطرب دلوں کو سکون اسلام میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ اور مغربی دنیا میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بین المذاہب مکالماتی اسلوب اپنا کر، رواداری کو عام کیا جائے۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے بین الاقوامی سیمینار منعقد کیے جائیں۔ غیر مسلموں کو اسلام کے منشور سے آگاہ کیا جائے اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کو پیش کیا جائے۔ اسلام قبول کرنے والے نومسلموں کی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے مقابلے میں دنیا کے سامنے مسلم ورلڈ آرڈر رکھا جائے جس کی بنیاد حضور رحمۃ للعالمین علیہ الصلوۃ والتسلیم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں رکھی تھی۔ جس کے تحت تمام سابقہ نظام اور ضابطے منسوخ کر دیئے گئے تھے۔ مذہبی آزادی کا ایسا ضابطہ جاری ہوا تھا کہ جس کے تحت ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق عقیدہ اختیار کر سکتا ہے۔ ایسا ضابطہ جس کے انسانی خون کی حرمت، عزت وآبرو کی حفاظت، اخوت ومساوات، جان ومال کی حفاظت، مسلم وغیر مسلم، آقا وغلام اور طاقتور وکمزور کے لئے مساوی حقوق کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ ایسا دین جس کے ماننے والا اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی انسان کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔ مسلمانوں کا یہی دستور العمل، عورتوں، مردوں، اساتذہ اور ہمسایوں کے حقوق کا تعین کرنا ہے۔ عائلی زندگی کو خوشگوار بناتا ہے اور عہد و پیان کو پورا کرنے کا حکم دیتا ہے۔

عصر حاضر میں عالم اسلام کی بقا اسی میں ہے کہ وہ فرقہ واریت اور باہمی تنازعات کو فراموش کر کے ایک مرکز پر اکٹھے ہو جائیں۔ OIC تنظیم کو فعال بنائیں۔ مسلم ممالک پر مشتمل اپنی الگ اقوام متحدہ قائم کریں کیونکہ موجودہ اقوام متحدہ صرف امریکی مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ اپنی الگ فوج تشکیل دیں جس میں تمام مسلم ممالک کے فوجی شامل ہوں۔ دفاعی اور مالی اخراجات اور باہمی مفادات کے لئے اک بینک کا قیام عمل میں لائیں، جس کا

پیسہ صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو۔ تمام مسلم ممالک اپنا پیسہ غیر ملکی بینکوں سے نکلوا کر اپنے اسلامی بینک میں رکھیں۔ امت مسلمہ اپنی خارجی پالیسی تشکیل دے جس کے تحت ان کا فیصلہ کسی بھی غیر مسلم ملک کے ساتھ ایک ہی ہو۔ اسلحہ سازی کے لئے جدید ٹیکنالوجی اپنائی جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے تمام تر وسائل بروئے کار لائے جائیں۔ مغربی تہذیب کی یلغار اور زہریلے پراپیگنڈہ کا جوب دینے کے لئے متفقہ میڈیا پالیسی اختیار کی جائے۔ اسی میڈیا کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا جائے بین الاقوامی سطح پر اسلامی عدالت قائم کی جائے تا کہ آپس کے تنازعات احسن طریقہ سے انجام پاسکیں۔

واشنگٹن پوسٹ کے سٹاف رائٹر ہاورڈ کرٹس نے نام نہاد دہشت گردی کے نئے مفہوم کے حوالے سے اپنے ایک حالیہ اداراتی مضمون میں اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے Seeking into Beruit میں چند سوالات کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکہ اور اسرائیل لفظ "دہشت" کو دنیا کے چاروں اطراف بڑی محبت سے پھینک رہے ہیں۔ یہ بہت مشکل ہے کہ ہم ایسے کسی دشمن کا نام لیں جسے ابھی دہشت گرد کے لقب سے نہ نوازا گیا ہو۔ میں بھی یہی یقین کرنے پر مجبور ہوں کہ دہشت گرد اسے کہتے ہیں جو ملٹری اور سیاسی مقصد کے لئے معصوم شہریوں کا قتل عام کرے۔ سب سے پہلے تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا دو فوجیوں کو پکڑنا دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے؟ کیا اسرائیل کے دشمنوں کو لڑنے کی بالکل اجازت نہیں؟ کیا اسرائیل کے ساتھ دلیل سے بات کرنا بھی دہشت گردی کے معنوں میں آتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ امریکہ محض اسرائیل ہی کو جارحانہ اقدامات اٹھانے کی اجازت دے رہا ہے جب کہ کسی اور کو اس کا جواب دینے کی اجازت نہیں اور اگر کسی کے حواس قائم ہیں اور وہ فائٹ بیک کرتا ہے تو کیا وہ دہشت گرد ہے؟ میں امریکہ سے صرف ایک سادہ سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو دہشت گرد بننے کے لئے کتنے شہریوں کو مارنا ہوگا؟ کیا اسرائیل معصوم شہریوں پر راکٹ نہیں برسا رہا؟(191)

مصادر و مراجع

1-ابن حبیب: المحبر، صفحہ 66

2-ابن حبیب: المحبر، صفحہ 265

3-ابن سعد محمد الزہری: طبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، لبنان، 1388ھ، 1:43۔

4-ابن ہشام: السیرۃ النبویہ، مطبعۃ المصطفیٰ البابی، الحلبی، مصر، 1471ھ، ص 264

5-بلاذری: انساب الاشراف، 1:206

6- صحیح مسلم، 44:132-133

7-ابن ہشام: السیرۃ النبویہ، صفحہ 252

8-ابن سعد: طبقات الکبریٰ 1:134

9-ابن ہشام: السیرۃ النبویہ، صفحہ 289

10-ابن ہشام: السیرۃ النبویہ، صفحہ 287

11-بلاذری: انساب الاشراف، 1:584

12-بخاری و مسلم شریف

13-الانفال، 8:30

14-احمد بن حنبل امام، المسند حدیث نمبر 351، المطبعۃ الیمنیۃ، مصر، 1306ھ

15-جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام، 3:295

16-سمہودی وفاء الوفاء، 1:116-112

17-ڈاکٹر فہیم اللہ، پیغمبر اسلام، 436

18-الوفاء، 1:116

19- صحیح بخاری، 4:44،67

20-پیغمبر اسلام، 214-219

21-انساب الاشراف، 1:280

22-زاد المعاد، 2:79

23-ابن سعد، طبقات حصہ اول، 2:9

24-البخاری، عبداللہ بن محمد اسماعیل امام: الجامع الصحیح، 3:119، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، 1985ء۔

25-سیوطی، لباب النقول فی اسباب النزول، صفحہ 260۔

26-ابن ہشام، 2:75

27- صحیح مسلم۔

28- صحیح بخاری۔

29- آل عمران، 92:3

30- الحدید: 25

31- الحج: 61

32- الشوریٰ، 38

33- الامام والحیاۃ لابن خیبر، مطبعۃ الفتوح، مصر، صفحہ 41

34- الشوریٰ: 151

35- بخاری، کتاب الحدود، باب 11-12

36- ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، امام: کتاب الخراج، صفحہ 116، المطبعۃ السّلفیہ، مصر، طبع ثانی، 1352ھ۔

37- الحجرات: 10

38- الحجرات: 137

39- ابن کثیر حافظ عماد الدین، ابوالفدا اسماعیل بن عمر، البدایۃ والنہایۃ، مصر، 4: 217، 1937۔

40- تفسیر روح المعانی، 148:26

41- النساء: 58

42- بخاری کتاب الاحکام، باب 11

43- کنز العمال، 250:575

44- کنز العمال، 2512

45- بخاری شریف: کتاب الاحکام، باب 4

46- الداؤد، کتاب الجہاد، باب 95

47- کنز العمال 5 حدیث نمبر 2285

48- کنز العمال 5 حدیث نمبر 2587

49- مسلم، کتاب الامارہ، باب 3

50- ابوداؤد، کتاب الامارہ، باب 3

51- المائدہ: 32

52- بخاری، کتاب الجنائز، باب 2

53- ترمذی، ج 3: 373 رقم 1936

54- مسلم،4:180، رقم2585
55- برت حلبی دارالمعرفہ، بیروت،1:456
56- الحلیق،1:339
57- شبلی: الفاروق مکتبہ صدیقیہ، ملتان،2:442، 1952
58- ابن ہشام: 374
59- تفسیر ابن کثیر،1:420
60- الکتانی، الترتیب الدریہ،1:235
61- ابن حجر مطالب: 971
62- ابن ہشام: 911
63- سہیلی،11:253
64- ابن حبیب، حجر: 77
65- مرزوقی، الازمنہ،11:167
66- ابن قبیل،IV:322
67- ابن حجر، الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ: 961
68- طبقات،11:18
69- المبسوط،1:37
70- طبقات،IV:183
71- بلاذری، الانساب،1:241
72- کتاب الخراج، بلاق ایڈیشن، صفحہ 40
73- کتاب الخراج
74- القرآن،5:32
75- ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، مصر، مطبعۃ المصطفیٰ البابی، الحلبی،4:52
76- ابویوسف، کتاب الخراج، صفحہ 125
77- البخاری، صحیح بخاری، دہلی کرزن پریس، کتاب الجزیہ،1:448
78- الزیلعی، عثمان بن علی، تبیین الحقائق، کنزالدقائق، بولاق، مصر،1314ھ، طبع اوّل، صفحہ 28۔
79- اصلاحی، امین احسن، اسلامی ریاست، لاہور، انجمن خدام القرآن، صفحہ 222 بحوالہ ترمذی۔
80- القرآن2:256
81- القرآن5:47

82-ابن منظور جمال الدین محمد بن مکرم الانصار، لسان العرب، بیروت، دارصادر، 1986ء، 59:5۔
83-الفیومی، احمد بن محمد بن علی المقری، المصباح المنیر، مصر، مطبع مصطفیٰ الباری، 1369ھ، 59:5۔
84-الشہانوی، محمد بن علی، کشاف اصطلاحات الفنون، بیروت، 516:2
85-القرآن، 256:2
86-القرآن، 99:10
87-القرآن، 108:6
88-القرآن، 11:49
89-السجستانی، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 167:3، حدیث رقم 3041۔
90-ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، مصر، الجامعۃ السّلفیہ، طبع اولیٰ، 1967ء، صفحہ 146۔
91- کتاب الخراج، قاہرہ، صفحہ 84
92-المقریزی، تقی الدین احمد بن علی، کتاب المواعظ والاعیار فی ذکر الخطط والآثار، پیرس، 1911ء، جلد اوّل، صفحہ 511۔
93-الخصائص، ابوبکر احمد بن علی الرازی، احکام القرآن، مصر 1335ھ، مطبعۃ الجامع السّلفیہ، 164:1۔
94- یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، لاہور، 1395ھ مطبعۃ المکتبۃ العلمیہ، صفحہ 182
95-الشیرازی، محی الدین امام نووی، المجموع شرح المہذب، مکتبۃ الثانیہ، مصر، 197:18
96- سنن ابی داؤد، 3: حدیث نمبر 3052
97-ابو یوسف، کتاب الخراج، صفحہ 125
98- کتاب الخراج، صفحہ 124
99- کتاب الخراج، صفحہ 124
100-البہوتی، منصور بن یونس بن ادریس صلاح، کشاف القناع عن متن الاقناع، بیرون، 1403ھ مطبعۃ الحکومہ بمکۃ 1396ھ، 126:3
101-القانی، شہاب الدین، ابوالعاص احمد بن ادریس، الفروق، مصر 1346ھ، طبع اوّل، دار احیاء الکتب العربیہ، 16:3

102- القرافی، الفروق، 14:3
103- دارالمختار، 273:3
104- مودودی، ابوالاعلیٰ، حقوق اہل الذمہ فی الدولۃ الاسلامیۃ، مصر، 1389ھ صفحہ 361
105- حسن الزین، اہل الکتاب فی المجتمع الاسلامی، بیروت، 1406ھ صفحہ 113
106- کتاب الخراج، صفحہ 208
107- المبسوط، 81:10
108- النمر، محمد التحلیل، اہل الذمۃ والولایات العامۃ، عمان، اردن 1409ھ، المکتبۃ الاسلامیہ، طبع اوّل، صفحہ 140
109- ماوردی، الاحکام السلطانیہ (مترجم: سید پرویز اسلم) اسلامی ریاست کے بنیادی اصول، لاہور، ادارہ اسلامیات، صفحہ 239
110- ابوجیب سعدی، موسوعہ الجماع فی الفقہ الاسلامی، صفحہ 151
111- النحل: 35
112- النحل: 32
113- ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، 862
114- مبسوط، 86:10
115- حمیداللہ، ڈاکٹر: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مطبوعہ لاہور، 2005ء، صفحہ 189
116- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صفحہ 191
117- بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان، الجامعۃ السلفیہ المحمدیہ، المصر، 1967ء، صفحہ 107
118- ابن حبیب، المحبر، صفحہ 260
119- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صفحہ 196
120- ابن ہشام، صفحہ 960
121- مسند، 229:2
122- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صفحہ 198
123- الاصابہ، نمبر 3739,2759
124- الاصابہ، نمبر 8126
125- المسعودی، مروج الذہب، مطبوعہ پیرس، 308:1
126- بروم ہال مارشل، چین میں اسلام، صفحہ 66
127- Hamidullah, Madina Conduct of Sate

128-امام سرخسی، شرح السفیر الکبیر،254:4
129- شبلی نعمانی، الارایہ فی تخریج الہدایہ، مطبوعہ دہلی، صفحہ 360
130-المقریزی، تقی الدین احمد بن علی: کتاب المواعظۃ والاعتبار فی ذکر الخطط والآ ثار، 492:1، مطبوعہ پیرس، 1911ء
131-امیر علی سید، روح اسلام، مترجم: محمد ہادی حسین، لاہور، 1995، ادارہ ثقافت اسلامیہ، صفحہ 426
132-ابوعبید قاسم بن سلام، کتاب الاموال، مترجم: عبدالرحمٰن طاہر سواتی، اسلام آباد، ادارہ ثقافت اسلامی، صفحہ 164
133- کتاب الاموال، صفحہ 64
134-المقریزی، 499:2
135- آرنلڈ ٹی ڈبلیو، The Preaching of Islam، ترجمہ: ڈاکٹر عنایت اللہ، لاہور، 1972، صفحہ 65
136-ابن جریر، تاریخ الامم، ذکر فتح سوس
137- فتوح البلدان، صفحہ 375، قاہرہ، دارالنشر، 1957ء
138- شبلی، الفاروق، صفحہ 257، اسلام سنٹر، اردو بازار لاہور
139-الفاروق، صفحہ 298
140-الفاروق، صفحہ 108
141- بخاری، الجامع الصحیح، مطبوعہ میرٹھ، صفحہ 187
142- کتاب الخراج، صفحہ 71
143- تاریخ الامم، صفحہ 153
144- مولانا عبدالسلام ندوی، اسوۂ صحابہ، نیشنل فاؤنڈیشن، اسلام آباد، صفحہ 95
145- کتاب الخراج، صفحہ 42، مصر
146-سیاسی وثیقہ جات 369
147-اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب، لاہور، 25:10
148-اسلامی ریاست، صفحہ 583
149-اسلامی ریاست، صفحہ 583
150- ندوی، معین الدین شاہ، تاریخ اسلام، لاہور، ادارہ اسلامیات، صفحہ 327
151- کتاب الخراج، صفحہ 80

152- تاریخ یعقوبی، جلد 2
153- بلاذری، فتوح البلدان، مصر، 123
154- ابن سعد، طبقات، بیروت، 226:5
155- کتاب الخراج، صفحہ 46
156- معین الدین ندوی، تاریخ اسلام، مطبوعہ اسلام آباد، 102:3
157- امیر علی سید، روح اسلام، مترجم: محمد ہادی حسین، لاہور، 1995ء، 423
158- ابن تیمیہ، مختصر الفتاوی، مصر، صفحہ 513
159- آرنلڈ، دعوت اسلام، صفحہ 400
160- دعوت اسلام، صفحہ 212
161- ڈاکٹر تارا چند، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1980، صفحہ 22۔
162- ڈاکٹر تارا چند، مختصر تاریخ اہل ہند (ترجمہ) مجلس ترقی ادب، لاہور، صفحہ 122
S.R Sharma, The Religious Policy of the Mughal Emperos, -163
Lahor, 1975, P:6
Religious Policy, P:23 -164
165- تزک جہانگیری، اردو ترجمہ: اختر ندوی، مجلس ترقی ادب، کراچی، 1991، صفحہ 186
166- محمد اکرام، رود کوثر، صفحہ 447
167- ریحانہ پروین، اورنگ زیب کا نظام عدالت، لاہور، 1987ء صفحہ 224
168- رئیس احمد جعفری، خطابات قائد اعظم، لاہور۔ صفحہ 519
169- دعوت اسلام صفحہ 398
170- چوہدری غلام رسول، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، لاہور، 1980ء، صفحہ 101
171- تعمیر پاکستان از علمائے ربانی، صفحہ 28
172- منشی عبدالرحمٰن، تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی، ادارہ اسلامیات، لاہور، 1994ء، صفحہ 28
173- تعمیر پاکستان از علمائے ربانی، صفحہ 24
174- عہد نامہ قدیم، کتاب الاستثناء، باب 20، سطر 10-17
175- عہد نامہ قدیم، کتاب العدد، باب 31، سطر 15-18
176- عہد نامہ قدیم، کتاب الاستثناء، باب 2، سطر 32-34
177- ندوی، نذر الحفیظ، مغربی میڈیا اور اس کے اثرات، مجلس نشریات اسلام، کراچی، 2001ء صفحہ
45۔

178- Artur Gilmn: The Saracens, P.184 London, 1887

179- ابوالحسن ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مطبوعہ کراچی، 1967، صفحہ 57

180- ایضاً صفحہ 57

181- محمد مارماڈیوک پکتھال، اسلامی کلچر، اردو ترجمہ: پروفیسر محمد ایوب منیر، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، صفحہ 82

182- جانباز مرزا، انگریز کے باغی مسلمان، صفحہ 134

183- The News، کراچی، یکم مارچ 1991ء

184- واشنگٹن پوسٹ، 12 جولائی 2002ء

185- نیویارک ٹائمز، 12 دسمبر 2001ء

186- ترجمان القرآن، مئی 2000ء

187- روزنامہ جنگ، کراچی، 19 جنوری 2003ء

188- The Independence، 15 اکتوبر 2001ء

189- پروفیسر خورشید، امریکہ مسلم دنیا کی بے اطمینانی، صفحہ 113

190- Low Back the costs and consequences of American Empire, .216

191- روزنامہ نوائے وقت، 26 اگست 2006ء

مسلم اور غیر مسلم شہریوں کا حق اوّل
جان کی حرمت وحفاظت

پروفیسر قاری محمد اقبال
صدر شعبہ علوم اسلامیہ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد

مسلم اور غیر مسلم شہریوں کا حق اوّل' جان کی حرمت وحفاظت

پروفیسر قاری محمد اقبال

پیش لفظ

شہری حقوق کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا بغور جائزہ لینے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ اسلام نے حقوق کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم شہری میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ اسلامی ریاست میں جو حقوق ایک مسلمان شہری کے ہیں بعینہ وہی حقوق غیر مسلم شہری کے ہیں۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے زائد ایک حق بھی نہیں دیا گیا جبکہ غیر مسلموں کی تالیف قلب کے لئے ان سے بہتر سلوک' صدقات وزکوٰۃ کا ایک زائد مصرف اور زیادہ مذہبی آزادی دینے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک مقالے میں ان تمام حقوق کی تفصیلات اور ان کے دلائل بیان نہیں ہو سکتے اس لئے صرف ایک بنیادی اور اہم ترین حق "جان کی حرمت وحفاظت" پر قرآن وسنت کی تعلیمات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم اور جان کی حرمت وحفاظت

تمام حقوق وفرائض، جذبات واحساسات اور عواطف ومیلانات کا دارومدار زندگی پر ہے۔ تمام حقوق زندہ انسان کی ضرورت ہیں۔ مرجانے پر انسان، حقوق اور ان کی طلب اور دریافت سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ اس لئے قرآن نے جان کی حرمت وحفاظت پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور انسان کی جان کو تلف کرنا جرم عظیم قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کا ایک

بیان انسانی جان کی حرمت پر شہ سرخی کی حیثیت رکھتا ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْفَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدہ:32)

ترجمہ: جس شخص نے ایک جان کو ناحق قتل کیا تو گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے ایک جان کو بچالیا تو گویا اس نے سب انسانوں کو زندہ کر دیا۔

ہمارے اکثر مترجمین احیاء الناس کا ترجمہ "انسانوں کو بچالیا" کرتے ہیں۔ اگرچہ اس ترجمے کے لئے بھی قرینہ موجود ہے لیکن جو رعایتِ الفاظ اور لطفِ معانی "انسانوں کو زندہ کر دیا" کے الفاظ میں ہے' انسانوں کو بچالیا، کے الفاظ میں نہیں ہے۔ قرآن ایک انسانی جان بچانے والے کومحی الناس اور محسن انسانیت قرار دے رہا ہے۔

قرآن کریم نے رحمان کے بندوں کا تعارف ان الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ لَايَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا ۝﴾

(الفرقان:68-69)

ترجمہ: جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو نہیں پکارتے، جو اللہ کی محترم ٹھہرائی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور جو بدکاری نہیں کرتے۔ ان کاموں کا مرتکب جہنم کی وادی اثام میں جائے گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھا دیا جائے گا اور وہ ذلت کے ساتھ اس میں ہمیشہ رہے گا۔

رحمٰن کے بندوں کی کچھ علامات وصفات ان آیات سے پہلے کی آیتوں میں اور کچھ

بعد کی آیتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ گویا یہ آیات اوران میں بیان کردہ صفات سلسلۂ آیات کے مرکزہ میں واقع ہیں۔ جس سے ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر ان تین صفات میں سے قتل ناحق سے اجتناب کو مرکز میں رکھا گیا۔ اس کی توجیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شرک کا گناہ آسانی سے اور صدق و اخلاص کے ساتھ کلمہ پڑھنے سے ختم ہو جاتا ہے۔ بدکاری کا گناہ بھی استغفار و توبہ سے معاف ہو جاتا ہے لیکن قتل کا گناہ حق العبد ہونے کی وجہ سے آسانی سے معاف نہیں ہوگا۔

قرآن کریم قتل کی دو قسمیں بیان کرتا ہے۔

1- قتل عمد.................جان بوجھ کر قتل

2- قتل خطأ.................جس کو عدالت غلطی والا قتل قرار دے۔

قتل کی ان دو قسموں میں سے قتل عمد کی سزا بیان کرتے ہوئے قرآن کا جلال و غضب دیدنی ہے:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّلَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا.﴾ (النساء:93)

ترجمہ: مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرنے والے کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب ہوا، اسے اللہ نے اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور اس کے لئے عذاب عظیم تیار کر دیا ہے۔

اس آیت میں مسلمان کے قاتل کی متعدد سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ ہر سزا ایک دوسری سے بڑھ کر ہے۔ علاوہ ازیں فرد جرم میں "یقتل" مضارع کا صیغہ اور بیان سزا میں غضب، لعن اور اعد ماضی کے صیغے اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ قتل کے مجرم کی یہ سزائیں اتنی قطعی، حتمی، یقینی، ناقابل معافی اور اٹل ہیں کہ یوں سمجھا جائے کہ مجرم کو یہ سزائیں مل چکی ہیں۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے یہ مثال کارآمد ہے کہ مستقبل میں واقع

ہونے والی قیادت اوراس کے حوادث واہوال کوقرآن ماضی کے الفاظ سے بیان کرتا ہے جو قیامت اوراس کے وقائع کے حتمی اور یقینی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ علامہ شوکانی ان سزاؤں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

لَيْسَ وَرَآءَ هٰذَا التَّشْدِيْدِ تَشْدِيْدٌ وَّلَا مِثْلَ هٰذَا الْوَعِيْدِ وَعِيْدٌ (1)

ترجمہ: اس تشدید سے بڑھ کرنہ کوئی تشدید اوراس وعید سے بڑھ کرنہ کوئی وعید ہے۔

قتل خطا کی سزا قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

﴿وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا(......) وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ (النساء:92)

ترجمہ: جو مسلمان کو غلطی سے بھی قتل کرے تو اسے مسلمان گردن آزاد کرنے کے علاوہ مقتول کے ورثاء کو خون کی قیمت بھی دینا ہوگی۔ ہاں مقتول کے ورثاء کو دیت معاف کردینے کا اختیار ہے۔ (......) اگر مقتول کی قوم اور تمہارے درمیان صلح کا معاہدہ ہو تو مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنا ہوگا اور مسلمان گردن بھی آزاد کرنا پڑے گی۔

ان آیات میں مقتول کے مومن ہونے کا ذکر ہے لیکن بہت سے اہل علم نے ﴿وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ﴾ سے مراد ذمی لئے ہیں۔ صحابہ کرام میں سے سیدنا عمر، سیدنا عثمان اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور ائمہ فقہ میں سے امام اعظم ابوحنیفہ، ثوری اور زہری رحمہم اللہ کا یہی موقف ہے۔

"وَذَهَبَ اَبُوْحَنِيْفَةَ وَالثَّوْرِيُّ وَهُوَ الْمَرْوِيُّ عَنْ عُمَرَ وَعُثْمَانَ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اِلٰى اَنَّ دِيَتَهُمْ مِثْلَ دِيَةِ

الْمُسْلِمِيْنَ. بِقَوْلِهٖ تَعَالٰی: وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيْثَاقٌ (......)(2)

امام زہری رحمۃ اللہ نے اپنے اس موقف کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"دِيَةُ الْيَهُوْدِيِّ وَالنَّصْرَانِيِّ وَكُلِّ ذِمِّيٍّ مِثْلَ دِيَةِ الْمُسْلِمِ قَالَ: وَكَانَتْ كَذٰلِكَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ".(3)

ترجمہ: یہودی، عیسائی اور ہر ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کی طرح ہے زہری کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین کے زمانے میں یہی حکم تھا۔

سورۃ الانعام میں انسانی جان کو قتل کرنے کی ممانعت کے لئے وصیت کا لفظ فرمایا گیا ہے:۔

﴿"وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ o"﴾ (الانعام: 151)

ترجمہ: اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل نہ کرنا۔ یہ تمہیں اللہ کی وصیت ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

وصیت کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی آخری ناقابل تنسیخ حکم کے ہوتے ہیں۔

انسانی جان کی حرمت کا یہی حکم سورۃ الاسراء میں بھی بیان کیا گیا ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ط اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا﴾ (الاسراء: 33)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل نہ کرو۔ جس شخص کو ظلماً قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے وارث کو (قصاص کا) اختیار دے دیا ہے۔ لیکن وہ قتل کرنے میں زیادتی نہ کرے۔ اس کی مدد کی جائے گی۔

سورۃ الاسراء کا زمانہ نزول معراج اور ہجرت کا درمیانی عرصہ ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ عنقریب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں نے ہجرت کرنا تھی اور مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی معاشرہ اور پھر اسلامی ریاست وحکومت قائم ہونا تھی۔ اس صورت حال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کئی سوالات درپیش تھے کہ نئے اسلامی معاشرے کو کن بنیادوں پر استوار کیا جائے گا؟ خرد اور معاشرے میں انفرادیت اور اجتماعیت کا توازن کیسے قائم کیا جائے گا؟ کن باتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور کن باتوں کی سختی سے ممانعت ہوگی؟ کن باتوں کو قانون کی دخل اندازی کے بغیر صرف اخلاقی تعلیمات سے موثر بنایا جائے گا اور کہاں قانون کو بھی اصلاحی عمل میں شریک کیا جائے گا۔ سورۃ الاسراء میں انہی باتوں کے شافی جوابات ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ بیان کردہ آیت میں قتل کے سلسلے میں مقتول کے وارث کو حکومتی قوت ونصرت فراہم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قتل کے سلسلے میں مقتول کے وارث کے منصور ہونے کا معنی یہ ہے کہ تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال ہوگی اور تشریعی طور پر اللہ کی نیابت میں قائم ہونے والی اسلامی خلافت وحکومت اس کی مدد کرے گی۔

قرآن، آسمانی مذاہب اور انسانی قتل

قرآنی بیانات کی رو سے تمام آسمانی مذاہب اور تعلیمات میں قتل ناحق سے منع کیا گیا ہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو ''لَاَقْتُلَنَّکَ (میں تمہیں قتل کردوں گا)'' کہا تو دوسرے نے جواب میں کہا۔

﴿لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ

لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓأَ بِاِثْمِیۡ وَ اِثْمِکَ فَتَکُوۡنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ ○﴾ (المائدہ:28-29)

ترجمہ: اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ چلائے تو بھی میں تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں چلاؤں گا۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو جہانوں کا رب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو مجھے قتل کرنے کا گناہ اور اپنا وہ گناہ (جس کی وجہ سے تیری قربانی قبول نہ ہوئی) اپنے سر لے تاکہ تو جہنمی ہو جائے اور ظالموں کی سزا یہی ہے۔

ایک بھائی کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی شریعت میں قتل بڑا گناہ تھا جس کا ارتکاب ظلم اور سزا جہنم تھی اور خوف خدا رکھنے والے کے لئے بہتر لائحہ عمل یہ تھا کہ وہ کسی کو قتل نہ کرے خواہ اس کی اپنی جان چلی جائے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے نادانستہ طور پر قتل ہو گیا جس کو قرآن نے بھی قتل نہیں کہا بلکہ "فَقَضٰی عَلَیْہِ" کہہ کر قضائے الٰہی قرار دیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر اس وقت تک رسالت کی ذمہ داریاں بھی نہیں ڈالی گئی تھیں۔ اس کے باوجود آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔

﴿ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ○﴾ (القصص:15)

ترجمہ: اس میں شیطان کا عمل دخل ہے۔ بے شک وہ کھلا دشمن اور دھوکے باز ہے۔

پھر آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معافی طلب کرتے ہیں۔

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ﴾ (القصص:16)

ترجمہ: عرض کی "اے میرے رب! میں اپنی جان پر ظلم کر بیٹھا ہوں مجھے بخش دیجئے"۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے دوسری مثال یہ ہے کہ جب خضر علیہ السلام

نے دوران سفر ایک بچے کو قتل کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا کے پختہ عزم اور وَلَآ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا کے پیغمبرانہ وعدے کے باوجود ایسے مضطرب ہوئے کہ خضر علیہ السلام سے پوچھ ہی لیا۔

﴿اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ط لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا.﴾ (الکہف:74)

ترجمہ: آپ نے گناہ سے پاک جان کو جان کے بدلے کے بغیر قتل کر دیا؟ بے شک آپ نے برا کیا ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اس موقع پر سوال نہ کرنے کا وعدہ بھولے نہ تھے لیکن واقعے کی سنگینی نے آپ کو خاموش نہیں رہنے دیا۔

ان دو مثالوں سے موسوی شریعت میں انسانی جان کو ناحق قتل کرنے کے گناہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ کی تجویز پیش کی تو ایک بھائی نے یہ مشورہ دیا:

﴿قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ﴾ (یوسف:10)

ترجمہ: ان میں سے ایک نے کہا "یوسف کو قتل نہ کرو اور اسے اندھے کنویں میں ڈال دو کہ کوئی قافلہ اس کو لے جائے"۔

ایک بھائی کا یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے سے منع کرنا اور متبادل طریقے سے مقصد حاصل کرنے کا مشورہ دینا اور اس پر تمام بھائیوں کا اتفاق اس بات کا ثبوت ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں بھی قتل بڑا گناہ تھا جس سے خاندان نبوت کے افراد نے بچنے ہی کی کوشش کی۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل سے لئے جانے والے ایک پختہ عہد کا ذکر اس طرح فرمایا:

﴿"وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَاتَسْفِکُوْنَ دِمَآئَکُمْ"﴾ (البقرہ:84)

ترجمہ: یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا کہ تم اپنے لوگوں کا خون نہیں بہاؤ گے۔

اگلی دو آیات میں بنی اسرائیل کی وعدہ خلافی اور سزا کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

﴿ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَکُمْ (......) فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (......) فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ۝﴾ (البقرہ:85-86)

ترجمہ: پھر تم ہی ہو جو اپنے آدمیوں کو قتل کرنے لگے (......) اس جرم کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسوائی اور روز قیامت سخت تر عذاب دیا جائے۔ (......) ان کا عذاب کم ہوگا نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

دنیا کی زندگی میں انتم، تقتلون اور منکم حاضر و مخاطب کے صیغے اور قیامت کے دن یردون، عنھم، ھم اور ینصرون غائب کے صیغے اس بات کا اشارہ ہیں کہ ناحق قتل کے مرتکب قیامت کے دن اللہ کی ملاقات، اس کی بارگاہ میں حاضری، اس کے ساتھ کلام اور اس کی نظر رحمت سے دور کر دیے جائیں گے۔

جان کی حرمت و حفاظت اور احادیث طیبہ

انسانی جان کی حرمت، قتل انسانی کے کبیرہ گناہ ہونے اور مرتکب کے لئے دنیا اور آخرت میں سخت ترین سزاؤں کے قرآنی بیانات سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ حدیث (جو قرآنی متن کی شرح ہے) میں بھی احترام حیات انسانی کی تعلیمات یقیناً موجود ہیں۔ پھر تعدد، تنوع اور تکثر کے لحاظ سے قرآنی فرامین اور احادیث طیبہ میں وہی نسبت ہے جو

ایک متن اور شرح میں ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند ارشادات ضروری وضاحت کے ساتھ درج ذیل ہیں:۔

حدیث اوّل

ہجرت سے کچھ عرصہ پہلے بیعت عقبہ کے موقع پر اس بیعت میں شامل سیدنا عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اِنِّی مِنَ النُّقَبَاءِ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ وَقَالَ: بَایَعْنَاہُ عَلٰی اَنْ لَّانُشْرِکَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا نَسْرِقَ وَلَا نَزْنِیَ وَلَانَقْتُلَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ". (4)

ترجمہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کرنے والے نقیبوں میں سے ہوں اور ہم نے آپ کی بیعت ان باتوں پر کی کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کریں گے، بدکاری نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی محترم ٹھہرائی ہوئی جان کو ناحق قتل نہیں کریں گے۔

حدیثِ اوّل اور اس کے تاریخی پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت، مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرے کا قیام، مسلم اقتدار اور حفاظت جان و مال جیسی حکومتی ذمہ داریاں عائد ہونے سے پہلے پیشگی اقدام وانتظام کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار سے مذکورہ باتوں پر بیعت کا مطالبہ کیا اور انصار نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آپ کی بیعت کی۔ بیعت کا مطالبہ مذکورہ حدیث سے پہلے اسی باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس کے راوی حضرت عبادہ بن الصامت ہی ہیں:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ وَحَوْلَہٗ عُصَابَۃٌ مِّنْ اَصْحَابِہٖ تَعَالَوْا بَایِعُوْنِیْ عَلٰی اَنْ لَّا تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ شَیْئًا(......) (5)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اور آپ کے گرد آپ کے اصحاب کی

ایک جماعت تھی آ ؤ! میری بیعت کرو اس بات پر کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے۔ (......)

یہ حدیث پاک تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ بخاری شریعت میں بارہ دفعہ موجود ہے۔ (6)

حدیث دوم

انسانی جان کی حرمت کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد سیدنا انس بن مالک روایت کرتے ہیں:

أُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. فَاِذَا قَالُوْهَا وَصَلُّوْا صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلُوْا قِبْلَتَنَا وَذَبَحُوْا ذُبِیْحَتَنَا فَقَدْ حُرِّمَتْ عَلَیْنَا دِمَآءُ هُمْ وَاَمْوَالُهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ". (7)

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کروں یہاں تک کہ وہ کہہ دیں لا الٰہ الا اللہ جب انہوں نے یہ کہہ دیا، ہماری نماز پڑھ لی، ہمارے قبیلے کی طرف منہ کر لیا اور ہماری طرح جانور کو ذبح کیا تو ہم پر ان کے خون اور مال حرام ہو گئے سوائے ان مالوں میں محتاجوں کے حق کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

حرم، حرمت، حرام، محرم، احترام اور محترم ایک ہی مادے کے الفاظ ہیں اور ان سب میں ممانعت اور احترام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

یہ حدیث پاک بھی عَلٰی مَا یُقَاتَلُ الْمُشْرِکُوْنَ، مَاجَآءَ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ اور تحریم الدم کے ابواب وعنوانات کے تحت متعدد کتب حدیث میں موجود ہے۔ (8)

حدیث سوم

انسانی زندگی اور خون کے احترام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ عظیم خطاب

شاہد عدل ہے۔ جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ کے میدان میں یوم النحر (قربانی کے دن) جمرۂ وسطیٰ کے پاس ارشاد فرمایا۔ یہ خطاب خطبۂ حجۃ الوداع کے حصے کے طور پر کتابوں میں شامل ہے:

"اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر تقویٰ کے علاوہ کوئی فضیلت نہیں ہے۔ کیا میں نے اللہ کا حکم تم تک پہنچا دیا"؟

لوگوں نے کہا "ہاں! آپ نے اللہ کا حکم پہنچا دیا"۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "یہ کون سا دن ہے؟" لوگوں نے کہا "حرمت والا دن" پھر آپ نے فرمایا "یہ کون سا مہینہ ہے" لوگوں نے کہا "حرمت والا مہینہ" پھر آپ نے فرمایا "یہ کون سا شہر ہے" لوگوں نے کہا "حرمت والا شہر"۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "بے شک اللہ نے تمہارے خون اور مال تمہارے درمیان اسی طرح حرام کر دیئے ہیں جس طرح اس دن اس مہینے اور اس شہر میں۔ کیا میں نے اللہ کا حکم (تم تک) پہنچا دیا؟" لوگوں نے کہا "آپ نے اللہ کا حکم پہنچا دیا"۔

آپ نے فرمایا "یہاں پر موجود ہر آدمی اس تک میرا پیغام پہنچا دے جو موجود نہیں ہے"۔ (9)

بخاری شریف میں یہ روایت کچھ اضافوں کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ایک روایت کے آخری الفاظ قتل وغارت کی ممانعت پر تاکید مزید کی حیثیت رکھتے ہیں:

"وَسَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ فَيَسْأَلُكُمْ عَنْ أَعْمَالِكُمْ. أَلَا فَلَا تَرْجِعُوا بَعْدِي ضَلَالًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ". (10)

ترجمہ: بہت جلد تم اپنے رب سے ملو گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں

پوچھے گا۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

حدیث مذکورہ سے متصل پہلی حدیث میں سیدنا جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ فِی الْحِجَّۃِ الْوِدَاعِ لِجَرِیْرٍ "اِسْتَنْصِتِ النَّاسَ" فَقَالَ لَاتَرْجِعُوابَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ" (11)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع میں حضرت جریر سے فرمایا "لوگوں کو کہو کہ خاموش ہوجائیں" پھر آپ نے فرمایا "میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔"

ان احادیث میں قتل وغارت کرنے والوں کو ضُلّال (گمراہ) اور کفار (کافر کہا گیا ہے)۔ قتل وغارت گری کی کسی کاروائی میں شریک ہونے والوں کو ان الفاظ پر غور کرنا چاہیے۔

یہ حدیثِ پاک ' بخاری کے علاوہ مسلم کی کتاب القسامہ میں، ابوداؤد کی کتاب المناسک میں، ترمذی کی کتاب التفسیر میں، ابن ماجہ کی کتاب المناسک میں اور مسند احمد بن حنبل میں دس دفعہ روایت کی گئی ہے۔ (12)

حدیث چہارم

انسانی جان کی حرمت کے بارے میں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بہت پر کیف لیکن انتہائی فکر انگیز ہے جسے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:-

رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ یَطُوْفُ بِالْکَعْبَۃِ وَیَقُوْلُ "مَآاَطْیَبَکَ وَاَطْیَبَ رِیْحَکَ. مَآ اَعْظَمَکَ وَاَعْظَمَ حُرْمَتَکَ. وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَحُرْمَۃُ الْمُؤْمِنِ اَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰہِ حُرْمَۃً مِنْکَ مَالُہٗ وَدَمُہٗ وَاَنْ لَا نَظُنَّ بِہٖٓ اِلَّا خَیْرًا". (13)

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور کہتے جاتے تھے (اے کعبہ!) تو کتنا پاکیزہ ہے! تیری خوشبو کتنی پاکیزہ ہے! تو کتنا عظیم ہے! تیری حرمت کتنی عظیم ہے! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے! اللہ کے ہاں مسلمان کی حرمت تیری حرمت سے بڑھ کر ہے اس کے مال کی بھی اس کے خون کی بھی۔ اور یہ کہ ہم مسلمان کے بارے میں حسن ظن سے کام لیں۔

اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث ترمذی میں ہے:-

نَظَرَ ابْنُ عُمَرَ يَوْمًا اِلَى الْبَيْتِ اَوْ اِلَى الْكَعْبَةِ فَقَالَ: مَا اَعْظَمَكَ وَاَعْظَمَ حُرْمَتَكَ وَالْمُؤْمِنُ اَعْظَمُ حُرْمَةً عِنْدَ اللّٰهِ مِنْكَ. (14)

ترجمہ: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک دن کعبہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تو کتنا عظیم ہے! اور تیری حرمت کتنی عظیم ہے! لیکن اللہ کے ہاں حرمت کے لحاظ سے مسلمان تجھ سے زیادہ عظیم ہے۔

خانہ کعبہ سے بڑھ کر مومن اور اس کی جان ومال کی حرمت پر یہ دوسری گواہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر اتباع سنت میں منفرد شہرت کے مالک ہیں اور آپ نے خانہ کعبہ کو یہ الفاظ ادائے محبوب کی اتباع میں کہے ہیں۔ اصطلاح حدیث میں صحابی کا قول حدیث موقوف کہلاتا ہے لیکن اس قول کی نوعیت اس کے مرفوع ہونے پر دلالت کر رہی ہے کہ ایک جلیل القدر راور روایتِ حدیث میں محتاط صحابیؓ اتنی بڑی بات اپنی طرف سے نہیں کہہ سکتے۔

حدیث پنجم

انسانی جان کی حرمت پر سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا یہ بیان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فکر وعمل کی واضح تصویر پیش کرتا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حرقات کے علاقے میں فوجی مہم پر بھیجا۔ وہاں کے لوگ ڈر کر بھاگ گئے۔ ایک آدمی ہمارے قابو آ گیا۔ ہم اسے قتل کرنے لگے تو اس نے کہہ دیا "لا الہ الا اللہ" ہم نے اسے قتل کر دیا۔ میں نے اس بات کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا۔ آپ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن لا الہ الا اللہ کے مقابلے میں تیری کون مدد کرے گا"؟ میں نے عرض کی "یارسول اللہ! اس نے ہتھیار کے ڈر سے لا الہ الا اللہ کہا تھا" آپ نے فرمایا "اس کا دل چیر کر دیکھ لیتے کہ اس نے کس ارادے سے کلمہ پڑھا تھا" قیامت کے دن لا الہ الا اللہ کے مقابلے میں تیرا کون ہوگا؟" آپ بار بار "مَنْ لَکَ بِلَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ یَوْمَ الْـقِیٰـمَةِ" فرماتے رہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کاش میں اسی دن مسلمان ہوتا (تاکہ قبول اسلام کے وجہ سے قتل کا گناہ معاف ہو جاتا)۔ (15)

اس واقعے کی مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے: صحیح مسلم۔ (16)

حدیث ششم

میدان جنگ میں مغلوب ہونے پر لا الہ الا اللہ پڑھنے کا واقعہ ایک اور آدمی کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ اس نے میدان جنگ میں کلمہ پڑھنے والے دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور استغفار کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا "اللہ کی قسم! میں تیرے لئے استغفار نہیں کروں گا" کچھ عرصے کے بعد وہ آدمی مر گیا تو رشتہ داروں نے اسے دفن کر دیا۔ اگلی صبح اس کی لاش قبر سے باہر پڑی تھی۔ رشتہ داروں نے سمجھا کہ کوئی دشمن ایسی حرکت کر گیا ہے۔ چنانچہ دوبارہ دفن کرنے کے بعد قبر پر پہرہ بٹھا دیا۔ انہوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ قبر پھٹ گئی اور زمین نے اسے پھر باہر نکال پھینکا۔ یہ منظر دیکھ کر رشتہ داروں نے اسے دفن کئے بغیر کہیں پھینک دیا۔ (17)

حدیث ہفتم

بیان کردہ واقعات کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بھی کتب کی زینت ہے جس سے انسانی جان کی حرمت اور عین میدان جنگ میں جان لینے سے ممکنہ اجتناب کی تعلیم حاصل ہوتی ہے:

> سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے عرض کی "یا رسول اللہ! کوئی کافر مجھ سے جنگ کرے اور تلوار سے میرا ایک ہاتھ کاٹ دے۔ پھر درخت کی اوٹ میں ہو کر کہہ دے "میں اللہ کے لئے مسلمان ہوتا ہوں" کیا میں اسے قتل کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اس کو قتل نہ کرنا" میں نے عرض کیا "اس نے میرا ہاتھ کاٹ دیا تھا"۔ فرمایا "اس کو قتل نہ کرنا اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو اس کی جگہ پر تو اور تیری جگہ پر وہ آ جائے گا"۔ (18)

حدیث کے آخری حصے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تو مسلمان ہو کر پچھلے سارے گناہ معاف کروا چکا اور مسلمان ہوتے ہی قتل ہونے پر کوئی گناہ کئے بغیر سیدھا جنت میں جائے گا اور مسلمان قاتل ایک مسلمان کو قتل کرنے کی وجہ سے جہنمی ہو جائے گا جیسا کہ قرآن کریم میں قتل عمد کرنے والے کی سزا ﴿فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا﴾ بیان ہوئی ہے۔

اختتامیہ

انسانی جان کی حرمت وحفاظت خالص ریاستی اور حکومتی فریضہ ہے۔ اس لئے کہ اس اہم ترین فرض کی ادائیگی میں قانون، نفاذ، خلاف ورزی، گرفت، تفتیش، تحقیق، عدالت، منصف، فیصلہ، عمل درآمد وغیرہ تمام مراحل میں ریاست کے تینوں اجزائے ترکیبی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ پورے طور پر شامل ہوتے ہیں اور ان اداروں کی بھرپور شمولیت اور شرکت کے بغیر یہ فرض کماحقہٗ ادا نہیں ہو سکتا۔

مصادر ومراجع

(1)الشوکانی محمد بن علی، فتح القدیر، 490/1، دار الکتاب العربی بیروت، 1998ء۔

(2)سید سابق، فقہ السنۃ، 47/3۔ باب دیۃ اہل الکتاب، احیاء التراث الاسلامی بیروت، 2000ء۔

(3)ایضاً۔

(4)البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب مناقب الانصار، باب و فود الانصار الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ص 654، دار السلام۔ ریاض۔

(5)ایضاً۔

(6)البخاری، الجامع الصحیح، احادیث نمبر 18، 3892، 3893، 3999، 4894، 6784، 6801، 6873، 7055، 7199، 7213، 7468۔ دار السلام۔ ریاض۔

(7)البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل استقبال القبلہ، حدیث 392 ص 69 دار السلام۔ ریاض۔

(8)ابوداؤد سلیمان بن اشعث، السنن، کتاب الجہاد، باب علی ما یقاتل المشرکون، حدیث 2640، 2641۔ ص 381، دار السلام ریاض۔

ترمذی محمد بین عیسی، الجامع، کتاب الایمان، باب ماجاء ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ، احادیث 2606، 2607، 2608، ص 591-592، دار السلام۔ ریاض۔

النسائی، احمد بن شعیب السنن، کتاب محرم الدم، باب تحریم الدم، احادیث 3971، 3972، 3973، ص 554، دار السلام۔ ریاض۔

(9)احمد بن حنبل الامام، المسند، 411/5، دار الفکر بیروت۔

(10)البخاری، الجامع الصحیح، کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع، حدیث 4406 ص 747، دار السلام ریاض۔

(11)البخاری، الجامع الصحیح، کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع، حدیث 4405 ص 747، دار السلام ریاض۔

(12)ونسنک، المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی، 392/7، مطبعۃ بریل لیڈن، 1955۔

(13)ابن ماجہ، محمد بن یزید القزوینی، السنن، کتاب الفتن، باب حرمۃ دم المومن و مالہ حدیث 3932 ص 564، دار السلام۔ ریاض۔

(14)الترمذی، الجامع، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی تعظیم المومن، حدیث 2032، ص 468،

دارالسلام۔ریاض۔

(15) ابوداؤد، السنن، کتاب الجہاد، باب علی مایقاتل المشرکون، حدیث 2643، ص 381، دارالسلام ریاض۔

(16) مسلم، الامام مسلم بن حجاج بن مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب تحریم قتل الکافر بعد قولہ لاالہ الا اللہ، حدیث 160,159,158 ص 57,56، دارالسلام ریاض۔

(17) احمد بن حنبل الامام، المسند، 439/4 حدیث 19959، نشر السنۃ ملتان۔

(18) ابوداؤد، السنن، کتاب الجہاد، باب علی مایقاتل المشرکون، حدیث 2644، ص 381، دارالسلام ریاض۔

عالمی سطح پر مسلمانوں کو درپیش تہذیبی مسائل
اور ان کا حل
سیرت طیبہ کی روشنی میں

محمد اسلم الوری

عالمی سطح پر مسلمانوں کو درپیش تہذیبی مسائل اور ان کا حل سیرت طیبہ کی روشنی میں

محمد اسلم الوری

زیر نظر مضمون میں ہم سیرت طیبہ کی روشنی میں اس امر کا جائزہ لیں گے کہ دور حاضر میں عالمی سطح پر مسلم معاشرہ کو کس قسم کے تہذیبی چیلنجوں کا سامنا ہے؟ مغربی معاشروں میں مسلمانوں کو درپیش مسائل و امور کی نوعیت کیا ہے اور سیرت طیبہ کی روشنی میں مختلف الخیال مذہبی گروپوں کے مابین اشتراک و تعاون اور متعلقہ مسائل کے حل کی بہترین صورت اور طریقہ کار کیا ہو سکتا ہے؟

مذاہب عالم میں اسلام کا مقام

تہذیب و تمدن کی تشکیل میں عقائد و افکار بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ سماجی اعمال انسان کے قلب و ذہن اور شعور و تحت الشعور میں جاگزیں اعتقادیات سے جنم لیتے ہیں۔ عقائد و افکار کا سرچشمہ ہر دور میں رائج مختلف مذاہب اور فلسفیانہ نظریات میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ فلسفہ اور مذہب ہی انسانی معاشروں کی صورت گری کرتے اور انہیں مقصد کا شعور عطا کرتے ہیں۔ مذہب کی گرفت کمزور پڑتے ہی معاشرے بے راہروی اور داخلی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ورلڈ کرسچین انسائیکلوپیڈیا کے مدیر کے نزدیک کلیساؤں اور

مذاہب کے تقابلی جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں اُنیس (19) بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں جو دو سو ستر (270) بڑے اور متعدد چھوٹے مذہبی فرقوں میں منقسم ہیں۔ دنیا میں فقط عیسائیوں کے تین ہزار چار سو (3400) مکاتب فکر کی نشاندہی کی گئی ہے' جن میں نصف کے قریب' بڑے فرقوں سے الگ تھلگ خودمختار کلیسا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ متعدد قدامت پرست عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ عیسائی بننے کے لئے دوسرا جنم لینا ضروری ہے۔ امریکہ اور کینیڈا کے تقریباً ایک ہزار عیسائی مذہبی گروہ اپنے علاوہ کسی دوسرے فرقے کو عیسائی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ بہرحال دنیا بھر کی آبادی کو مذہبی بنیادوں پر درج ذیل انداز میں تقسیم کیا ہے:۔

نمبر شمار	مذہب	آبادی	فیصد
1	عیسائیت	2.039ارب	32
2	اسلام	1.226ارب	19
3	ہندومت	82.8 کروڑ	13
4	لادین	77.5 کروڑ	12
5	چینی	39.0 کروڑ	6
6	بدھ مت	36.4 کروڑ	6
7	قبائلی مذاہب	23.2 کروڑ	4
8	منکرین خدا	15 کروڑ	2
9	نوزائیدہ مذاہب	10.3 کروڑ	2
10	سکھ مت	2.38 کروڑ	1سے کم
11	یہودیت	1.45 کروڑ	1سے کم

12	روحانی ازم	1.26 کروڑ	1سے کم
13	بہائی	74لاکھ	1سے کم
14	کنفیوشش	63لاکھ	1سے کم
15	جین مت	43لاکھ	1سے کم
16	زرتشت	27لاکھ	1سے کم
17	شنٹو	27لاکھ	1سے کم
18	تاؤمت	27لاکھ	1سے کم
19	دیگر	11لاکھ	1سے کم
20	وکہ (Wicca)	5لاکھ	1سے کم

جدید تحقیقی اعداد و شمار کے مطابق اس وقت مغربی معاشروں میں اسلام سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ دیگر معاشروں کے مقابلہ میں آبادی کی تیز تر شرح افزائش، دنیا بھر کے مسلمانوں میں روزگار اور بہتر معیار زندگی کی تلاش میں مغربی ممالک کی جانب ہجرت، نومسلم دانشوروں اور صوفیاء کی تبلیغی مساعی اور خود دین متین کے اعلیٰ و ارفع اصول و ضوابط کی برکات' اس کے چند محرکات ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام ادیان عالم اپنی حقیقی اور اصلی تعلیمات و افکار کے حوالے سے محبت و آشتی، امن سلامتی اور انسانی ترقی و خوشحالی کا سبق دیتے ہیں۔ جہاں تک دین مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء کا تعلق ہے یہ محض چند مذہبی اعمال و رسومات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ آخری الہامی مذہب ہونے کی حیثیت سے پیغمبر اسلام اللہ کے آخری نبی اور قرآن حکیم خداوند قدوس کی طرف سے قیامت تک آنے والے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل کی جانے والی آخری الہامی کتاب ہے۔ ہمارے آقا و مولا

حضور سید لولاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہی نہیں رحمت للعالمین بھی ہیں۔ آپ انبیاء سابقین کی شاندار روایت کے امین اور ان کی نبوت کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ دین مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء کے دامن میں جملہ انبیاء کرام کی تعلیمات اور الہامی کتب وصحائف میں درج آسمانی ہدایات واحکامات نگینے کی طرح جڑے ہیں۔ قرآن حکیم ان علوم ومعارف کا خزینہ ہے جو پروردگار عالم نے انسانوں کی ابدی ہدایت وسعادت کے لئے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائیں۔ مذاہب عالم کے مابین توحید باری تعالیٰ اور وحدت نسل انسانی کا نظریہ ایک مشترکہ اساس کا درجہ رکھتا ہے لیکن دوسرے ہزاریے میں کلیسا کے زیر اثر ان بنیادی عقائد سے انحراف نے عیسائی معاشروں میں تثلیث اور وطنیت کے گمراہ کن اور انسانیت دشمن افکار کو جنم دیا ہے' جس سے انسان اور خالق کے مابین ربط وتعلق کا احساس اور اس کی شدت جو نفسانی خواہشات پر غلبہ پانے اور اس کے سماجی اعمال صالح کی تشکیل میں قوت محرکہ کا فریضہ انجام دیتی تھی یکسر کمزور ہوگئی ہے اب خلوص وللّٰہیت کی جگہ مادیت، مساوات انسانی کی جگہ طبقاتی تفاوت اور ایثار وقربانی کی جگہ حرص وہوس راہ پاگئے ہیں۔

عالمی منظر نامہ

تیز رفتار سائنسی ترقی اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے فروغ کے نتیجہ میں تشکیل پذیر موجودہ عالمی انسانی بستی (Global Village) اپنی تاریخ کے شدید ترین داخلی بحران سے دوچار ہے۔ بے پناہ اقتصادی ترقی اور عالمگیریت کے فروغ کے نتیجے میں دنیا کو ہر طرف غربت وافلاس، قحط سالی، جہالت وناخواندگی، بیماری وناداری، جنسی استحصال وکجروی، خواتین وبچوں پر تشدد، منشیات اور مہلک ہتھیاروں کا پھیلاؤ، انسانوں کی تجارت، بدامنی وخونریزی، جنگ وجدل، دہشت گردی، ماحولیاتی آلودگی، پانی کے ذخائر کی کمی اور پیچیدہ جسمانی ونفسیاتی امراض جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ یورپ میں جدید افکار کے سامنے اہل

کلیسا کی پسپائی اور رسوائی کے نتیجہ میں جو تہذیبی و نظریاتی خلا پیدا ہوا تھا اسے وطنیت (Nationlism)' اشتراکیت (Communism) اور لامحدود ترقی (Unlimited Development) کے جدید مذاہب نے پر کیا تھا۔ نہایت عمیق غور و فکر اور گہرے تجزیے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ لامحدود آزادی' عقلیت اور مادہ پرستی کے بطن سے جنم لینے والے ان تینوں جدید تہذیبی رجحانات کے پس پردہ خودغرضی' انا پرستی' حرص اور بے لگام نفسانی خواہشات کا عفریت کارفرما ہے' جس نے دنیا بھر کے انسانی معاشروں سے محبت و مروت' ایثار و قربانی' تحمل و برداشت' رواداری اور عدم تشدد جیسے اعلیٰ انسانی اوصاف کا خاتمہ کر کے زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ کائنات کے بیشتر مشترکہ انسانی وسائل پر چند طاقتور ممالک اور ان کی مسانید اقتدار پر مسلط مٹھی بھر اقلیتی افراد نے بزور شمشیر قبضہ کر رکھا ہے۔ ان استحصالی قوتوں کو جدید دور کے نمرود' فرعون' ہامان' شداد اور قارون سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو جدید تہذیبی ہتھیاروں سے لیس کہیں مذہب مخالف اور کہیں مذہب کے پردے میں پوری انسانیت کا خون چوسنے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے دنیا بھر کے معاشروں کو بے یقینی' بدامنی' ناپائیداری اور عدم استحکام کی آتش سوزاں میں جھونک رکھا ہے۔

مغرب کا عمومی رد عمل

11 ستمبر 2001ء کو امریکہ میں دہشت گردی کے واقعات کے بعد اسلام اور مغرب کے مابین عدم اعتماد اور بدگمانی میں یکدم اضافہ ہو گیا ہے اس کی وجہ اسلام دشمن قوتوں کا وہ زہریلا پروپیگنڈہ ہے جو تمام ذرائع ابلاغ سے مسلسل دنیا بھر میں مسلمانوں اور ان کی مذہبی اقدار و روایت کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ مذہبی جنون اور انتہا پسندانہ اقدامات اور پالیسیوں کے نتیجہ میں پورا مغرب خاص طور پر مسلم اقلیتیں نفرت و حقارت، تشکیک و ابہام اور سماجی و داخلی کشمکش کی ایسی خوفناک فضا میں سانس لینے پر مجبور ہیں جو کسی بھی وقت مادی ترقی کے قصر رفیع کو زمیں بوس کر سکتا ہے۔ مغربی مفکر ہمنگٹن کے بقول آئندہ عالمی

جنگ مذہب اور ثقافت کی بناء پر لڑی جائے گی۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت و ملامت اور انتہاء پسندی کو فروغ دینے میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خائف عالمی سوداگر، صیہونی طاقتیں اور غیر ذمہ دار عیسائی رہنما اور ان کے زیر اثر سرگرم عمل ذرائع ابلاغ سے تعلق رکھنے والے افراد پیش پیش ہیں۔ دنیائے انسانیت کو ایک جانب بڑھتی ہوئی انتہاء پسندی کے نتیجہ میں سنگین تصادم و خونریزی کا سامنا ہے تو دوسری جانب گوناگوں عالمی مسائل نے خود انسانی بقاء کے لئے شدید خطرات لاحق کر دیئے ہیں اور اس وقت انسانی بقاء کو خود انسان سے خطرہ لاحق ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عصر حاضر کے مسائل کو پائیدار بنیادوں پر حل کرنے کی حقیقی اہلیت واستعداد آج بھی اسلام کے نظام اقدار و افکار پر پوری طرح عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے۔ دین مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء کی سماجی، معاشی اور سیاسی تعلیمات انسانیت کو درپیش مسائل کا بہترین حل پیش کرتی ہیں اس کے دامن میں پنہاں بے پناہ، اخلاقی قوت، روحانی توانائی اور تعلیم و ترقی کی جانب تیزی سے گامزن مسلم معاشروں میں پیدا ہونے والی بیداری نے دور جدید میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے امکانات کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔

مغربی طاقتیں اس وقت جو کام کر رہی ہیں ان کا سارا زور مسلمانوں میں اسلامی روح کو کچلنا، انہیں ان کے تشخص سے محروم کرنا، اپنی ذات پر اعتماد متزلزل کرنا اور مسلمانوں کو اقتصادی، سیاسی، سائنسی اور اسلحہ کی غلامی میں مبتلا رکھ کر ایک دوسرے سے دست و گریباں کر کے ان کو متحد ہونے سے روکنا ہے۔ گزشتہ دو عشروں میں مسلمانان عالم کو ہر جگہ ہر مقام اور ہر وقت نشانہ بنانے کی پالیسیوں نے مسلمانوں کی نئی نسل کو ان کے مذہبی حقوق اور دینی ذمہ داریوں کے بارے میں کافی حد تک تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب وہ مغرب کے تمام تر اقدامات کو بلا چون و چرا ماننے کے بجائے ان کے تنقیدی جائزہ کے ذریعے اصلی مضمرات اور محرکات تک رسائی کی جستجو کرتے ہیں۔ مسلم معاشروں خاص کر مغرب میں

پروان چڑھنے والی مسلمان نسل میں، شعوری سطح پر پیدا ہونے والے جداگانہ مذہبی تشخص کا یہ احساس اور اہل مغرب کی اسلام مخالف پالیسیوں اور اقدامات سے پیدا ہونے والی ذہنی وقلبی اذیت مل کر ایک نئے فکری وعملی ماحول کی صورت گری کر رہے ہیں۔ شکست وندامت کا احساس اب احساس ذمہ داری میں ڈھل رہا ہے اور مغرب کی موجودہ معاندانہ پالیسیوں کے گہرے تجزیے اور مسلم امہ کو درپیش مسائل کے جائزہ سے اب ترقی ونجات کی نئی راہیں کھل رہی ہیں۔

مصطفائی معاشرہ کے امتیازات

جنگ اور سماجی ناانصافی تہذیب مغرب کے مظاہر ہیں، جن کے پس پردہ دولت کے حرص اور اقتدار اعلیٰ کی ہوس جیسے سفلی اور منفی جذبات کارفرما ہیں۔ ان منفی محرکات کا واحد حل دینِ مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء پر کامل ایمان اور عمل درآمد میں مضمر ہے۔ دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین رحمت اور دین محبت ہے۔ یہ ایثار وقربانی کا تقاضا کرتا ہے، جو ہر مذہب کا اساسی نکتہ ہے۔ اسلام عظمت انسانی اور وحدت نسل انسانی کا علمبردار ہے۔ اس کے نزدیک تمام مخلوق عیال اللہ یعنی خدا کا کنبہ ہے جس کے ہر فرد کی عزت وحرمت اور فلاح وبہبود اجتماعی ذمہ داری ہے۔ ٹائن بی کے بقول ایک انسان اس وقت تک باعظمت ہے جب تک وہ بے لوث، بے غرض، رحم دل، محبّ اور دوسروں کے لئے نیز کائنات کے لئے وقف ہو۔ جہاں تک وہ حریص اور جارح ہے وہ نامحترم ہے۔ انسان کے لئے اپنی زندگی کے ہر پہلو کو عملی سطح پر باوقار بنانے کا صرف یہی راستہ ہے کہ وہ نفرت اور ضرر رسانی کو ترک کردے اور حسن ومحبت کے ساتھ عمل کرنے کا جویا ہو۔ جاپانی مصلح اکیدا کے نزدیک مذہب کا حقیقی وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسان کو خواہش کے مغلوب کرنے کی قوت دے اور انسانیت کو اس کی انتہا تک فروغ دے۔ مذہب کے لئے لازم ہے کہ وہ انسان کو اس قوت حیات سے باخبر رکھے جو اس کے وجود کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے اور اس میں یہ حوصلہ پیدا کرے کہ

وہ اس قوت حیات کو کلی قوت حیات میں ضم کر سکے۔

قرآن وسنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی روشنی میں تشکیل پانے والے مصطفائی معاشرہ میں خواہشات نفسانی کو مذموم گردانا گیا ہے۔ یہاں شر کا ترک کر دینا بھی صدقہ ہے۔ اس معاشرہ کا فرد اس وقت تک ایمان کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا جب تک اپنی محبوب ترین شے کو خواہ وہ مال و دولت ہو یا عزت و ناموس، اپنے خالق حقیقی کی راہ میں قربان نہ کر دے۔ مسلم معاشرہ کو ایک جسد واحد سے تشبیہ دی گئی ہے' جس کا ایک عضو یعنی فرد اگر تکلیف میں ہو تو پورا جسم (معاشرہ) اذیت محسوس کرتا ہے۔ مصطفائی معاشرہ میں بھوک' افلاس اور غذائی قلت رواج نہیں پا سکتے ہیں کیونکہ اس کا ہر فرد اس بات کا مکلف ہے کہ وہ بھوکوں کو کھانا کھلائے۔ جس کا ہمسایہ رات کو بھوکا سو گیا اس سے باز پرس کی جائے گی۔ اپنے ماتحتوں کو وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔ یہ وہ مثالی معاشرہ ہے جس میں کم تولنے اور کم ماپنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ اشیاء میں ملاوٹ باقاعدہ جرم ہے جس کے ارتکاب کے بعد وہ فرد معاشرہ کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہاں افراد معاشرہ کو تعمیری اور بھلائی کے کاموں میں تعاون واشتراک کا حکم ہے اور برائی کے کاموں یعنی منفی سرگرمیوں میں کسی بھی قسم کے تعاون سے منع کیا گیا ہے۔ مصطفائی معاشرہ عدل وانصاف پر مبنی معاشرہ ہے جہاں ہر فرد عدل وانصاف کے قیام کے لئے ہر قسم کے رشتوں سے بالاتر ہو کر حق کی گواہی دینے کا پابند ہے۔ یہاں سب کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے۔ رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ جرم ثابت ہونے پر سزا دیتے ہوئے سماجی حیثیت اور نام ونسب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا خواہ وہ خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اپنی بیٹی فاطمہ کیوں نہ ہو۔ مسلم معاشروں میں ذکر الٰہی سے اغماض کو معاشی تنگ دستی اور فحاشی وعریانی کو پیچیدہ امراض کے پھیلاؤ کا سبب گردانا جاتا ہے۔ یہاں عزت واحترام اور اعزاز واکرام کی بنیاد نام ونسب نہیں' تقویٰ ہے۔ علم مومن کی

میراث ہے۔ تلاش و جستجو، کائنات پر غور و فکر اور خود اپنے باطن کا جائزہ' مذہبی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ بھلائیوں اور نیکیوں کی ترویج اور منکرات سے بچنے کی تلقین ایک مسلسل دینی و معاشرتی عمل ہے' جو معاشرہ کی ہر سطح پر بحسن و خوبی جاری رہتا ہے۔

اسلام باہمی مفاہمت' مکالمہ' رواداری' عدم تشدد اور تحمل و برداشت پر یقین رکھتا ہے۔ قرآن حکیم نے اہل کتاب سے مکالمہ و مجادلہ کے وقت بھی حکمت اور تہذیب و شائستگی سے کام لینے کی تلقین کی ہے۔ قول سدید اور حسن گفتار مصطفائی معاشرت ہی کے امتیازات ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں جنگوں میں بھی معبدوں کے تقدس کو مدنظر رکھا جاتا تھا تاکہ کسی راہب کی خانقاہ اور عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ بعض معاہدات کی رو سے کلیساؤں کی حفاظت اور ان کی تعمیراتی دیکھ بھال کا انتظام بھی اسلامی حکومت کے ذمہ تھا۔ مسلم اکثریتی علاقوں' جیسے پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک پر تاریخ شاہد ہے۔ خود ہندوستان پر مسلمانوں کے ہزار سالہ دور اقتدار میں اکثریتی ہندو آبادی کے ساتھ مسلم سلاطین اور بادشاہوں کا حسن سلوک آج بھی ضرب المثل ہے۔

ممتاز مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی تحقیق کے مطابق:

> "شیر شاہ سوری کا کہنا تھا مسلم اور غیر مسلم میرے انصاف کے یکساں مستحق ہیں۔ ہندو اپنے مذہب پر اعلانیہ اور نمود و نمائش کے ساتھ عمل کرتے تھے۔ جلیل القدر سلاطین کے ذاتی احساسات کو مذہبی رواداری کی حکمت عملی میں مزاحم نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ ہندو مت کی رسوم پوری طرح ادا کی جاتی تھیں۔ ہندو اپنے تہواروں کے موقعوں پر ناچتے ہوئے' گاتے ہوئے اور باجا بجاتے ہوئے جلوس نکالتے تھے۔ ہندو تعلیمات کا حق پوری طرح تسلیم کیا جاتا تھا۔ مسلم ثقافت کو جبراً مسلط نہیں کیا گیا۔ مسلم مدارس و مکاتب کے دروازے سب پر کھلے تھے۔ مسلم حکمران اور ادیب

ہندوؤں کی ثقافت اوران کے علم کا احترام کرتے تھے۔ ہندوستان کے پرسوز اور فکر انگیز نغمے تنومند ترک سپاہیوں کے جری دلوں کو متاثر کرتے تھے اور خسرو جیسا عظیم الشان شاعر ہندوموسیقی کی لے پر اپنے گیت گانے میں کسر شان محسوس نہیں کرتا تھا۔ کفار اور مشرکین کو خراجی اور ذمی سمجھا جاتا' بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا جاتا اور ان کی عزت کی جاتی۔ انہیں صوبوں کی امارتوں' اعلیٰ عہدوں اور اہم آسامیوں پر مقرر کیا جاتا۔ سماجی حیثیت سے بھی ہندو کو حقیر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مسلمان عموماً نسلی تعصب سے ہمیشہ نمایاں طور پر آزاد رہے۔ مسلم امراء کی' ہندو لڑکیوں سے شادیاں، مسلم صوفیاء اور ہندو یوگیوں میں آزادانہ روابط' ہندو بزرگوں کے مسلم چیلے' اس رواداری کی عمدہ مثال ہیں''۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری کے نزدیک "غیر مسلموں کے ساتھ تجارت کرنا یا عام انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں ان کے ساتھ تعاون کرنا عالمی امن وسلامتی کی بقاء کے لئے مل کر کوشش کرنا یا ایک مشترکہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ان سے فوجی پیکٹ کرنا یا عام میل جول اور معاشرت میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور خندہ پیشانی سے پیش آنا' قطعاً ممنوع نہیں"۔

مسلم تہذیب کی تشکیل اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مسلم معاشروں میں رنگ و نسل کے امتیازات' علاقائی تنازعات اور ثقافتی اختلافات کے باوجود' جو قوت انہیں مقامی' علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر اتحاد و یکجہتی کا جواز فراہم کرتی اور تمام تر جارحانہ ریشہ دانیوں اور وسیع تر تخریبی کارروائیوں کے باوجود بکھرنے نہیں دیتی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ سے بے پناہ محبت اور وابستگی ہے۔ ذات مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء سے ربط و تعلق کی یہی وہ محکم اساس ہے جس پر ایمانیات کا

دارومدار ہے۔ گناہگار سے گناہگار اور فسق و فجور میں سرتاپا غرق مسلمان بھی اپنے آقا و مولیٰ کی عزت و حرمت اور عظمت و ناموس پر کٹ مرنے اور اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا پاکیزہ جذبہ رکھتا ہے اور اسے اپنے گناہوں کا کفارہ اور وجہ نجات سمجھتا ہے۔ گزشتہ دنوں توہین آمیز خاکوں کے نتیجے میں تمام تر مسلم معاشروں میں ہر سطح پر پیدا ہونے والا عالمی ردعمل اور عامر عبدالرحمٰن چیمہ کی جرمن پولیس کے ہاتھوں شہادت اس حقیقت کا واضح اظہار ہے۔

محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاکیزہ جذبہ قرآن حکیم کی آیات اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطالعہ سے جنم لیتا ہے۔ صوفیاء کرام اور علمائے اسلام نے ہر دور میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس متاع گرانمایہ کی حفاظت وآبیاری کی ہے اور اسے عوام کے قلوب میں راسخ کرنے میں بھی کوتاہی اور تساہل سے کام نہیں لیا۔ مسلم معاشروں کی تباہی و بربادی اور معاشی وسیاسی پسماندگی کے باوجود عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چنگاری ان کی خاکستر میں مسلسل سلگ رہی ہے اور مغرب کو یقین ہے کہ یہ چنگاری مناسب ماحول پاکر کسی بھی وقت شعلۂ جوالہ بن سکتی ہے' جو حرص و ہوس اور شیطانی خواہشات کی نازک شاخ پر قائم مغربی ترقی کے خوشنما آشیانے کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے۔

''مسلمانوں کے زوال کا اصلی سبب دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں سے کوتاہی ہے۔'' حجۃ الاسلام مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ''ہمارا پہلا مقصد تبلیغ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ اور تابعین کا ہر فرد اسلام کا مبلغ تھا اور ایسا مبلغ کہ اس کی زندگی کا مقصد تنہا اسلام کی تبلیغ تھی اور بس۔ ان کا طرز عمل دینداری' پاکبازی کا بہترین معلم تھا۔ غرض مسلمانوں کے جس طبقہ پر نظر ڈالیے وہ اسلام کا مبلغ نظر آتا ہے۔ بادشاہ ہے تو مبلغ، وزیر ہے تو مبلغ، امیر ہے تو مبلغ، بینوا فقیر ہے تو مبلغ، حضر و سفر میں تبلیغ، بر و بحر میں تبلیغ، دنیا میں دھوم مچادی، غلغلے ڈال دیئے، زمانہ معمور کر دیا۔ جہاں رنگ ڈالا عالم کو اسلام کا متوالہ بنا دیا''۔

امتِ مسلمہ کے ہر فرد اور خاص طور پر اس کے وسائل و ذرائع پر قابض افراد کا اصل کام مصطفائی طریق پر دعوت و تبلیغ ہے جو مسلمانوں کے لئے باطنی توانائی فراہم کرتی ہے۔ دعوت کا یہ عمل اس بے پناہ محبت اور شفقت کے بطن سے پھوٹتا ہے جس میں ہر مسلمان دوسرے کی خیر خواہی ورد نیوی و اخروی فلاح کے لئے ہمہ وقت بے قرار رہتا ہے۔

رسول رحمت علیہ التحیہ والسکینت کی ذات مقدسہ سے قلبی نسبت اور جذباتی لگاؤ آپ کے حسین کردار و سیرت کو اپنانے کی دعوت دیتا ہے اور محبت رسول قلب مسلم کو اطاعت واتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ابھارتی ہے۔ سیرت طیبہ کی روشنی میں انفرادی کردار اور رویوں کی تشکیل سے ایک صالح معاشرہ اور پاکیزہ تہذیب و معاشرت جنم لیتی ہے جو مغرب کی بے فیض، مفاد پرست، خود غرضانہ، ظاہری نمود و نمائش اور حرص و ہوس پر مبنی ثقافت سے یکسر ممتاز نظر آتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے مغرب کے معاشی و سیاسی مفادات پر زد پڑتی ہے اور وہ مسلم معاشروں میں بڑھتی ہوئی راسخ العقیدگی کو مسلم بنیاد پرستی کا نام دے کر پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے اور مکروہ ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔

جدید تہذیبی مسائل

مسلمان مختلف الخیال معاشروں میں رہن سہن کا طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ اسلام کی تحمل و برداشت، حسن سلوک اور باہمی رواداری کی تعلیمات نے انہیں مقامی آبادیوں اور ان کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کی بے پناہ صلاحیت عطا کی ہے لیکن اس مفاہمت و ہم آہنگی کی بھی کچھ حدود ہیں جنہیں عبور کر کے بطور مسلمان اپنے مذہبی عقائد و نظریات کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یورپ اور مغربی معاشروں میں کلیسا کے زیر اثر تیزی سے بڑھتی ہوئی مذہبی منافرت خود غرضانہ انتہاپسندی اور اسلامی شعائر و شخصیات اور لباس و اطوار کے بارے میں تحقیر و عدم برداشت کا رویہ نئے نئے سماجی و سیاسی

مسائل و مشکلات کو جنم دے رہا ہے۔ مخلوط معاشروں میں رہنے والے مسلمانوں کو درپیش چند مسائل درج ذیل ہیں:-

1- مسلمان بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم و تربیت کی معیاری سہولیات کا فقدان۔

2- مخلوط تعلیم کے مغربی تعلیمی اداروں میں مسلم طلباء و طالبات کو غیر مسلم طلباء کی جانب سے تحقیر و استہزاء کا سامنا۔

3- مسلمان اور غیر مسلم لڑکے اور لڑکیوں کے مابین آزادانہ جنسی اختلاط اور معاشرتی زندگی پر اثرات۔

4- مسلمان مردوں کی غیر مسلم خواتین سے شادی یا اس کے برعکس قائم ہونے والے سماجی رشتوں کی قانونی و شرعی حیثیت اور ان سے پیدا ہونے والے سماجی و مذہبی مسائل۔

5- مغربی معاشرہ میں رزق حلال کا حصول اور حرام و ممنوع ماکولات و مشروبات سے بچاؤ۔

6- بیرون ملک مقیم مسلمانوں کو درپیش ثقافتی مسائل مثلاً ہسپتالوں میں مسلمان خواتین مریضوں کے علاج و آپریشن کے لئے مسلمان ڈاکٹروں کی کمی۔

7- ناچ، گانا، کلبوں میں رقص و سرور کی محافل، ہوٹلوں اور ریستورانوں میں شراب نوشی اور جنسی بے رہروی جیسے ماحول میں نوجوان مسلمان نسل کا تحفظ۔

8- مختلف المذاہب افراد کے مابین تعلقات کی نوعیت، ایک دوسرے کی مذہبی و ثقافتی تقریبات میں شرکت اور اس کی حدود و شرائط۔

9- اسلامی عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ، قربانی کی ادائیگی اور مسلم عبادت گاہوں تک عدم رسائی سے جنم لینے والے مسائل اور ان کا حل۔

10- مسلمانوں کی تیزی سے پھیلتی ہوئی آبادی کے لئے اضافی دینی، تعلیمی و سماجی

ضروریات وسہولیات کی کفالت وفراہمی۔

11- نو مسلم افراد کو ان کی اپنی برادری اور خاندان میں درپیش مذہبی وثقافتی مزاحمت اور ان سے پیدا ہونے والے سنگین خانگی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی مسائل کا حل۔

12- مخلوط معاشروں میں مسلم آبادیوں اور ان کے مذہبی وثقافتی حقوق وتشخص کا تحفظ۔

13- مغربی ذرائع ابلاغ سے مسلمانوں کے خلاف مسلسل زہریلے پروپیگنڈے اور کذب وافتراء پر مبنی ناقص وفاسد اطلاعات کی فراہمی۔

14- مسلم اقلیتی گروہوں کو اکثریتی غیر مسلم گروپوں کی طرف سے شدید نفسیاتی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی دباؤں کا سامنا۔

15- بے پناہ مالی وانسانی وسائل اور بھرپور سرکاری وعالمی سرپرستی سے لیس لاکھوں عیسائی مشنریوں، ان کی زیر سرپرستی سرگرم عمل اداروں، تنظیموں اور تحریکوں کے خلاف مؤثر مدافعت کے لئے فوری اور طویل المدت پالیسیوں، پائیدار حکمت عملی اور موثر میکانیات (Mechanimsn) کی تجویز وتشکیل۔

پس چہ باید کرد؟

مصطفائی معاشرہ کے حقیقی خدوخال کو اجاگر کرنے اور ان بنیادی اوصاف کو مسلم معاشروں میں عملی طور پر فروغ دینے کے لئے ایک باقاعدہ حکمت عملی اور لائحہ عمل تشکیل دینے کی ضرورت ہے' جس کے لئے کلیسا کی حکمت عملی اور پالیسیوں کا بغور مطالعہ ضروری ہے۔ عالمی سطح پر اسلام مخالف اور مذہب گریز پالیسیوں اور اقدامات کے حقیقی مطالعہ ومشاہدہ ان کی تعمیر وترقی کے لئے لازم ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل چند اقدامات تجویز کئے جاتے ہیں' جن پر فوری عمل درآمد سے اصلاح احوال میں بہتری کی امید کی جا سکتی ہے:

1- اسلامی کانفرنس تنظیم دنیا بھر میں مسلم معاشروں کو درپیش مسائل کے حل اور اسلامی تہذیب وتمدن کو درپیش چیلنجوں کے مقابلہ کے لئے مختلف علوم وفنون کے ماہرین

اور دانشوروں پر مشتمل ایک باقاعدہ شعبہ قائم کرے جو مسلسل غور وفکر کے بعد اپنی قابل عمل تجاویز و آراء کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں منظوری کے لئے پیش کرے۔

2۔ تمام اسلامی ممالک کے مذہبی امور سے متعلق محکمے اور وزارتیں ان مسائل ومشکلات پر تحقیق اور ان کے مناسب حل تلاش کرنے کو اپنے وظائف میں شامل کریں۔

3۔ پاکستان کی وزارت مذہبی امور، اسلامی نظریاتی کونسل اور ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کی مدد سے مذکورہ امور اور اسلام کی دعوت وتبلیغ کے موثر طریق کار پر تحقیق کا بندوبست کریں۔

4۔ جامعات اور مدارس دینیہ میں مغربی فکر وفلسفہ اور تقابل ادیان پر جدید تحقیقات ومباحث کو باقاعدہ نصاب میں شامل کیا جائے یا اس کے لئے الگ تخصیصی شعبہ جات قائم کیے جائیں۔

5۔ سواد اعظم اہلسنت کے جملہ مکاتب فکر اور فقہی مسالک کے مابین اتحاد اور یک جہتی اور مفاہمت کے فروغ کے لئے نمائندہ افراد پر مشتمل کونسلیں اور مصالحتی گروپ تشکیل دیئے جائیں۔

6۔ مدارس، خانقاہوں اور جامعات سے تعلق رکھنے والے حلقوں کو مذکورہ مسائل کی اہمیت، نوعیت اور سنگینی کا احساس دلانے کے لئے مختلف سطحوں پر علمی مذاکروں اور محدود فکری نشستوں کا اہتمام کیا جائے۔

7۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، ملکی و بین الاقوامی تجارتی و صنعتی اداروں اور ان سے وابستہ اہل ثروت کو ضروری وسائل مہیا کرنے کی ترغیب دی جائے۔

8۔ مخلوط معاشروں میں پیدا ہونے والے عائلی مسائل اور ثقافتی امور سے متعلق مسلکی

اور بین المسالک سطح پر متفقہ شرعی موقف اختیار کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں۔

9- مخلوط معاشروں میں پیدا ہونے والے عائلی مسائل اور ثقافتی امور سے متعلق مسلکی اور بین المسالک سطح پر متفقہ شرعی موقف اختیار کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں۔

10- مختلف مسالک اور مکاتب فکر کے ذمہ دار علماء کی مدد سے مسلمانان عالم کی رہنمائی کے لئے مختصر اور سادہ الفاظ میں تحریر کی گئی مشترکہ عقائد ونظریات پر مبنی مفاہمت کی دستاویز تیار کی جائے جس پر سختی سے عملدرآمد کرایا جائے۔

11- تمام مسالک کے افراد باہم مل جل کر توحید الٰہی، محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خدمت انسانیت کے حوالے سے دعوت وتبلیغ اور باہمی اتحاد ویک جہتی کو فروغ دیں اور صوفیاء کرام کے طریق پر عمل کرتے ہوئے مسلم معاشروں کو سنگین سماجی واقتصادی مسائل سے نجات دلائیں۔

12- سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمدہ' آسان اور تحقیقی لٹریچر، کمپیوٹر سی ڈیز کی تیاری، علماء ودانشور حضرات کے مکالمے، خطبات سیرت، محافلِ میلاد اور ان میں بلا امتیاز رنگ ونسل تمام مسلمانوں کی بھرپور شرکت سے سیرت طیبہ سے ہم آہنگ رویوں اور اطوار وکردار کی تشکیل میں مدد مل سکتی ہے۔ محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فکری وعملی ہم آہنگی، قومی وعلاقائی سطح پر نسلی، لسانی اور طبقاتی منافرت کے خاتمہ میں معاون ثابت ہوگی۔

13- مذہبی گروہوں کے مابین کشیدگی کے خاتمہ اور ہم آہنگی کے فروغ کے لئے ان کے مابین زیادہ سے زیادہ مکالمہ اور مفاہمت کو رواج دیا جائے۔ انہیں مشترکہ مقاصد کے لئے کام کرنے پر آمادہ کر کے سماجی اصلاح وتعمیر کے لئے ان کی مخفی استعداد

وصلاحیتوں کو مثبت انداز میں بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

14- مشترکہ کتب و رسائل اور ویب سائٹس کی تیاری، مجالس عمل، ثالثی کونسلوں اور گروپوں کی تشکیل، مجالس فکر اور تربیتی ورکشاپوں کے انعقاد اور اہم امور پر متفقہ بیانات کے اجراء کے ذریعے مفاہمت کا فروغ۔

15- مختلف الخیال مذہبی گروہوں کی طرف سے متفقہ ضابطہ اخلاق کی تیاری و اشاعت اور اس پر عمل درآمد۔

مغربی طاقتیں اور ان کے پشت پناہ مذہبی پیشوا اس بات پر صدق دل سے یقین رکھتے ہیں کہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی روحانی توانائی مسلمانوں کے لئے ایٹمی توانائی سے زیادہ مؤثر اور کارگر ہے۔ محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی مسلمانان عالم کے اتحاد و یک جہتی، قوت و استحکام، بقاء و سلامتی اور تعمیر و ترقی کے لئے قوت و توانائی فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام مخالف طاقتیں لامحدود توانائی کے اس سرچشمہ کو ختم کرنے کے لئے قدم قدم پر سازشوں کے جال بنتی نظر آتی ہیں۔ مکالمہ بین المذاہب کے ذریعے وہ چاہتے ہیں کہ عالمی سطح پر اقوام متحدہ کی تائید و حمایت اور سرمائے سے پوری دنیا میں عیسائی برادریوں کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کر کے انہیں مختلف ذرائع اور طریقوں سے مسلم معاشروں کی بیخ کنی کا فریضہ سونپا جائے۔ اس مشن پر مدت سے عمل درآمد جاری ہے۔

دریں حالات مسلم مفکرین اور علماء و دانشوروں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عالمی سطح پر مسلم معاشروں کو درپیش نظریاتی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کو منظم کریں۔ دعوت و تبلیغ کو اپنا مشن بنائیں، تعلیم و تربیت کی بہترین سہولیات اور مواقع پیدا کریں۔ اپنے وسائل اور توانائیاں جمع کریں اور علم و تحقیق کے میدان میں جدید سہولتیوں خاص کر اطلاعاتی ٹیکنالوجی کا مؤثر استعمال کرتے ہوئے مغرب کی نظریاتی و ثقافتی یلغار کا مقابلہ کریں۔ مسلم

معاشروں میں پائے جانے والے فروعی مسلکی اور فقہی اختلافات پر قابو پانے اور انہیں قابل قدر حدود میں رکھنے کے لئے ہمیں مختلف مسالک اور مذہبی گروہوں کے مابین صحت مند مکالمہ کو فروغ دینا ہوگا تا کہ تنازعات کے باعث مسلسل ضیاع پذیر توانائی اور وسائل کو بچا کر مشترکہ دشمن کے خلاف مدافعت اور اجتماعی تعمیر و ترقی پر صرف کیا جاسکے۔
عبادت خداوندی، محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انسانی ہمدردی کے اصول اس مکالمہ کے لئے ہمیں ایک مضبوط و مستحکم اساس فراہم کرتے ہیں۔

باہمی تعلقات کے لئے بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت' اہمیت، ترجیحات اور تقاضے
نبی اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

محمد اکرم ورک
گورنمنٹ ڈگری کالج، قلعہ دیدار سنگھ، گوجرانوالا

باہمی تعلقات کے لئے

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت' اہمیت، ترجیحات اور تقاضے
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

محمد اکرم وِرک

اربابِ دانش سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ گلوبلائزیشن (Globalization) کے اس دور میں بین المذاہب مکالمہ (Inter-Faith Dialogue) کی ضرورت واہمیت پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے، باہمی مکالمہ ہی وہ واحد آپشن (Option) ہے جس سے کسی بھی مذہب کا داعی مخاطب کو اپنی دعوت کی طرف متوجہ کرسکتا ہے، باہمی مکالمہ دعوت کا ایک ایسا اسلوب ہے جس کے ذریعے مخاطب کو زیادہ گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ گفتگو کا یہ ایسا اسلوب ہے جس میں متکلم اور سامع کے درمیان براہ راست گفتگو ہوتی ہے اور حقائق پوری طرح نکھر کر سامنے آتے ہیں، اب یا تو مخاطب مدّ مقابل کے موقف کو قبول کر لیتا ہے یا پھر دلائل کی بنیاد پر رد کر دیتا ہے۔ یہ مکالمہ افراد کے درمیان بھی ہوسکتا ہے، تہذیبوں اور مختلف مذاہب کے درمیان بھی۔

سیرت طیبہ کی روشنی میں بین المذاہب مکالمہ کی اہمیت

بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری

نبی ہیں اور آپ کی امت آخری امت ہے' اس لئے امت اجابت ہونے کی حیثیت سے دنیا کے تمام انسانوں تک پیغام الٰہی کا پہنچانا ہماری بنیادی ذمہ داری ہے۔ قرآن وحدیث کے متعدد نصوص سے واضح طور پر امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ شاہان عالم کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوتی وتبلیغی خطوط جہاں معاصر مذاہب اور تہذیبوں سے آپ کے مکالمہ کی ایک خوب صورت مثال ہیں وہیں یہ خطوط اس بات کی بھی دلیل ہیں کہ اسلام اصلاً دین دعوت ہے اور اس کی دعوت کا دائرہ کار تمام عالم کو محیط ہے، اس لئے اس کے عالمی پیغام کو دوسروں تک منتقل کرنا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔ مذاہب عالم میں اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے نہ صرف عالمگیر سطح پر دعوت وتبلیغ کا حکم دیا ہے بلکہ دوسری تہذیبوں، قوموں اور افراد کے ساتھ گفتگو اور مکالمے کے باقاعدہ اصول بھی بیان کیے ہیں۔ قرآن مجید نے ایک داعی کے لئے مکالمے کے جو بنیادی اصول بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:125)

''آپ' لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلائیے اور ان کے ساتھ پسندیدہ طریقہ سے بحث کیجئے۔''

اسلام کی یہ ایک ایسی انفرادیت ہے جو اسے تمام الہامی اور غیر الہامی مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔ علامہ سید سلمان ندویؒ (م:1953 عیسوی) لکھتے ہیں:

''یہ نکتہ' کہ کس طرح لوگوں کو سچائی قبول کرنے کی دعوت دینی چاہیے دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا، وہ مذہب بھی جو الہامی اور تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی

تشریح کی ہے، لیکن صحیفہ محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔"(1)

مذاہب عالم میں عملی طور پر صرف عیسائیت اور اسلام ہی تبلیغی مذاہب ہیں، دیگر تمام مذاہب کا دائرہ کار کسی خاص علاقے یا نسل تک محدود ہے، جبکہ عیسائیت کی عالم گیر دعوت اور اشاعت بھی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے منافی ہے کیونکہ ان کی بعثت خاص بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا بیان ہے:

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (انجیل متی 24:15)

اسی طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے جب بارہ نقیب مقرر کیے اور ان کو مختلف علاقوں کی طرف دعوت و تبلیغ کے لیے روانہ کیا تو بطور خاص ان کو تلقین فرمائی:

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا"۔

(انجیل متی 6:10)

الغرض یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے اپنے پیروکاروں کو نہ صرف دینِ اسلام کی ترویج و اشاعت کا حکم دیا ہے بلکہ دیگر مذاہب اور تہذیبوں کے ساتھ مکالمے کے بنیادی اصولوں کی تعلیم بھی دی ہے۔ داعی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف اقوام اور تہذیبوں کے ساتھ جو مکالمہ فرمایا، سیرت طیبہ سے اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کی مشرکانہ تہذیب کے نمائندہ افراد، سردارانِ قریش اور ان کے وفود سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکالمہ کیا، اور دوسری طرف ورقہ بن نوفل سے

لے کر نجران کے عیسائی علماء سے آپ کا مکالمہ گویا عیسائیت سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکالمہ تھا۔ اِسی طرح مدنی دور میں میثاق مدینہ، جس کے بڑے فریق یہودی قبائل تھے، یہود سے مکالمہ ہی کی ایک صورت تھی۔

ہم زبانی، بین المذاہب مکالمے کا بنیادی اصول

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک مکالمہ بین المذاہب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا، کیونکہ دعوت و تبلیغ اور باہمی مکالمہ میں تاثیر اور قوت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب پیغام کی زبان آسان، نرم اور قابل فہم ہو۔ ہم زبانی سے اُنسیت میں اضافہ ہوتا ہے، اجنبیت دور ہو جاتی ہے اور گفتگو کا مقصد آسانی سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (م: 44ھ) کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، تا کہ یہود سے انہی کی زبان میں گفتگو کی جا سکے اور انہی کی زبان میں ان کے خطوط کا جواب دیا جا سکے۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

"فَتَعَلَّمْتُ كِتَابَهُمْ مَا مَرَّتْ بِي خَمْسَ عَشْرَةَ لَيْلَةً حَتّٰى حَذَقْتُهُ وَكُنْتُ أَقْرَأُ لَهُ كُتُبَهُمْ إِذَا كَتَبُوْا إِلَيْهِ وَأُجِيْبُ عَنْهُ إِذَا كَتَبَ"(2)

"پس میں نے ان کی زبان میں لکھنا سیکھ لیا۔ ابھی پندرہ دن نہیں گزرے تھے کہ میں اس میں ماہر ہو گیا۔ جب یہودی کوئی خط نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لکھتے تو میں آپ کو پڑھ کر سنا دیتا اور اگر آپ کو جواب لکھنا ہوتا تو میں وہ لکھ دیتا۔"

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ ایک ایرانی عورت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

(م:58ھ) کی خدمت میں استغاثہ لے کر آئی کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب مجھ سے میرا بیٹا بھی چھیننا چاہتا ہے اس عورت نے یہ ساری گفتگو فارسی زبان میں کی اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس سے اسی زبان میں گفتگو کی اور پھر آپ نے بچہ عورت کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔(3)

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دوسری قوموں کی زبانیں صرف اس غرض سے سیکھ رکھی تھیں تا کہ ان سے براہ راست تبادلہ خیال کر کے ان کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ بعض روایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے قرآن مجید کے بعض اجزا کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی کیا تھا تا کہ عربی زبان سے ناواقف لوگ اسلام کی حقیقی روح اور تعلیمات سے محروم نہ رہ جائیں۔ چنانچہ علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (م:490ھ) لکھتے ہیں:

”رُوِیَ أَنَّ الْفُرسَ کَتَبُوْا إِلٰی سَلْمَانَ أَنْ یَّکْتُبَ لَهُمُ الْفَاتِحَةَ بِالْفَارِسِیَّةِ فَکَانُوْا یَقْرَءُوْنَ ذَالِکَ فِی الصَّلٰوةِ حَتّٰی لَانَتْ أَلْسِنَتُهُمْ لِلْعَرَبِیَّةِ“(4)

”بیان کیا جاتا ہے کہ بعض نومسلم ایرانیوں نے سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھا کہ ان کے لیے سورۃ الفاتحہ کو فارسی میں نقل کر دیا جائے، چنانچہ وہ لوگ (اسی ترجمہ کو) نماز میں پڑھتے تھے یہاں تک کہ وہ عربی سیکھ گئے۔“

اسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور بڑے فقیہ نے اپنی کتاب ”النهاية حاشية الهداية“ میں مزید تفصیل درج کی ہے کہ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ (م:33ھ) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے یہ کام انجام دیا اور ان کے ترجمے کا ایک جز بھی نقل کیا ہے، ”بنام خداوند بخشایندہ مہربان“ یہ بسم اللہ کا ترجمہ ہے۔(5)

شاہانِ عالم کی طرف بھیجے جانے والے نبوی سفراء کا معجزانہ طور پر انہی قوموں کی زبان میں گفتگو کرنے لگ جانا بھی دعوت و تبلیغ اور مکالمے میں زبان کی یکسانیت کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ (6)

اس کے علاوہ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف قوموں کی طرف داعی اور مبلغ بنا کر روانہ کیا' اس میں بھی یہ چیز آپ کی حکمتِ عملی کا حصہ نظر آتی ہے کہ وہ مبلغ اسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں بصورتِ دیگر وہ اس قوم کی زبان، رسم ورواج اور کلچر سے آگاہ ہوں۔ بہر حال آپ کے طرزِ عمل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کی نظر میں بین المذاہب مکالمے کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ آپ نے اس مقصد کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی باقاعدہ تربیت فرمائی۔

اسلام کی ترجیح: امن اور مکالمہ

سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب بھی جنگ اور امن میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کرنے کا موقع ملا تو آپ نے ہمیشہ امن کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ 6ھ کے موقع پر آپ نے امن کو جنگ پر ترجیح دی اور ایسی شرائط پر بھی صلح کو قبول کر لیا جن سے بظاہر مسلمانوں کی پسپائی کا واضح تاثر ملتا تھا، اگرچہ ان شرائط کے قبول کرنے سے مسلمانوں کی دل شکنی ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر احتجاج بھی کیا، لیکن آپ نے امن کو جنگ پر ترجیح دی کیونکہ آپ اپنے نورِ بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ امن کی صورت میں جب اسلامی اور مشرکانہ تہذیب کے درمیان آزادانہ ماحول میں مکالمہ ہوگا تو قریش اور دیگر قبائل کو مسلمانوں کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب مسلمان اور قریش باہم ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر ملنے لگے اور انہیں ایک دوسرے کے موقف کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملا تو صرف دو سال کے عرصہ یعنی فتح مکہ 8ھ تک اتنے کثیر لوگ مسلمان ہوئے جتنے پہلے تمام

عرصے میں نہیں ہوئے تھے۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ (م:125ھ) کا بیان ہے:

"فَمَا فَتَحَ فِی الْاِسْلَامِ فَتْحٌ قَبْلَهُ كَانَ أَعْظَمَ مِنْهُ، إِنَّمَا كَانَ الْقِتَالُ حَيْثُ الْتَقَى النَّاسُ، فَلَمَّا كَانَتِ الْهُدْنَةُ، وَوُضِعَتِ الْحَرْبُ وَآمَنَ النَّاسُ بَعْضُهُم بَعْضًا، اِلْتَقَوا فَتَفَاوَضُوا فِي الْحَدِيثِ الْمُنَازَعَةِ، فَلَمْ يُكَلِّمْ أَحَدٌ بِالْإِسْلَامِ يَعْقِلُ شَيْئًا إِلَّا دَخَلَ فِيهِ، وَلَقَدْ دَخَلَ فِي تِينِكَ السَّنَتَيْنِ مِثْلَ مَنْ كَانَ فِي الْإِسْلَامِ قَبْلَ ذٰلِكَ أَوْ أَكْثَرَ" (7)

"صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام میں اتنی بڑی فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لوگ جہاں بھی ملتے جنگ ہو کر رہتی تھی، لیکن جب صلح ہو گئی، جنگ موقوف ہو گئی اور لوگ ایک دوسرے سے بے خوف ہو گئے باہم ملے جلے باتیں ہوئیں تو کوئی عقل مند ایسا نہیں تھا جس سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی اور اس نے قبول نہ کر لیا۔ چنانچہ جتنے لوگ ابتداء سے اب تک مسلمان ہوئے تھے صرف ان دو برسوں میں ان کے برابر بلکہ ان سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے۔"

یہاں ضمناً ایک اور بات کا ذہن نشین رہنا بھی ضروری ہے کہ ہمارے ہاں اسلام کی امن پسندی پر استدلال کے لئے صلح حدیبیہ کا حوالہ جس انداز سے دیا جاتا ہے اس سے اس عظیم تاریخی واقعے کی حیثیت محض ایک منفی سمجھوتے کی سی ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ کوئی بھی تاریخی واقعہ یک دم وقوع پذیر نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا ایک پورا پس منظر ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ کو بھی اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سن 6ھ سے قبل کے واقعات اسلام کے متعلق ہر قسم کے مفعولی تاثر کو ختم کر چکے تھے، اس پس منظر میں صلح کا معاہدہ مسلمانوں سے زیادہ خود قریش کی ضرورت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خون عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کے لئے مسلمانوں سے مشہور بیعت ''بیعتِ رضوان'' لی اور مسلمان جنگ کے لئے تیار ہو گئے تو قریش نے عافیت اسی میں جانی کہ صلح کے موقع کو ضائع نہ کیا جائے، تاہم آپ نے جن شرائط پر صلح کی اس سے آپ کی امن پسندی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

اسلام میں دعوت اصل ہے اور جہاد ضرورتاً، جہاد کی اگر اجازت ہے تو وہ صرف اسلامی تہذیب وتمدن کے دفاع اور استحکام کے لئے ہے، اس لئے لامحالہ اسلام کی ترویج واشاعت کا تمام تر انحصار صرف دعوت وتبلیغ اور باہمی مکالمہ پر ہے۔ اس لئے ایک سچے داعی کی حیثیت سے ہمارے لئے بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کرنا دینِ اسلام کا بنیادی تقاضا بن جاتا ہے۔

جب اسلام کی ترویج واشاعت کا تمام تر انحصار دعوت وتبلیغ اور باہمی مکالمہ پر ہی ہے تو اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ باہمی مکالمہ اور امن وامان کا ماحول اسلام کی ضرورت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جب بھی دلائل کی بنیاد پر گفتگو ہوگی تو میدان ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کے ہاتھ ہی رہے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (التوبۃ:33)

''وہ اللہ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو کیسا ہی ناگوار ہو!۔''

اس آیت کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ اسلام کا غلبہ تمام ادیان پر عقل واستدلال کی رو سے تو مطلق ہے اور وہ کسی زمانہ اور وقت کے ساتھ مخصوص نہیں البتہ مادی غلبہ اہلِ اسلام کی اہلیت اور صلاحیت کے ساتھ مشروط ہے، کیونکہ آزادانہ مباحثے اور

مکالمے میں آخرکار جو چیز باقی رہے گی وہ سچائی ہے جبکہ کامل اور بے داغ سچائی اسلام کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ اسلام کے پاس طاغوت کو شکست دینے کے لیے دلائل وبراہین کی ہرگز کمی نہیں ہے اور مکالمے کی میز پر یہی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب دلیل ہار جائے تو انسان اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتا ہے توہین آمیز خاکوں سمیت اہل مغرب کی اسلام کے خلاف موجودہ آویزش دراصل دلیل کی شکست کا اعتراف ہی تو ہے۔ اس وقت جبکہ مغرب دلیل کی زبان میں اسلام کا مقابلہ کرنے سے پہلو تہی کر رہا ہے اور اپنی برتر ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مسلمانوں کا مقابلہ جنگ کے میدان میں کرنا چاہتا ہے، مسلمان اہل دانش کا کام یہ ہے کہ وہ اہل مغرب کو مکالمے کی اس میز پر کھینچ لائیں جہاں انہیں مدِ مقابل پر فیصلہ کن برتری حاصل ہے، کیونکہ یہی وہ میدان ہے جس میں اسلام کی کامیابی کے امکانات سو فیصد ہیں بشرطیکہ ہم اسلام کو صحیح طور پر اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کر سکیں۔

اس موقف کی ایک دلیل وہ مکالمہ بھی ہے جو نجران کے عیسائی علماء اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ہوا، جب عیسائی علماء حضور کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے دلائل کے سامنے بالکل عاجز آ گئے تو انھوں نے جزیہ دینے کی شرط پر آپ کے ساتھ صلح کر لی۔ عیسائی علماء کا دلیل اور استدلال کو چھوڑ کر جزیہ پر صلح کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس حقیقت کو جان چکے تھے کہ اسلام کا مقابلہ مکالمے اور استدلال کی زبان میں ممکن نہیں۔

اہل علم واقف ہیں کہ ولیم میور نے جب Life of Muhammad لکھ کر حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام اور مرتبہ کو کم کرنے کی کوشش کی تو علامہ شبلی نعمانی (متوفی 1914ء) نے اپنے قلم کو جنبش دی، اپنے شعور کو مجتمع کیا اور اپنے فہم وادراک کو کام میں لاتے ہوئے "سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" جیسی معرکۃ الآراء کتاب سے مستشرق موصوف کا منہ بند کر دیا۔ دورِ حاضر میں "ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کی

صورت میں پیر محمد کرم شاہ الازہری (متوفی 1998ء) نے بھی یہی خدمت انجام دی ہے۔

عصر حاضر میں اسلام کا مکالمہ کس مذہب سے ہے؟

اس وقت مختلف سطحوں پر بین المذاہب مکالمے کی ضرورت واہمیت پر زور دیا جارہا ہے جون 2004ء میں اوسلو (ناروے) میں پہلی بین المذاہب کانفرنس منعقد ہوئی جس میں گورنمنٹ آف ناروے اور نارویجن چرچ کی دعوت پر مولانا محمد حنیف جالندھری، مفتی منیب الرحمٰن، ریاض حسین نجفی اور بشپ سموئیل عزرایاہ وغیرہ نے شرکت کی۔ عالمی سطح کی اس بین المذاہب کانفرنس میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے بین المذاہب ہم آہنگی اور محبت کی فضا کو فروغ دینے پر زور دیا "اعلان اوسلو" کے تحت پاکستان میں بھی "ورلڈ کونسل آف ریلیجنز برائے عالمی امن وعدل اجتماعی" کے زیر اہتمام 16 ستمبر 2004ء کو نیشنل لائبریری ہال، اسلام آباد، میں پہلی بین المذاہب کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔اس کے بعد سے یہ سلسلہ مسلسل جاری وساری ہے۔ یقیناً یہ ساری کوششیں لائق صد تحسین اور قابل قدر ہیں، لیکن اس ساری تگ ودو کے مثبت اور دوررس نتائج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم بعض باتیں طے کرلیں۔سب سے پہلی بات تو ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ آج کی عالمی صورت حال میں اس مکالمے کے اصل فریق کون ہیں؟اور دوسرا، یہ کہ اس مکالمے کا ایجنڈا کیا ہے؟اس طرح ہمارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ ہم علمی حلقوں میں اپنا موقف بہتر طور پر پیش کرسکیں۔

فی الوقت دنیا میں اسلام کے علاوہ عیسائیت، یہودیت، ہندومت، بدھ مت، جین مت وغیرہ ہی کو دنیا کے بڑے اور زندہ مذاہب کی صف میں شمار کیا جاسکتا ہے۔وحی، الہام اور خدا پر یقین رکھنے والے زیادہ تر لوگوں کا تعلق انھی مذاہب سے ہے، اپنی غیر فطری اور غیر عقلی تعلیمات کی وجہ سے ان مذاہب کا ماضی میں بھی انسانی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے کوئی زیادہ تعلق نہیں رہا ہے، لیکن عقل پرستی (Rationalism) کے موجودہ دور میں

مذہب کا لوگوں کی ذاتی زندگی سے عمل دخل بھی بڑی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔ اور اس وقت عملی طور پر مسلمانوں کے علاوہ انسانوں کی غالب اکثریت لادین اور سیکولر ہے اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کے بعد اس وقت بلا امتیاز رنگ و نسل پوری دنیا میں مغربی سیکولرازم مقبول ترین مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، تو غلط نہ ہوگا۔ اس وقت جبکہ دنیا کے تمام مذاہب ایک تاریخی یادگار کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں، یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں مغربی فکر و فلسفہ کی بنیاد پر پروان چڑھنے والا سیکولرازم ہی اسلام کا اصل مدّ مقابل ہے۔

حالات کے سرسری جائزے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت مغرب اور مسلمانوں کے درمیان جو علمی، فکری اور تہذیبی کشمکش جاری ہے اس کے اصل فریق مغرب کے مذہب سے منحرف سیکولر حلقے اور مذہب پر پختہ یقین رکھنے والے مسلمان ہیں، جبکہ عیسائی علماء اس مکالمے کے اصل فریق نہیں ہیں کیونکہ مغرب کے عیسائی راہنما جس مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا مغرب کی اجتماعی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے موجودہ کشمکش میں عیسائی علماء سے مکالمہ کی افادیت محدود ہے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود ہمیں عیسائیت اور دیگر مذاہب سے گفتگو اور مکالمے سے انکار نہیں ہے تاہم روایتی عیسائی حلقے سے ہماری گفتگو اس موضوع پر ہونی چاہیے کہ عیسائی مذہبی راہنما اپنے معاشرے کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپس لانے کے لیے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ جبکہ وہ اصولی طور یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس وقت جبکہ پوری دنیا میں صرف مسلمان ہی بنی نوع انسان کی وحی الٰہی اور مذہب کی طرف واپسی کی کوشش کر رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ مغرب کے مذہبی حلقے اس حوالے سے مسلمانوں کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟۔

مسلمانوں کو اپنے عیسائی مخاطبین پر یہ حقیقت واضح کرنی چاہیے کہ وہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں جو الحاد اور لادینیت کے خوفناک طوفان کے اندر گھری ہوئی ہے اور الحاد و لادینیت کے اس عالم گیر طوفان کے خلاف مسلمان، مسیحی اور دیگر مذہبی علماء ایک دوسرے کے فطری اتحادی ہیں۔ عیسائی علماء کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ واقعی وحی اور آسمانی تعلیمات کی صداقت پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور انسانی معاشرے پر اس کی علمبرداری کے خواہش مند ہیں تو انہیں سیکولر حلقے کی تائید کی بجائے وحی اور آسمانی تعلیمات کے معاشرتی کردار کی اہمیت کو واضح طرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

روایتی مذہبی حلقے سے مکالمے کے بنیادی اصول

بحیثیت مسلمان ہم پر لازم ہے کہ نسلِ انسانی کی فلاح اور بہتری کے لئے ہم مسیحیت کے ساتھ مکالمہ میں مشترک صفات پہ زور دیں، دینِ ابراہیمی کی مشترک روایت سیدنا عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کا احترام اور ہمارے مشترک سماجی بندھن وغیرہ عیسائیت کے ساتھ مکالمے کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضور شفیع امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاہانِ عالم کے نام خطوط ہمارے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہرقل اور دیگر عیسائی حکمرانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بذریعہ خطوط جو مکالمہ ہوا اس میں آیت مقدسہ:

﴿قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا﴾ (آل عمران:64)

"آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب ایسے قول کی طرف آجاؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔"

کا مکرر استعمال ہمارے لئے قابلِ توجہ ہے۔ اسی طرح شاہانِ عالم کے نام خطوط لے جانے

والے نبوی سفراء نے، جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاص اسی مقصد کے لئے تربیت فرمائی تھی، جس طرح اپنے مخاطبین سے مکالمہ کیا وہ اسلوب بھی ہمارے لئے بین المذاہب مکالمے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ (م: 30ھ) کو مقوقس، شاہِ مصر کی طرف دعوتی خط دے کر روانہ فرمایا۔ ابن اثیر (م: 630ھ) نے سیدنا حاطب اور شاہِ مصر کے درمیان ہونے والے مکالمے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب شاہِ مصر نے سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ اگر تمہارے صاحب اللہ کے رسول ہیں تو پھر تمہارے نبی نے اس وقت اپنی قوم کے خلاف بددعا کیوں نہ کی جب ان کی قوم نے ان کو ان کے اپنے شہر سے نکالا؟ تو سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سیدنا عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کی نسبت تو آپ خود کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول تھے پھر جب ان کو ان کی قوم نے سولی دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ان کو بددعا کیوں نہ دی؟ یہاں تک کہ اللہ نے ان کو آسمان پر اٹھا لیا۔ مقوقس اس برجستہ جواب سے بڑا متاثر ہوا اور کہنے لگا:

"أَحْسَنْتَ! أَنْتَ حَكِيْمٌ جَآءَ مِنْ عِنْدِ حَكِيْمٍ" (8)

"تم نے اچھا جواب دیا تم حکیم ہو اور حکیم کے پاس سے آئے ہو"

امام ابن قیمؒ (م: 751ھ) نے مقوقس اور سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کے باہمی مکالمے کی جو روایت نقل کی ہے وہ حسب ذیل ہے:

حاطب: (اس زمین پر) تم سے پہلے ایک شخص (فرعون) گزرا ہے جو اپنے آپ کو رب اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اللہ نے اسے آخر و اوّل کے لیے عبرت بنا دیا۔ پہلے تو اس کے ذریعے لوگوں سے انتقام لیا پھر خود اس کو انتقام کا نشانہ بنایا لہٰذا دوسروں سے عبرت پکڑو، ایسا نہ ہو کہ دوسرے تم سے عبرت پکڑیں۔

مقوقس: ہمارا ایک دین ہے جسے ہم چھوڑ نہیں سکتے جب تک کہ اس سے بہتر دین

نہ مل جائے۔

حاطب: ہم تمہیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے تمام ماسوا (ادیان) کے بدلے کافی بنا دیا ہے۔ دیکھو! اسی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو (اسلام کی) دعوت دی تو اس کے خلاف قریش سب سے زیادہ سخت ثابت ہوئے، یہود نے سب سے بڑھ کر دشمنی کی اور نصاریٰ سب سے زیادہ قریب رہے۔ میری عمر کی قسم! جس طرح موسیٰ نے عیسیٰ کے لیے بشارت دی تھی، اسی طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے سیدنا محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے بشارت دی ہے، اور ہم تمہیں قرآن مجید کی دعوت اسی طرح دیتے ہیں جیسے تم اہلِ تورات کو انجیل کی دعوت دیتے ہو۔ جو نبی جس قوم کو پا جاتا ہے وہ قوم اس کی امت ہو جاتی ہے اور اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس نبی کی اطاعت کرے اور تم نے اس نبی کا عہد پالیا ہے، اور پھر ہم تمہیں دینِ مسیح سے روکتے نہیں ہیں بلکہ ہم تو اسی کا حکم دیتے ہیں۔

مقوقس: میں نے اس نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معاملہ پر غور کیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کسی ناپسندیدہ بات کا حکم نہیں دیتے اور کسی پسندیدہ بات سے منع نہیں کرتے وہ نہ گمراہ جادوگر ہیں نہ جھوٹے کاہن، بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ ان کے ساتھ نبوت کی یہ نشانی ہے کہ وہ پوشیدہ کو نکالتے ہیں اور سرگوشی کی خبر دیتے ہیں، میں مزید غور کروں گا۔"(9)

سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ (م: 30ھ) اور مقوقس کے باہمی مکالمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن اصحاب رضی اللہ عنہم کو دوسری قوموں کی طرف دعوت وتبلیغ کے لیے روانہ کیا، ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور خاص طور

پر اس بات کا اہتمام کیا کہ جو صحابی جس قوم کی طرف جائے ایک تو وہ اس قوم کی زبان سے اچھی طرح واقف ہو، دوسرا، وہ ان کے کلچر اور رسم و رواج سے واقف ہو، تیسرا، وہ ان کے دین سے جس کو وہ اختیار کیے ہوئے ہیں آگاہ ہو اور چوتھا یہ کہ وہ اس سرزمین کے پورے جغرافیہ سے بھی مکمل واقفیت رکھتا ہو، تاکہ باہمی مکالمہ میں اسے ان معلومات کی بنا پر اپنے مخاطب پر علمی برتری حاصل رہے۔ ہم نے اختصار کے پیش نظر محض ایک مثال ذکر کی ہے۔

اگر تمام نبوی سفراء کے احوال کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو بین المذاہب مکالمے کے لئے کئی راہنما اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں۔(10)

مغرب کے تحفظات پر مکالمے کا اسلوب

جو لوگ خدا، رسول اور آخرت پر اعتقاد رکھتے ہوں ان کے ساتھ مکالمہ نسبتاً آسان ہے، اگرچہ اہل مغرب کا اب بھی چرچ کے ساتھ کمزور سا تعلق باقی ہے لیکن مغرب کی اکثریت بالخصوص اہل یورپ عیسائیت کی بنیادی تعلیمات سے دست بردار ہو چکے ہیں اس لئے مسلمان مبلغین کو مغرب میں تمام خرابیوں کی ذمہ داری عیسائیت کے سر نہیں ڈال دینی چاہیے، بلکہ ان کے ساتھ مکالمے میں ان کے موجودہ نظریات ہی کو پیش نظر رکھنا چاہیے ،جیسا کہ میں نے عرض کیا موجودہ علمی اور فکری کشمکش میں اسلام کے ساتھ مکالمے کا اصل فریق اور مدِ مقابل مغرب کا موجودہ دانش ور اور سیکولر طبقہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمارا مکالمہ اسی وقت مفید ہو سکتا جب ہم مغربی فکر و فلسفہ کے تاریخی ارتقا، پس منظر اور اس کے اصل فکری سرچشموں سے آگاہی رکھتے ہوں اور مغربی افکار کا تنقیدی جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس حوالے سے جن پہلوؤں پر خصوصی غور و فکر کی ضرورت ہے وہ درج ذیل ہیں۔

ایک تو اس پہلو کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مغرب مسیحیت کو چھوڑ کر موجودہ سیکولر ازم تک کیوں اور کیسے پہنچا؟ اس لئے ہمارے لئے اس تاریخی حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ سولھویں صدی تک مغرب میں قدیم عیسائیت ہی غالب تھی، طاقت اور اختیار پوپ کے

ہاتھ میں تھا۔ مارٹن لوتھر (Martin Luther) (م 1546ء) وہ پہلا شخص تھا جس نے پوپ کے اختیار کو چیلنج کیا اور ساتھ ہی عقل انسانی کو وحی کی تعبیر کا واحد ذریعہ قرار دیا، یہی وہ دور ہے جس کے بعد مغربی معاشرے پر عیسائیت کی گرفت آہستہ آہستہ کمزور پڑنے لگی، لیکن جس فکر نے بالآخر عیسائیت کو مکمل پسپائی اور شکست پر مجبور کیا وہ اٹھارویں صدی عیسوی میں پروان چڑھنے والی تحریکِ تنویر (Enlightenment Movement) اور تحریکِ رومانیت (Romanticism) ہے۔ مغرب کی موجودہ روشن خیالی کی تحریک کا یہ وہ مختصر پس منظر ہے جس کا پوری تفصیل کے ساتھ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا پہلو جس کا جائزہ لینا ضروری ہے وہ تحریکِ استشراق (Orientalism) ہے۔ اہل مغرب میں اسلام کے بارے میں پائی جانے والی ان بے شمار غلط فہمیوں کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک تحریکِ استشراق کے مقاصد، محرکات اور عالم مغرب پر اس کے اثرات کا بھرپور تجزیہ نہ کرلیں، کیونکہ بدقسمتی سے مستشرقین کی مرتب کردہ تاریخ نہ صرف زندہ ہے بلکہ ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت بھی پوری دنیا میں الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ اسلام کی جو تصویر کشی کی جارہی ہے اس کا بڑا ماخذ مستشرقین کی وہی تحقیقات ہیں جن کا اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مغرب کے ساتھ باہمی مکالمہ کی صورت میں تیسری بات جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں قرآن وحدیث سے راہنمائی تو ضرور لینی چاہیے تاہم مغرب کی نفسیات کے مطابق ہمیں سب سے پہلے اسلامی تعلیمات کے عقلی جواز پر بات کرنا ہوگی اور مغرب کے موجودہ سماجی علوم کے ساتھ تقابلی مطالعہ کے بعد اسلامی احکام کی افادیت پر دلائل پیش کرنا ہوں گے اور اسلامی تعلیمات کی سماجی اور معاشرتی اہمیت واضح کرنا ہوگی۔ بدقسمتی سے اسلامی احکام کے اسرار وحکم پر حضرت شاہ ولی اللہؒ (م 1176ھ) کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے بعد کوئی بھی قابل قدر کتاب سامنے نہیں آئی۔

اہلِ مغرب کے تحفظات

مغرب، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تحفظات رکھتا ہے وہ دو طرح کے ہیں۔ مغرب کے پہلی قسم کے تحفظات تو وہ ہیں جن کا تعلق اسلامی تاریخ اور نظامِ معاشرت سے ہے۔ اسلامی تعلیمات کا یہ وہ حصہ ہے جس کا براہِ راست ٹکراؤ مغرب کے موجودہ طرزِ معاشرت سے ہے۔ دوسری قسم کے تحفظات وہ ہیں جن کا تعلق دین کی اساس اور بنیاد سے ہے۔ مغرب کے ساتھ ہمارا مکالمہ اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک ہم کھلے ذہن اور مکمل تیاری کے ساتھ ان کے تمام تحفظات پر بات کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ سب سے پہلے تو ہمیں مغرب سے اس موضوع پر مکالمہ کرنا ہوگا کہ وہ دینِ اسلام پر ایک نظامِ حیات اور طرزِ معاشرت کے طور غور کرے۔

انسانی حقوق اور اسلام

اس وقت مغرب میں مساوات، آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے بڑی حساسیت پائی جاتی ہے بدقسمتی سے اسلام کے بارے میں یہ غلط تاثر پھیل گیا ہے کہ اسلام میں بنیادی انسانی حقوق اور خاص طور پر عورتوں کے حقوق کو بری طرح پامال کیا گیا، ہمیں اہلِ مغرب پر واضح کرنا ہوگا کہ اسلام تمام انسانی حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور اس کے عطا کردہ حقوق ہی فطری بنیادوں پر مبنی ہیں۔ مثلاً جب اسلام ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیتا ہے تو کیا یہ حرمتِ انسان کا بہترین قانون قرار نہیں پائے گا؟ اسی طرح اسلام کی بیان کردہ دوسری تمام سزائیں بھی ''انسانی حق'' کے اثبات ہی کے لیے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے حقوق میں بھی ان کے فطری دائرہ کار اور نفسیات کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

ایک داعی کی حیثیت جو بات ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ انسانی حقوق کے عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights)

جو بجا طور پر آج کا عالمی قانون ہے، کی تمام شقوں کو قبول کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے تاہم ہمیں اس بحث میں زیادہ مثبت اور تعمیری انداز میں حصہ لینا چاہیے اور اگر باہمی مکالمہ میں کسی جگہ لچک کی گنجائش موجود ہو تو اس کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ اس حوالے سے سیرت طیبہ سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ کئی مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے بھی بین الاقوامی قانون، عرف اور قبائلی رسم و رواج کا احترام کیا۔ مثلاً:

جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسیلمہ کذاب کے سفیروں سے مکالمہ ہوا تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مجھے اللہ کا رسول تسلیم کرتے ہو؟ انھوں نے اقرار کیا، پھر آپ نے سوال کیا کہ کیا تم مسیلمہ کو بھی نبی مانتے ہو؟ تو انھوں نے کہا: ہاں، اس پر آپ نے فرمایا: اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو میں تمہیں قتل کروا دیتا۔ دیکھیے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر یہ حد جاری نہیں کی بلکہ فرمایا کہ چونکہ عالمی قانون یہ ہے کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا اس لئے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں ورنہ میں تمہیں قتل کروا دیتا۔

سن 9 ہجری میں اقرع بن حابس ؓ کی زیر قیادت بنو تمیم کا وفد اسلام قبول کرنے کے لیے بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہوا، لیکن ان لوگوں نے قبولِ اسلام کے لیے بڑی عجیب شرط لگائی کہ آپ (ﷺ) پہلے ہمارے ساتھ مفاخرت کریں' آپ کا خطیب ہمارے خطیب کا اور آپ کا شاعر ہمارے شاعر کا مقابلہ کرے تب ہم اسلام قبول کریں گے۔ آپ نے ان کے اس مطالبہ کو قبول کیا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر سیدنا حسان بن ثابت ؓ نے ان کے شاعر زبرقان بن بدر کا مقابلہ کیا اور ثابت بن قیس ؓ نے ان کے خطیب عطارد ابن حاجب کا مقابلہ کیا، بنو تمیم نے بالآخر حضور نبی مکرم ﷺ کے شاعر اور خطیب کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام قبول کرلیا۔

دیکھا جائے تو وفدِ بنی تمیم کا مطالبہ بالکل لایعنی تھا، بالفرض اگر مسلمانوں کا شاعر اور خطیب مقابلے میں شکست بھی کھا جاتے تو پھر بھی اسلام کی حقانیت میں کوئی شک نہ تھا، لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کے رسم ورواج کا احترام کیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری قوموں کے ساتھ مکالمے کی اتنی زبردست تیاری کر رکھی تھی کہ بنو تمیم نے جب قبول اسلام کی یہ عجیب وغریب شرط رکھی تو آپ نے بلا جھجک اپنے ان ساتھیوں کو طلب کیا جن کی خاص اسی مقصد کے لئے تربیت کی گئی تھی۔

اسی طرح جب آپ نے شاہانِ عالم کے نام دعوتی خطوط روانہ کرنے کا پروگرام بنایا تو واقفانِ حال نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیک وسلم)! حکمرانوں میں یہ اصول ہے کہ وہ ان خطوط پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے جن پر کوئی مہر اور سیل (Seal) وغیرہ نہ ہو، چنانچہ اسی وقت آپ نے خطوط کو مُہر بند کرنے کے لیے مُہر بنانے کا حکم دیا۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابیٰ کے کردار سے کون واقف نہیں؟ اس کی شر انگیزیوں کی وجہ سے اسلام کو کئی دفعہ نقصان اٹھانا پڑا۔ صحابہ کرامؓ نے بارہا اس کے قتل کا ارادہ کیا حتیٰ کہ ایک دفعہ تو خود ان کے اپنے صاحب زادے، جو مخلص مومن تھے، نے بھی حضور ﷺ سے اپنے باپ کے قتل کی اجازت طلب کی، لیکن نبی مکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایسے کسی بھی عمل سے سختی کے ساتھ منع کر دیا اور فرمایا کہ میں اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ لوگ یہ کہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیتے ہیں۔ اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو عبداللہ بن اُبیّ سخت ترین سزا کا مستحق تھا لیکن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پھر بھی درگزر کیا صرف اس وجہ سے کہ کہیں عام لوگوں کے ذہن میں اسلام کے بارے میں کوئی منفی تاثر پیدا نہ ہو جائے گویا آپ کی نظر اصولی حکم کے نفاذ کے علاوہ اس کے نتائج اور عملی اثرات پر بھی تھی۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ایک داعی کے لیے نہ صرف عالمی قانون، رسم ورواج اور عرف سے واقفیت ضروری ہے بلکہ اگر دعوت اور مکالمہ کے مثبت نتائج کی توقع ہو تو دیگر اقوام کے قوانین اور رسم ورواج کا ممکن حد تک لحاظ اور احترام بھی کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح اگر کسی اسلامی حکم کا نفاذ وقتی مصلحت کے خلاف ہو تو اس کے نفاذ میں توقف بھی کیا جا سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں مسلمان قانون دانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کا سیرتِ طیبہ کی روشنی میں مطالعہ کریں اور ان پہلوؤں کا جائزہ لیں جہاں باہمی گفتگو اور مکالمہ میں لچک کے پہلو کو مدنظر رکھا جا سکتا ہے۔

اسلام کا تصورِ جہاد

اسلام کے بارے میں اہلِ مغرب کو جو غلط فہمیاں ہیں ان میں سے ایک اسلام کا تصورِ جہاد ہے، مدنی دور میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے چھوٹی بڑی تقریباً ستاسی (87) مہمات ترتیب دیں ان تمام مہمات کے مقاصد، محرکات اور اہداف مختلف تھے، ان میں سے بعض مہمات انسدادی نوعیت کی تھیں تو بعض دفاعی نوعیت کی تھیں جبکہ بعض خالص دعوتی اور تبلیغی نوعیت کی تھیں، لیکن محدثین اور مسلمان سیرت نگاروں نے ان تمام مہمات کو جن میں ترتیب اور تنظیم کا معمولی سا بھی خیال رکھا گیا تھا کتاب المغازی اور غزوات وسرایا کے عنوان سے ذکر کر دیا جس سے اس غلط پروپیگنڈا نے جڑ پکڑی کہ اسلام جنگ وجدال کا دین ہے۔ مغرب میں یہ تاثر عام ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے اور اگر اب بھی مسلمانوں کو موقع ملا تو وہ بزورِ شمشیر اسلام کو تمام دنیا پر غالب کر کے دم لیں گے۔

اسلام کے تصورِ جہاد کے حوالے سے اہلِ مغرب کے ساتھ ہمارا مکالمہ دو پہلوؤں پر ہونا چاہیے، پہلی بات تو ہمیں یہ واضح کرنا ہوگی کہ ابتدائی ایک دو صدیوں میں اسلام کے اسپین، وسطی ایشیاء اور برصغیر تک پھیلنے کی بڑی وجہ اسلامی تعلیمات کی کرشمہ سازی اور

مسلمان مبلغین کی انتھک کوششیں ہیں، دنیا کے کتنے ہی علاقے ایسے ہیں جہاں اسلامی فوجوں کا کبھی بھی داخلہ نہیں ہوا لیکن اسلام وہاں بھی موجود ہے، انڈونیشیا اور ملائیشیا پر بھلا کون سی اسلامی فوجیں حملہ آور ہوئی تھیں؟ لیکن کیا وہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں؟ اس لئے تاریخ کا کوئی بھی سنجیدہ طالب علم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور میں اسلام کو دوسری اقوام پر ٹھونسنے کے لئے تلوار سے کبھی مدد نہیں لی گئی۔

اس موضوع پر علامہ اقبالؒ کے استاذ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ کی کتاب (The Preaching of Islam) ہمارے لئے بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے، بدقسمتی سے جہاد کے بارے میں ہم اسلامی نقطہ نظر کو اہلِ مغرب پر پوری طرح واضح نہیں کر سکے، عام لوگ اب بھی اسی پرانی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہمیں اہلِ مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ اسلام کے پھیلاؤ کی وجوہات دیگر بھی ہیں۔ مثلاً ہمیں دلائل کے ساتھ بتانا ہوگا کہ بہت سے عیسائی جن سے ابتدائی دور میں اسلام کا مکالمہ ہوا وہ بھی مسلمانوں کی طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل نہیں تھے۔ اس لئے عقائد کی یکسانیت ابتدائی دور کے مسیحیوں کے قبول اسلام کا بڑا سبب بنی ہے، ڈاکٹر حمید اللہؒ (متوفی 2001ء) لکھتے ہیں:

> ''نجاشی فرقہ طبیعت واحدہ کا (یعنی مانوفرائٹ) عیسائی تھا۔ اور ان دنوں اس فرقے اور یونان کے عیسائیوں میں بڑے سخت اختلافات تھے، آخر الذکر اس بات کے قائل تھے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام میں بوقت واحد دو طبیعتیں تھیں، انسانی اور خدائی بھی۔ ابرہہ جو (یمن میں) نجاشی کا نائب تھا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ نہیں مانتا تھا بلکہ صرف مسیح اللہ مانتا تھا۔ غالباً نجاشی کے بھی یہی عقائد ہوں گے۔ اور یہ مسلمانوں کے عقائد کے بہت مماثل ہیں''(11)

اسی طرح روم اور ایران کے لوگوں نے قیصر و کسریٰ کی نسبت مسلمانوں کے کم جارحانہ اندازِ حکمرانی اور مناسب اور قانونی ٹیکسوں کے نفاذ کو خوش آمدید کہا اور یہی چیز ان کے قبول اسلام کا بنیادی سبب بنی۔

دوسرا، ہمیں اہل مغرب کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ جنگ، انسانی نفسیات کا لازمی جزو ہے۔اس لیے دنیا کی ہر تہذیب میں جنگ بہرطور موجود رہی ہے۔اہل مغرب جو اس وقت امن کے سب سے بڑے داعی ہیں ان کا موجودہ رویہ اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔ اسلام نے انسانی نفسیات کے اس پہلو سے آنکھیں بند نہیں کیں بلکہ انسان کے جنگی جنون کی تہذیب و تطہیر کر کے اس کو جہاد کے روپ میں پیش کیا ہے، اس سلسلے میں جہاد و قتال کے اسلامی قواعد و ضوابط، جنگی جنون کی منفیت عیاں کرنے کو کافی ہیں۔

خلافت اور جمہوریت

اسلام کے حوالے سے مغرب میں ایک اور غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اگر مسلمان طاقت میں آگئے تو وہ پوری دنیا میں خلافت کا نظام نافذ کریں گے اور طالبان طرز کا کوئی نظام حکومت نافذ کر کے لوگوں کی شخصی آزادیاں اور حقوق سلب کر لیں گے۔ برطانیہ کے موجودہ وزیر اعظم ٹونی بلیئر کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ مسلمان خلافت کا نظام واپس لانا چاہتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

اسلامی نظام خلافت کے خلاف اہل مغرب کے اس شدید ردِعمل کی اصل وجہ اور پس منظر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مغرب کی اس غلط فہمی کی بڑی وجہ مغرب کا وہ دور ہے جسے قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کہا جاتا ہے، جس میں پوپ ہی طاقت کا اصل سرچشمہ اور وہی فائنل اتھارٹی (Final Authority) تھا۔ پوپ نے ہمیشہ اربابِ حل و عقد کا ساتھ دیا اور حکمرانوں کو مذہبی تحفظ فراہم کیا، دوسری طرف عوام کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔ اصل میں مغرب نے اسلام کے نظامِ خلافت کو بھی یورپ کے دورِ تاریک میں اپنے

ہاں پائی جانے والی مذہبی حکومتوں پر قیاس کر رکھا ہے۔ مغرب نے صدیوں کی کشمکش کے بعد جو سیاسی اور شخصی آزادیاں حاصل کیں ہیں وہ اب انہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔

اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم مغرب پر یہ بات واضح کریں کہ اسلام کے تصور خلافت کو پاپائیت کے ساتھ کوئی نسبت نہیں کیونکہ مسلمانوں کا خلیفہ عیسائیوں کے پوپ کی طرح خدا کا نمائندہ نہیں ہے، جس کی کسی بات کو نہ تو چیلنج کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی دلیل کا پابند ہے ایک دفعہ جب سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ (متوفی 13ھ) کو ایک شخص نے خلیفۃ اللہ کہا تو آپ نے فوراً اس کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں بلکہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔ پوپ کے برعکس مسلمانوں کا خلفیہ خدا کی بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمائندہ ہے، جو مطلق العنان نہیں بلکہ دلیل کا پابند ہوتا ہے، جس سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، اور جو ایک خاص دائرے میں رہ کر ہی اپنے فرائض منصبی ادا کرسکتا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ خلفاء راشدین سے عام مسلمانوں نے نہ صرف اختلاف کیا بلکہ بسا اوقات ان کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور بھی کیا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ (متوفی 23ھ) جب مسلمان عورتوں کے لئے مہر کی ایک خاص مقدار مقرر کرنا چاہی تو ایک خاتون نے ان کو برسرِ ممبر ٹوک دیا اور پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان علماء نے ہمیشہ دلیل اور حق کا ساتھ دیا ہے اور ہمیشہ عوام کے شانہ بشانہ مذہبی اور سیاسی حقوق کی جنگ لڑی ہے پوری اسلامی تاریخ اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ امام ابو حنیفہ" ،(متوفی 150ھ)' امام احمد بن حنبل" (متوفی 241ھ) اور کتنے ہی جلیل القدر آئمہ نے وقت کے حکمرانوں کو چیلنج کیا اور اپنی جانوں تک کی پرواہ نہ کی۔ ہمیں مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ ہمارا ماضی ان کے ماضی سے بالکل مختلف ہے، اس لئے مغرب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا تاریک ماضی دکھا کر ہمیں

ہمارے روشن ماضی سے محروم کردے۔

اگر ہم اہل مغرب کو اس بات پر قائل کر لیں کہ اسلام کا معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام انسانی سوسائٹی کے لئے زیادہ مفید اور بہتر ہے تو پھر شاید ہمارے لئے ان کے ان تحفظات کو دور کرنا مشکل نہیں ہوگا جن کا تعلق دین اور مذہب کی اساس سے ہے۔ اہل مغرب کے وہ تحفظات جن کا تعلق اسلام کے بنیادی اور اساسی تصورات سے ہے وہ درج ذیل ہیں:

خدا کے وجود کا اثبات

یہاں بھی ہمیں اہل مغرب سے مکالمہ کرتے وقت اس ماحول کو پیش نظر رکھنا ہوگا جس میں مغربی ذہن پروان چڑھتا ہے اور شعور کی منازل طے کرتا ہے۔ اہل مغرب، جو ہر چیز کو عقل (Reason) کی بنیاد پر پرکھنے کے عادی ہیں ان کے سامنے خدائی کتاب کی بنیاد پر اپنے دلائل شروع کرنے سے پہلے خود خدا کے وجود کو زیر بحث لانا ہوگا ورنہ مغرب کی خطرناک حد تک آزاد سوچ ہمیں غیر سنجیدہ قرار دے گی۔ سائنسی امکان اور عقل کی بنیاد پر اگر خدا کے وجود کے لیے فطرت کے مشاہدے پر زور دیا جائے تو شاید ہمیں کامیابی حاصل ہو۔ جیسا کہ مکی عہدِ نبوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مکہ کو عقل اور مشاہدہ فطرت کی بنیاد پر اسلام کی طرف متوجہ کیا تھا۔

اسلام، عیسائیت اور یہودیت کی نئی صورت گری ہے؟

مغرب میں اسلام کے بارے صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص کے ذہن میں بھی یہ تصور راسخ ہے کہ اسلام کوئی مستقل دین نہیں بلکہ یہ عیسائیت اور یہودیت ہی کا نیا روپ ہے اس خیال کی ترویج میں بنیادی کردار تحریکِ استشراق کا ہے۔ دوسری صدی ہجری کے مشہور عیسائی عالم یوحنا دمشقی (John of Damascus) کو تحریکِ استشراق کا بانی قرار دیا جاتا ہے، اس نے "محاورۃ مع المسلم" اور "ارشادات النصاریٰ فی جدل

المسلمین " نامی کتب سے اسلام کے خلاف جس منفی پروپیگنڈے اور قلمی مناظرے کا آغاز کیا تھا، مغرب میں اس کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ نے اپنی قابل قدر تصنیف "ضیاء النبی ﷺ" کی چھٹی اور ساتویں جلد میں تحریکِ استشراق کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

اہل مغرب جو سماجی، معاشرتی اور سائنسی علوم کی معراج کو پہنچے ہوئے، میں آج بھی اسلام کے بارے میں نہ جاننا کم علمی کی دلیل نہیں ہے، مغرب میں یہ تاثر اب بھی عام ہے کہ اسلام، عیسائیت اور یہودیت ہی کی مسخ شدہ تعلیمات پر مبنی ہے اور اسلامی قوانین یہودیوں کی فقہ ''تالمود'' سے اخذ شدہ ہیں جن کا زیادہ زور ان کے ظاہری الفاظ پر ہے نہ کہ مقاصد پر۔ مشہور مستشرق ول ڈیورانٹ(Will Durant)(متوفی 1981ء) نے اپنی کتاب The Age of Faith میں، فلپ کے ہٹی(Philip K Hitti) نے اپنی کتاب Islam and the West میں اور مستشرق مورلیس سیل(Morris S Seale) نے اپنی کتاب(Muslim Theology) میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن وحدیث کا بڑا حصہ یہودی اور عیسائی روایات ہی سے ماخوذ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے تقابلی مطالعہ سے اہل مغرب کی اس غلط فہمی کو دور کیا جائے۔ (12)

قرآن وحی الٰہی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے انکار کی وجہ سے مغرب میں قرآن کو آسمانی صحیفے کے بجائے محمد ﷺ کی ذاتی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ بھی ماضی کا پروپیگنڈا ہی ہے جس کو زائل کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر چہ گذشتہ کئی صدیوں سے کئی یورپی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کیا جا رہا ہے لیکن ان تراجم کے اسلوب پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان مترجمین کے پیش نظر اسلام کا تعارف کروانے کی نسبت مسیحی جنگوؤں کو مقدس جنگ(Sacred War) کے لیے مسلمانوں کے خلاف تیار

کرنا تھا، بعد کے دور میں قرآن مجید کے تراجم میں یہی اسلوب کسی نہ کسی انداز میں غالب رہا ہے، اسی پروپیگنڈے کے زیراثر مسلمانوں کو محمڈن (Muammadan) پکارا گیا اور اسی سے محمڈن لا (Muhammadan Law) کی اصطلاح وجود میں آئی۔

قرآن مجید ہر دور کے لیے نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کا زندہ و جاوید معجزہ ہے۔ عہد رسالت میں بھی لوگوں نے قرآن مجید کو جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اختراع قرار دیا تو آپ نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت، اس کے اسلوبِ بیان اور ہر قسم کے تناقض سے مبرّا ہونے کو اس کے کلام الٰہی ہونے پر دلیل کے طور پر پیش کیا۔ عقل پرستی کے موجودہ دور میں قرآن مجید کا معجزانہ پہلو اس کی تعلیمات کے علاوہ وہ سائنسی اور تاریخی حقائق ہیں جن کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس پہلو پر توجہ دیں اور اہل مغرب کو یہ بتائیں کہ کتنے ہی ایسے تاریخی اور سائنسی حقائق ہیں جن تک مغرب صدیوں کی محنت اور تجربات کے بعد پہنچا ہے لیکن قرآن مجید نے صدیوں پہلے ان حقائق کو بیان کر دیا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کسی انسان کا نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے ڈاکٹر موریس بوکائے کی کتاب The Bible, The Quran and Science اور اس کے بعد اس موضوع پر شائع ہونے والی دیگر کتب اس حوالے سے ہماری توجہ کی خصوصی مستحق ہیں۔

اسلامی دنیا میں مذہبی تکثیریت کا وجود

اہل مغرب میں اسلام کے بارے یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں اقلیتوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس لئے مغرب سے مکالمہ میں اس نکتہ کو اجاگر کرنا ضروری ہے کہ عہد رسالت اور اس کے بعد کی اسلامی دنیا بالخصوص مصر، لبنان، انڈیا اور عثمانی ترکوں کے دور میں ہمیشہ قرآنی اصول کے مطابق لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل رہی ہے۔ اسلامی دنیا میں مذہبی تکثیریت کا وجود ہمارے موقف کی واضح شہادت مہیا

کرتا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن مجید کی اصولی تعلیم:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرۃ256)

''دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت تو گمراہی سے صاف صاف کھل چکی ہے''

کی نظری اور عملی تبلیغ اور اشاعت کی جائے۔اس کے علاوہ عہدِ رسالت، عہدِ خلافتِ راشدہ اور مسلم عروج کے ان تاریخی معاہدات سے بھی استشہاد کیا جاسکتا ہے، جن میں مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اسلام ایک حقیقی متبادل

اہلِ مغرب میں اعلیٰ ترین سطح پر اب یہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے کہ مذہب سے مکمل دستبرداری ان کے معاشرتی اور تہذیبی زوال کا باعث بن رہی ہے اور موجودہ مغربی فلسفہ ان کے تمام مسائل کا حل نہیں ہے اس وقت اہلِ مغرب جو روحانی خلا محسوس کر رہے ہیں اس کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا فی الوقت مغربی سیکولرازم کو ایک خاص مفہوم میں بحران کا سامنا ہے اس حوالے سے ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالا (بابت ماہ اگست 2005ء) میں پروفیسر میاں انعام الرحمٰن کا تجزیاتی مضمون ''مغرب کی ابھرتی ہوئی مذہبی شناخت'' قابل مطالعہ ہے۔ پروفیسر موصوف کا تجزیہ یہ ہے کہ آج کی عالمی صورتِ حال میں مذہب ایک بار پھر اہلِ مغرب کی زندگی میں دبے پاؤں داخل ہو رہا ہے، اس لئے مسلمان اہلِ علم کے لیے یہ مناسب وقت ہے کہ وہ اہلِ مغرب کے سامنے اسلام کو بہتر انداز میں پیش کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مغرب کی نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسلام کو آج کے جدید اسلوب ہ تکنیک اور زبان میں پیش کیا جائے کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اپنی فطری تعلیمات کی وجہ سے مغرب کے اعلیٰ ذہن کو متاثر نہ کرے۔

ضروری گزارش

کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لئے رجالِ کار کی تیاری بڑی اہمیت رکھتی ہے ، چونکہ اسلام کی اشاعت کا تمام انحصار دعوت وتبلیغ اور دوسری قوموں سے مکالمے پر ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف بین المذاہب مکالمے کی عملی مثال قائم کی بلکہ ایسے افراد بھی تیار کیے جو دوسری قوموں سے مکالمے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے اب جبکہ حالات کے جبر نے ہمیں بین المذاہب مکالمے کی میز پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہے، ہمارے پاس ایسے افراد کی شدید کمی ہے، جن کی مغربی فکر وفلسفہ پر تنقیدی نظر ہو اور جو اہل مغرب کی ذہنی ساخت ان کی نفسیات، پس منظر اور تکنیک سے واقف ہوں، اس وقت ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ علمی رسوخ رکھتے ہیں وہ مغربی زبان وادب اور مغرب کی نفسیات سے واقف نہیں اور جو لوگ مغربی زبان اور محاورے کو جانتے ہیں وہ علمی طور پر کمزور ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس اور جامعات کے نصابِ تعلیم میں مغربی فکر وفلسفہ کو بطور لازمی مضمون کے شاملِ نصاب کیا جائے، تاکہ ایسے رجالِ کار کی تیاری ممکن ہو جو مغرب کے دانش ور طبقے سے پورے اعتماد کے ساتھ بات کر سکیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یونانی فکر وفلسفہ کے عروج کے دور میں مسلمان اہل علم نے یونانی علم کلام اور فلسفہ پر مکمل عبور حاصل کیا اور پھر یونانی فکر وفلسفہ کے علمی اور تحلیلی جائزے کے بعد اسلامی فکر کی برتری کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا۔ دورِ حاضر میں مسلمان اہل علم پر لازم ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی تاریخ کو دہراتے ہوئے جدید علم کلام اور مغربی فکر وفلسفہ پر عبور حاصل کریں، تاکہ مغربی فکر کا بھرپور تنقیدی جائزہ لے کر اربابِ دانش پر اس کی کمزوریوں اور کھوکھلے پن کو واضح کیا جا سکے۔

پاکستان میں ماہنامہ ''ساحل'' کراچی، ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالا اور سہ ماہی

"مغرب اور اسلام" اسلام آباد، کے علاوہ کئی دیگر رسائل میں مغربی فکر پر تنقیدات شائع ہوتی رہتی ہیں، لیکن ان کوششوں کو زیادہ مربوط بنانے کی ضرورت ہے۔ میری معلومات کے مطابق علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد اور مولانا زاہد الراشدی کے زیر نگرانی قائم "الشریعہ اکادمی" گوجرانوالا کے علاوہ شاید چند ہی ایسے ادارے ہوں گے جہاں پر مغربی فکر و فلسفہ کا تعارفی اور تنقیدی جائزہ مستقل مضمون کے طور پر داخل نصاب ہو۔

ایک اور چیز جس کا ہمیں خاص طور سے لحاظ رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ مغرب کے ساتھ مکالمہ میں ہمارا رویہ معذرت خواہانہ اور دفاعی کی بجائے اقدامی ہونا چاہیے، ہمیں اسلام کے بنیادی عقائد اور نظریات کی ایسی تاویل سے اجتناب کرنا چاہیے جس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ معروف روایت کے مطابق جب قریشی وفد حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سامنے مختلف آپشنز (Options) رکھے کہ آپ جو پیش کش بھی چاہیں قبول کرلیں اور دعوت و تبلیغ سے باز آجائیں تو آپ نے اس وقت جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ ذہنی مرعوبیت کے شکار لوگوں کے لئے خاص طور پر قابل توجہ ہیں، آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اپنے مشن سے پیچھے ہٹنے والا نہیں۔

اسی طرح جب شاہِ حبشہ نے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا تاکہ وہ سیدنا عیسی علیہ السلام اور عیسائی مذہب کے بارے اپنا موقف بیان کریں، تو مسلمان سخت پریشان ہوئے کیونکہ سچ کہنے کی صورت میں نجاشی اور درباریوں کے ناراض ہونے کا خطرہ تھا، لیکن آپ کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ نے باہمی مشاورت کے بعد یہ متفقہ فیصلہ کیا:

"نَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَاقَالَ اللّٰهُ وَمَاجَآءَ نَابِهٖ نَبِيُّنَا"(13)

"اللہ کی قسم ہم وہی کہیں گے جو اللہ کا حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم ہے"

اس لیے ہمیں کسی قسم کی ذہنی مرعوبیت کے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ اسلام ہی ایک ایسا تریاق ہے جو مغرب کی تہذیب کو ہر قسم کے نقائص سے پاک کر کے زندہ وجاوید کر سکتا ہے۔ مغرب کے تمام مسائل، خاندانی نظام کی شیرازہ بندی، بچوں میں بڑوں کا احترام پیدا کرنا، باہمی اخوت، نسلی تفاخر کا خاتمہ، نفسیاتی استحکام، احترام آدمیت، تحمل، ایڈز جیسی بیماریوں کے خلاف سماجی مدافعت وغیرہ کا حل صرف اسلام کے پاس ہے۔

مصادرومراجع

(1) شبلی نعمانی، علامہ (م:1914ء) 'سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، الفیصل ناشران وتاجران کتب اردو بازار لاہور، جلد 4' ص 91

(2) احمد بن حنبل، ابو عبداللہ الشیبانی، الامام (م: 241ھ)' المسند، حدیث زید بن ثابتؓ، ح:1108، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1991 عیسوی' جلد 6' ص 238

(3) ابوداود، سلیمان بن الاشعث بن اسحاق السجستانی (م:275ھ)' سنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد، ح:2277، دارالسلام للنشر والتوزیع، الریاض، 1999ء' ص 230

(4) سرخسی، ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل (م:490ھ)' المبسوط' کتاب الصلوٰۃ، دارالمعرفۃ، بیروت، 1978ء جلد 1' ص 37

(5) حمیداللہ، ڈاکٹر (م:2002ء)' صحیفہ ہمام بن منبہ' ناشر رشیداللہ یعقوب، کلفٹن، کراچی، 1988ء ص 193

(6) ابن سعد، ابوعبداللہ محمد (م:456ھ)' الطبقات الکبری' ذکر بعثۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الرسل بکتبہ الی الملوک' دار صادر بیروت 1985ء' جلد 1' ص 258

(7) ابن ہشام، ابومحمد عبدالمالک (م:218ھ)' السیرۃ النبویۃ' امر الھدنۃ، دار احیاء التراث العربی بیروت، 1995ء جلد 3' ص 351

(8) ابن اثیر، ابوالحسن علی بن ابی الکرم محمد ابن اثیر الجزری (م:630ھ)' اسد الغابۃ' تذکرۃ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ، دار احیاء التراث العربی، بیروت' جلد 1' ص 362

(9) ابن قیم الجوزیہ، ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر (م:751ھ)' زاد المعاد' مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، 1979ء' جلد 3' ص 691-692

(10) مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: مقالہ نگار کی کتاب "صحابہ کرام کا اسلوب دعوت وتبلیغ" مکتبہ جمال کرم لاہور 2004ء' ص 177-187

(11) حمید اللہ، ڈاکٹر (م:2002ء)' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی زندگی' دار الاشاعت کراچی 1987ء' ص 127

(12) مقالہ نگار نے اپنے پی ایچ۔ڈی کے زیر تکمیل مقالے "صحاح ستہ کی احادیث پر منکرین حدیث اور مستشرقین کے اعتراضات کا علمی جائزہ" میں مستشرقین کے ان اعتراضات کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا ہے

(13) ابن ہشام، 373/1

بین المذاہب مکالمہ

ڈاکٹر محمد طفیل
پروفیسر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی
اسلام آباد

بین المذاہب مکالمہ

ڈاکٹر محمد طفیل

مذہب اور انسان کا رشتہ اس قدر پرانا ہے، جس قدر اس کائنات اور انسان کا رشتہ قدیم ہے۔ چنانچہ اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ بنی آدم کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے پہلے نبی تھے اور وہ اپنے بیٹوں کو وحدانیت کا درس دیتے تھے۔ جو الہامی مذاہب کی بنیادی تعلیم ہے۔ اسی طرح مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے لاتعداد انبیاء اور رسول مبعوث کئے۔

جس طرح مذہب اور انسان کا رشتہ قدیم ہے اور ہمیشہ کے لئے قائم و دائم ہے، اسی طرح مکالمہ اور خاص طور پر مذہبی مکالمہ قدیم سے جاری اور ساری ہے اور جب تک مذہب کا وجود باقی ہے' مذہبی مکالمہ جاری رہے گا' کیونکہ مذہب انسانی زندگی کے مسائل سے بحث کرتا اور انسانی بحث و تمحیص اور افہام و تفہیم' باہمی تبادلۂ افکار اور بات چیت سے ہی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے بہت سے مذہبی مکالمات محفوظ رکھے ہیں اور دیگر الہامی کتابیں بھی مذہبی مکالمات کا مواد رکھتی ہیں۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو تخلیق آدم کے وقت فرشتوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان مذہبی مکالمہ ہوا بلکہ اس سے بھی پہلے انسانی ارواح اور خالق ارواح کے مابین ایک مکالمہ ہوا۔ جو مکالمۂ الست کے نام سے مشہور ہے۔ بعد ازاں مبعوث ہونے والے تمام

انبیاء علیہم السلام اور انکی اقوام اور مخاطبین کے مابین مکالمات ہوتے رہے۔ چنانچہ سیدنا آدم علیہ السلام کا شیطان سے، سیدنا نوح کا ان کی قوم سے، سیدنا ابراہیم کا نمرود سے' سیدنا یعقوب کا ان کے بیٹوں سے، سیدنا موسیٰ کا فرعون سے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے حواریوں سے مکالمہ سامی مذاہب کے آداب کا اہم حصہ ہیں۔ مزید برآں قرآن حکیم نے اصحابِ جنت اور اصحابِ جہنم کا مکالمہ اس طرح سے بیان کیا ہے جیسے عام زندگی میں انسانوں کے مابین مکالمہ جاری رہتا ہے۔

مذہبی مکالمے کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم میں جن آیات کا آغاز ﴿یَآ اَھْلَ الْکِتَابِ﴾ سے ہوتا ہے وہ آیات آسمانی مذاہب کے درمیان جاری ہونے والے مکالمہ کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اسی طرح جب محسن انسانیت اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں بھی ہمیں یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں، مشرکین اور ملحدین کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طویل اور متعدد مکالمات ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام مکالمات مذہب اسلام کی صداقت اور حقانیت ثابت کرنے کے لئے تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام، تابعین عظام، اہل علم، اصحاب تقویٰ، فقہائے کرام، صوفیائے عظام، متکلمین اور ادباء و شعراء کے درمیان میں بھی مذہبی مکالمات جاری رہے۔ جو اسلامی تاریخ کا ایک سنہری باب ہیں۔ اس لئے دینی مکالمہ اسلامی تعلیمات اور روح کے عین مطابق ہے۔

سابقہ سطور میں جن مکالمات کا ذکر کیا گیا، وہ سبھی مذہبی نوعیت کے مکالمات ہیں' جن کا اولین مقصد اللہ تعالیٰ کی واحدانیت کو ثابت کرنا ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا' حفاظت کرنے والا' اس کا نظام چلانے والا نیز اس کائنات میں تصرفات کرنے والا' اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور اس کارگاہِ عالم کا منتظم و منصرم نہیں ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ اس کائنات میں سچ اور حق وہی ہے۔ جو اس وحدہٗ لاشریک نے بنایا ہے اور قرار دیا ہے۔ سب مخلوقات عموماً اور انسان خصوصاً اسی حق و صداقت پر عمل کرنے کا پابند ہے۔

جس کائنات میں ہم آباد ہیں۔ اس میں مذہب بنیادی اکائی ہے۔ جس کی پابندی اور پیروی کسی نہ کسی اسلوب اور عقیدے کے مطابق انسانوں کی بڑی اکثریت کرتی رہی ہے اور منکرین خدا اور ملحدین مذاہب کے علاوہ سبھی ابنائے آدم اپنے اپنے مذہب کی پابندی اور پیروی کرتے رہے ہیں۔ جبکہ دور حاضر میں ایک طرف انسانوں سے مذہب کی پیروی کم ہوتی جا رہی ہے۔ انسان روحانی اقدار سے منہ موڑ کر مادی امور میں منہمک ہو رہا ہے۔ انسانی عقل و شعور کی بالیدگی نے ایک جانب توہمات اور غلط رسوم کو ختم کر دیا ہے تو دوسری جانب انسان مذہب کی ہدایات کو انسانی آزادی پر بے جا پابندیاں خیال کرتے ہوئے، مذہبی امور کو خیر باد کر رہا ہے۔ نیز کرۂ ارض پر پائے جانے والے بہت سے مذاہب انسان کو مسرت، طمانیت اور نجات کا پیغام دینے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

ایک طرف انسان کے نظام حیات میں مذہب کا جذبہ اور کردار کم ہو رہا ہے، تو دوسری جانب انسان کے نفسیاتی' معاشرتی' معاشی' سیاسی اور تخلیقی مسائل میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ہر فرد' گروہ' جماعت اور جمعیت متنوع مسائل سے دوچار ہے۔ مشینوں کی ایجاد' ٹیکنالوجی کی بہتات اور سائنسی اکتشافات نے انسان کو متنوع ذہنی، فکری اور جسمانی مسائل کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہر انسان عموماً اپنے اپنے مذہب سے نالاں' اس کے عقائد سے منحرف اور اس کی تعلیمات سے گریزاں ہے۔

مذہب کی تاریخ کا مطالعہ اس امر کا عکاس ہے کہ آج تک جن مذاہب سے انسان آگاہ ہوا ہے' ان سب کا کردار اور عمل انفرادی ہے۔ گویا اسلام کے علاوہ ہر مذہب اور اس کے پیروکار اپنے کو ہی حق پر تسلیم کرتے ہیں اور دوسرے مذاہب اور ان کے ماننے والوں کو باطل قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ہر انسان اپنا ایک ہی مذہب رکھتا ہے چنانچہ یہودی صرف

یہودی ہے دنیا کے دیگر مذاہب سے اس کا رشتہ معاندانہ ہے اور یہودیت غیر یہودیوں کو انسانی شرف و کرامت سے بھی محروم قرار دیتی ہے۔ اسی طرح عیسائیت صرف اپنے پیروکاروں کو راہ ہدایت پر اور نجات کا حقدار سمجھتی ہے اور غیر عیسائی جادۂ حق سے محروم ہے۔ ہندومت' بدھ مت' جین مت' مجوسیت' کنفیوشزم' تاؤازم اور دیگر مذاہب بھی انفرادی مذاہب ہیں اور ان میں اجتماعیت کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا۔

اس بیان سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس کائنات میں پائے جانے والے افراد مذہب کو انفرادی انداز میں اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ہندو اپنے مذہب' ہندومت کے ذریعے ہی اپنی تسکین پاتا اور ضروریات حاصل کرتا ہے جبکہ یہودی کو صرف یہودیت پر ہی عمل کرنا ہے اور عیسائیت سے صرف عیسائی ہی استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت تک نہ تو ایک انسان ایک سے زیادہ مذاہب اپناتا اور ان سے استفادہ کرتا ہے اور نہ ہی بہت سے مذاہب مل کر انسانی مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض عالمی نظام اور ثقافتیں اس امر کی دعویدار رہی ہیں کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے اس لئے ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آج کل بین المذاہب مکالمہ (Inter Faith Dialogue) کو بہت زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ ہر حکمران' دانشور اور مفکر بین المذاہب مکالمے کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسے اپنانے کی تاکید کرتا ہے اور اس کے فوائد بیان کرتا ہے۔ اس لئے اس موضوع کے اہم امور کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

اگرچہ مذہبی مکالمہ اور دینی مباحثہ عرصہ دراز سے جاری ہے۔ لیکن آج جس مذہبی مکالمے کی بات کی جا رہی ہے وہ مذکورہ بالا مذہبی مکالمے سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس مذہبی مکالمے کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ مکالمے دنیا کے تمام مذاہب کے مابین ہوں اور اس کی شکل یہ ہو کہ آج انسانیت کو جو مسائل درپیش ہیں' ان کا حل مذہب کی روشنی میں تلاش کیا

جائے۔ یقیناً یہ ایک اچھا جذبہ ہے' جو انسان کو مذہب سے قریب کرتا ہے۔

تاہم اس مکالمے کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ مثلاً آج انسان کو دہشت گردی' عالمی تجارت' خاندانی منصوبہ بندی' انسانی حقوق' خاندانی نظام کی کمزوری' فضائی علوم اور فکری اثاثہ جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ تو سب مذاہب کے ماہرین مل کر بیٹھیں اور ان جیسے مسائل کا حل تلاش کریں۔

جدید مکالمے کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ درپیش مسئلہ ایک ایسی مجلس میں پیش کیا جاتا ہے جس میں عالمی مذاہب کے ماہرین شریک ہوتے ہیں۔ مسئلہ پیش کئے جانے کے بعد ہر مذہب کا ماہر اپنے مذہب کی تعلیمات کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔ جسے منصفین کا ایک مجموعہ محفوظ کر لیتا ہے۔ اس طرح تمام مذاہب کے ماہرین درپیش مسئلہ کے بارے میں اپنی اپنی آراء پیش کرتے ہیں۔ جب تمام مذاہب کے نمائندے اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کر لیتے ہیں، تو منصفین اور ماہرین مذاہب کا مشترکہ اجلاس ہوتا ہے۔ جس میں زیر غور مسئلہ کے جملہ پہلوؤں اور ان کے بارے میں مختلف مذاہب کے پیش کردہ حل کا تنقیدی اور عملی جائزہ لیا جاتا ہے۔ تاکہ بہت سی تجاویز اور اقدامات میں کسی ایک کی سفارش کی جا سکے۔

واضح رہے کہ ان مراحل سے گزر کر جو ایک حل تجویز ہوتا ہے' اس پر سب مذاہب کے نمائندے اتفاق کرتے ہیں اور فیصلہ سب مذاہب کا متفقہ فیصلہ کہلاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آج اس طرح کا ایک یا دو فیصلے کوئی اہمیت نہ رکھیں' لیکن ہماری رائے ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے امور میں اضافہ ہوتا رہے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ متفقہ مذہبی نکات ایک نئے مذہب کی شکل اختیار کر لیں گے۔ جو ایک جانب تمام مذاہب کا متحدہ مذہب کہلائے گا، تو دوسری جانب اشاعتی اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے پرچار کر کے ایسے مجموعہ کو انسانیت کا متحدہ (Unified) مذہب قرار دے دیا جائے گا، جس کی موجودگی

میں الہامی اور غیر الہامی مذاہب کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔

ممکن ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ متحدہ مذہب (Unified Single Religion) کا نظریہ ایک خام خیال ہو اور اس کی عملی زندگی میں کوئی حقیقت نہ ہو! اس رائے کا جواب دیتے وقت ہمیں یورپی اقوام کی ایک اور کوشش کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ پچھلی دہائیوں سے یورپی اقوام اپنی ایک مشترکہ زبان (Lingua Franca) ایجاد کرنے کی سعی کر رہی ہے۔ چنانچہ سپرانتو کے نام سے انہوں نے ایک زبان متعارف کر رکھی ہے۔ جو اس اصول پر مبنی ہے کہ یورپ میں مروجہ تمام زبانوں کے آسان اور مروجہ الفاظ جمع کر کے نئی زبان ایجاد کی جائے۔ چنانچہ آج بھی سپرانتو کی ترویج واشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ جبکہ یورپی زبانوں کے ماہرین پر امید ہیں کہ وہ دن دور نہیں، جب سپرانتو پورے یورپ کی مشترکہ زبان کے طور پر بولی اور سمجھی جائے گی جیسے یورپ کی جدید کرنسی ''یورو'' پورے یورپ اور اقوام عالم میں رواج پا چکی ہے۔

اس طرح ہماری رائے ہے ''بین المذاہب مکالمہ'' اور اس کے نتائج عالمیت یا عالمی نظام (Globalization) کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ جس طرح نظام حکومت، معیشت، ثقافت، تہذیب اور موسیقی میں عالمی نظام کو مروج کروانے کی کوششیں جاری ہیں، اسی طرح مذہب، اخلاق، انسانی روایات اور مذہبی رسوم اور دینی شعائر میں بھی ہم آہنگی پیدا کرنا عالمی نظام کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنیس سو اسّی کی دہائی سے مختلف مذاہب کے مابین مکالمے کو رواج دیا جا رہا ہے اور امریکی، مغربی نیز یورپی اقوام اس ضمن میں پیش پیش ہیں۔

بین المذاہب مکالمے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ غالباً اسی مکالمے کے ذریعے سے انسان کو یہ سوچنے کی دعوت دی جارہی ہے کہ حق اور صداقت کسی ایک مذہب تک محدود نہیں ہے اور نہ حق وصداقت پر کسی ایک مذہب کی اجارہ داری ہے۔ بلکہ یہ تمام کی مشترکہ میراث

ہے، جسے ہر مذہب میں تلاش کیا جانا چاہیے' نیز انسانی مسائل کا حل مذہب پیش کرتا ہے۔ تاہم ہر حل ہر وقت' ہر جگہ اور تمام حالات میں قابل عمل نہیں ہوتا۔ نیز ہر قوم اپنے ثقافتی پس منظر اور حالات وعادات کے مطابق ہی کوئی حل اپنا سکتی ہے۔

بین المذاہب مکالمے کو اس حقیقت کی روشنی میں بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کائنات میں پائے جانے والے سب مذاہب یکساں نہیں ہیں، کیونکہ بعض مذاہب انسانی اور عالمی ہیں جبکہ دوسرے بعض مذاہب نسلی اور علاقائی ہیں۔ بعض مذاہب قدیم ہو کر اب اپنا وجود کھو چکے ہیں اور ان کے مدمقابل چند طبعی اور قدیم مذاہب آج بھی زندہ اور مؤثر ہیں۔ اسی طرح اس کائنات کے مذاہب میں ایک اور بنیادی فرق ہے کہ ان مذاہب میں یہودیت' عیسائیت اور اسلام اپنے آپ کو الہامی (REVEALE) مذاہب قرار دیتے ہیں اور دیگر مذاہب کو غیر الہامی مذاہب تسلیم کرتے ہیں۔ جبکہ الہامی مذاہب رسالہ وحی پر مبنی ہوتے ہیں اور غیر الہامی مذاہب کا خمیر انسانی عقل وشعور سے اٹھایا جاتا ہے اور انسان اپنی سوچ' تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر وجود میں آتا اور پروان چڑھتا ہے۔

اس کائنات میں سینکڑوں چھوٹے بڑے مذاہب کی پوجا، پرستش اور عبادت کی جاتی ہے اور ان کی تعلیمات پر عمل کیا جاتا ہے، جنہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا یقیناً ایک دشوار عمل ہوگا۔ اور اگر تمام مذاہب کے نمائندوں اور ماہرین کو ایک جگہ جمع کرنا ممکن بھی ہو' تو ان میں ہم آہنگی اور اتفاق رائے پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین مرحلہ ہوگا۔ کیونکہ الہامی اور غیر الہامی مذاہب کے ماننے والوں کے مابین بھی بنیادی اختلافات اور وسیع خلیج حائل ہے۔ اس لئے ہندومت' مجوسیت' یہودیت' عیسائیت اور اسلام کے ماننے والوں میں بھی بہت سی داخلی تقاسیم اس حد تک موجود ہیں کہ جو ایک چیز کے حرام وحلال ہونے اور جائز وناجائز قرار پانے تک وسیع ہیں۔ اس لئے ان مذاہب کے داخلی اختلافات ان میں وحدت اور یگانگت کی راہ میں حائل ہونگے اور ان میں اتفاق رائے پیدا کرنا مشکل ہوگا۔

اقوام عالم میں مروجہ مذاہب' اخلاقی نظام اور معاشرتی اقدار اس مقصد کے لئے ہیں کہ ان پر عمل پیرا ہو کر انسان روحانی ترقی اور ذہنی طمانیت حاصل کر سکے۔ کیونکہ جس طرح انسان کو جسمانی راحت و آرام کی ضرورت ہے اسی طرح انسان کو روحانی بالیدگی بھی درکار ہے' جبکہ موجودہ بین المذاہب مکالمہ انسان کے مادی اور فکری مسائل تک محدود ہے اور اس کا دائرہ انسان کے روحانی پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتا۔ بلکہ موجودہ بین المذاہب مکالمہ مذہب کے روحانی پہلو' مذہب کے غیر مرئی عقائد و تصرفات اور انسانی مشاہدے سے خارج امور انسانی زندگی سے خارج کر دینا چاہتا ہے اور انسان کو مادی وسائل تک محدود کرتے ہوئے اس کی زندگی سے دعاء' خیر خیرات' بزرگوں سے استفادہ اور روحانی قدروں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں بین المذاہب مکالمہ ایک ایسی اختراع ہے جو ایک طرف انسانوں کو مذہب کے روحانی اثرات سے دور کرنا چاہتا ہے تو دوسری جانب تمام ابنائے آدم کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے جو نہ الہامی ہے اور نہ روحانی' بلکہ وہ حقیقت میں قابل عمل بھی نہیں ہے۔ اس لئے سنجیدہ اصحاب فکر و دانش کی یہ مستحکم رائے ہے کہ بین المذاہب مکالمہ' "اک سعی لا حاصل اور اور ایسی کوشش ہے، جس کی کوئی منزل نہیں ہے"۔ کیونکہ کسی بھی مذہب کے وجود میں آنے کے لئے جن بنیادی عناصر کی ضرورت ہوتی ہے مکالمے کا تصور ان عناصر سے ہی محروم ہے۔ اس لئے مکالمے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

آج اگر دنیا کا جائزہ لیا جائے، تو یہ امر بھی سامنے آتا ہے کہ الہامی مذاہب کے مابین کوئی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی کیونکہ یہودیت کے ہاں عیسائیت کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہودیت اسلام کو بھی اپنا تسلسل قرار دیتی ہے جبکہ عیسائیت بھی یہودیت کو قصہ پارینہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتی۔ ان دونوں سے ہٹ کر اسلام ان دونوں کو الہامی مذاہب تو تسلیم کرتا ہے' لیکن اپنے اپنے وقت اور علاقے میں اور جب اسلام اور اس کی تعلیمات کا

دور دورہ ہوا تو یہ دونوں مذاہب غیر مؤثر اور قصہ ماضی قرار پا گئے۔ یہاں تک کہ انجیل وتورات میں تحریف ہونے اور ان دونوں الہامی کتابوں کے الہامی نسخوں کے کھو جانے کی بناء پر مسلمان ان مذاہب کے پیرو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اہل کتاب کا بھی درجہ نہیں دیتے' کیونکہ اسلام صرف اپنے کو دین حق قرار دیتا اور صرف اسلامی شریعت کو مؤثر اور قابل عمل گردانتا ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں دشوار ہوگا کہ الہامی مذاہب بھی باہم ایک دوسرے کو برابری کا درجہ دیں۔

جدید مکالے کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ مکالے کا منہج (METHOD) کیا ہو۔ کیونکہ دنیا کے مختلف مذاہب حقائق کے اثبات کے لئے مختلف طریقے اور اسالیب اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً تخلیق کائنات اور انسانی زندگی کے آغاز کے حوالے سے ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ کائنات پانی کا مجموعہ تھا' سورج کی تپش سے پانی خشک ہوا تو بعض جزیرے وجود میں آئے' ان پر پانی کے جانور پہنچے اور ترقی کرتے کرتے انہوں نے انسان کی صورت اختیار کر لی اور یہ سب کچھ حادثاتی طور پر وقوع پذیر ہوا چنانچہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے برعکس الہامی مذاہب عموماً اور اسلام خصوصاً اس عقیدے کا حامل ہے کہ اس کائنات کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا اور وہی اس کا انتظام وانصرام چلانے والا ہے۔ نیز تخلیق آدم علیہ السلام کا واقعہ تقریباً سبھی الہامی مذاہب میں یکساں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر ان سے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ ان متغائر اور متضاد نظریات کا ایک منہج کے تحت جائزہ لینا اور انہیں قابل عمل یا ناقابل عمل قرار دینا ایک انتہائی دشوار گذار عمل ہے۔

الہامی اور غیر الہامی مذاہب میں ابدی حقیقت کے بارے میں بہت سی آراء ہیں۔ مزید برآں ہندومت' بدھ مت' جین مت' اور سکھ مذہب ہندوستانی مذاہب ہونے کے باوجود حقیقت ثابتہ کے بارے میں ایک دوسرے سے متغائر اور متضاد آراء رکھتے ہیں۔ نیز

یہ بات بھی پایۂ ثبوت تک پہنچے گی کہ خدا کے وجود کے بغیر مذہب کا تصور کس طرح قائم ہوتا ہے؟ یہ اور اس طرح کے بے شمار مسائل اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ وہ کونسا نکتہ ہوگا جہاں سے بین المذاہب مکالمے کا آغاز ہوسکتا ہے۔

ان تمام مشکلات' الجھنوں اور عملی دشواریوں کے باوجود ہماری رائے میں بین المذاہب مکالمے کو فروغ دیا جائے۔ کیونکہ اگر انسان صدق دل سے حتمی حقیقت کی جستجو کرتا ہے تو غیبی مدد اس کے شامل حال ہوتی ہے' نیز مذہب اور اس کی تعلیمات کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں بالعموم اور اسلام کے حوالے سے انسانوں کے ذہنوں میں موجود غلط معلومات اور نظریات کا قلع قمع صرف اور صرف مکالمے کے ذریعے سے ہی ممکن ہے اور انسانوں کے مابین افہام و تفہیم کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ مزید برآں دیگر مذاہب نے باہمی مکالمے کا آغاز کر دیا ہے اور مسلمانوں نے اس کام میں بھرپور حصہ نہ لیا تو اسے اسلام اور مسلمانوں کی کمزوری سمجھا جائے گا اور اسلام کے بارے میں پائے جانے والے شکوک و شبہات اور غلط نظریات اور رویوں کا ازالہ کرنے کا موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان بین المذاہب مکالمے میں ضرور حصہ لیں اور اپنا کردار ادا کریں۔

قرآن حکیم اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی امت ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں اپنے انبیاء و رسل مبعوث فرمائے۔ تاکہ انسانوں میں پیدا ہونے والے جدید امور اور اختلافات کا فیصلہ کر سکیں۔ اس لئے مکالمہ بین المذاہب کا خمیر بھی انسانی وحدت سے ہی اٹھایا جائے اور انسانی وحدت کا قیام ہی مکالمے کا اساسی مقصد ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ (البقرہ:213)

ترجمہ: لوگ ایک ہی امت (دین پر) تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے خوش خبری دینے اور ڈرانے والے نبی بھیجے، اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری، تا کہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں۔

یہ آیت اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے کہ بنیادی طور پر تمام انسان ایک ہی دین پر ہیں۔ یہ وہی دین ہے، جس کا آغاز سیدنا آدم علیہ السلام سے ہوا اور بعد میں انسانوں میں جدید افکار اور متنوع خیالات نے جنم لیا اور ان میں ہدایت اور گمراہی پر عمل کرنے والے دو گروہ پیدا ہو گئے۔ انسانوں میں ان دونوں گروہوں کو متحد اور متفق کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء مبعوث کئے اور کتابیں نازل کیں تا کہ بین المذاہب مکالمے کا اصلی مأخذ طے ہو جائے۔

جس طرح قرآن حکیم وحدت انسانی کی تعلیم دیتا ہے، اسی طرح وحدت ادیان پر روشنی ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق وصداقت کو ایک ہی دین میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس لئے اس کائنات میں آنے والے پہلے انسان سے لے کر اس کائنات کے آخری فرد تک تمام انسانوں کا ایک ہی دین ہے۔ آج چونکہ انسانیت بہت سے ادیان، مذاہب، عقائد اور نظاموں میں تقسیم ہو گئی ہے، اس لئے جدید بین المذاہب مکالمے کا مقصد وحدتِ ادیان ہونا چاہئے، کہ انسان یہ حقیقت تلاش کرے کہ وہ کون کون سے حقائق ہیں، جو موجودہ مذاہب و ادیان میں مشترک ہیں۔ جنہیں پروان چڑھا کر وحدت انسانی اور وحدت ادیان کا عظیم مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (الشوریٰ:13)

ترجمہ: آپ کے لئے دین کی وہی راہ ڈالی، جس کا اس نے نوح کو حکم دیا، اور جو

کچھ ہم نے آپ کی طرف وحی کیا' اور ہم نے جس کا حکم ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا' کہ آپ سب دین کو قائم رکھیں اور اس میں پھوٹ نہ ڈالیں۔

جدید دور کے بین المذاہب مکالمے کی مشروعیت کے باب میں اس آیت مبارکہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے' کیونکہ یہ آیت اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء اور رسولوں کو مختلف ادوار میں مبعوث کیا۔ ان کے مخاطبین بھی الگ الگ تھے' ان کی زبانیں اور عادات بھی جداگانہ تھیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی جانب الگ الگ کتابیں نازل کیں' لیکن ان سب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی پیغام دیا۔

اس آیت مبارکہ میں ﴿وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ﴾ بہت اہم ہے کیونکہ اس میں ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو پیغام حضرت نوح علیہ السلام کو دیا تھا' وہی پیغام حق حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو دیا گیا اور اسی روح پرور پیغام سے خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نوازا گیا۔ چنانچہ عصری مکالمے کا ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ مشترک پیغام تلاش کیا جائے تاکہ انسانیت کو اس کا پابند بنایا جائے۔

﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ اس آیت مبارکہ میں دوسرا اہم جز ہے جو وحدت ادیان کا پیغام دیتا ہے کہ ایک حدیث کی روشنی میں گمراہی کے ستر سے زیادہ راستے ہیں جبکہ صراط مستقیم ایک ہی ہے اس لئے دین میں تفرقہ نہ ڈالنے کا منشاء یہ ہے کہ انسان گمراہی کے تمام راستے ترک کر کے واحد صراط مستقیم کو اپنائے۔ واضح رہے کہ ایسا کرنا تبھی ممکن ہوگا جب باہمی افہام و تفہیم بحث و تمحیص اور مکالمے کے ذریعے تمام ادیان و مذاہب یہ طے کرلیں کہ صراط مستقیم کیا ہے؟ اور سب انسان اس کی کس طرح پابندی کر سکتے ہیں۔

قرآن حکیم کا مطالعہ بین المذاہب مکالمے کے لئے مزید کئی دلائل سے آگاہ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں انسانوں کو بہت سے مذہبی رویوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جو

آج کے انسانی مذاہب کا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ چاند و سورج کی پوجا' آتش پرستی' کئی کئی خداؤں کے پیرو مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح دو خداؤں' یزدان اور ہرمن کے پیرو مجوسیوں کا بھی سورۃ الحج میں ذکر ہے' عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث بھی سورۃ المائدہ میں مذکور نیز یہودیوں اور عیسائیوں کے اس مشترکہ عقیدے کا بھی قرآن حکیم نے سورہ توبہ میں حوالہ دیا ہے کہ یہودی حضرت عزیر کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔

دیگر مذاہب کے ان رویوں اور عقائد کا ذکر کرنے کے ساتھ قرآن حکیم نے دیگر مذاہب کے لئے ایک اصطلاح ''اہل الکتاب'' بھی استعمال کی ہے۔ جو اس امر کی عکاس ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اہل کتاب سے مکالمہ کریں چنانچہ سورۃ النساء میں ہے:

﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾(النساء:171)

ترجمہ: اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حق کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

اہل کتاب کے رویوں اور عقیدوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم نے صراط مستقیم کی بھی نشان دہی کی ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ سب مذاہب کے ماننے والوں کے مادی مسائل کے حل سے زیادہ روحانی اور عقائدی مسائل کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ مکالمہ بین المذاہب مادی اور روحانی دو طرح کے مسائل کا احاطہ کرے اور اس کا آغاز انسان کے روحانی مسائل سے ہونا چاہئے کیونکہ روح انسان کی اصل اور جسم صرف روح کا مرکز ہے اور روحانی موضوعات میں بین المذاہب مکالمے کا آغاز اس حقیقت ثابتہ سے ہونا چاہئے جو سورۃ آل عمران میں مذکور ہے:

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

﴿اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ، وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا، وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:63)

ترجمہ: آپ فرما دیجئے! اے اہل کتاب! ایسے کلمہ کی طرف آیئے جو ہمارے اور آپ کے مابین یکساں ہے، یہ کہ اللہ کے علاوہ ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں، اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور نہ ایک دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ آیت بھی بین المذاہب مکالمے کی اساس فراہم کرتی ہے کہ تمام مذاہب میں عموماً اور الہامی مذاہب میں خصوصاً ایک حتمی حقیقت کا عقیدہ موجود ہے۔ نیز عالمی مذاہب میں ایک ایسا عقیدہ بھی موجود ہے' جسے مشترک عقیدے کی حیثیت حاصل ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے' جس سے بہت سے دیگر مسائل حیات کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کے لئے جہت متعین ہوتی ہے۔ اس لئے یہ آیت مکالمے کی اساس فراہم کر سکتی ہے۔

عقیدہ توحید کے ساتھ ساتھ عقیدۂ رسالت کو بھی بین المذاہب مکالمے کی دوسری اساس بنایا جا سکتا ہے، کیونکہ دنیا کے تمام مذاہب میں ایک بانی، روحانی قائد ایک پیغمبر اور ایک نجات دہندہ کا تصور موجود ہے، الہامی اور غیر الہامی مذاہب اس تصور کے علمبردار ہیں۔ لیکن قرآن حکیم اس سلسلے میں بہت دقیق انداز میں اشارہ کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ف علیہ السلام کی بعثت کا تو مقصد ہی یہی تھا کہ وہ یہودیت کے اس دعوے کو باطل قرار دیں کہ وہی اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور انہیں کا دین آخری دین ہے بلکہ وہ یہ بتائیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آخری نبی کی بعثت ہوگی۔ جس کا نام احمد ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے قرآن حکیم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور منصب کا بیان کرتا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ (آل عمران:81)

ترجمہ: اور یاد کرو، جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ میں آپ کو کتاب اور حکمت دوں گا، پھر تمہارے پاس وہ عظیم رسول آئے، جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرے تب تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔

اس قرآنی آیت کا یہ حصہ ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ اس وجہ سے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہ تمام نبیوں کو تاکیداً حکم دیتا ہے کہ وہ سب خاتم الانبیاء پر ایمان لائیں اور وحدت ادیان کے تناظر میں ان کی اعانت بھی کریں۔ اس لئے بین المذاہب مکالمے میں کسی بھی ہادی اور رہنما کو تسلیم کرنا مکالمے کی دوسری بنیاد بن سکتا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ بات کہی جائے کہ ابدی اور حتمی حقیقت تو سب مذاہب کی مشترکہ میراث ہے جبکہ انبیاء قائدین اور نجات دہندہ ہر مذہب کا مختلف ہے۔ اس لئے یہ عقیدہ یا تصور مکالمے کی بنیاد کیسے بن سکتا ہے؟ تو اس کا سادہ حاصل یہ ہوگا کہ جزوی قائد یا نبی کا تصور تو ہر مذہب میں پایا جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو انسانیت کا پیغامبر قرار دیا ہے، چنانچہ سورۃ الاعراف میں ہے:

﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾ (سورۃ الاعراف:58)

ترجمہ: آپ فرما دیجئے! اے انسانو! میں ف آپ سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

رسالت کا یہ انسانی اور عمومی مفہوم اس امر کی نشان دہی کرتا ہے، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت تمام انسانوں کے لئے ہے اس لئے اس نظریے یا عقیدے کو انسانیت کی سطح پر لے جا کر بین المذاہب مکالمے کا موضوع بنایا جائے تو مکالمہ کا عمدہ آغاز ہو سکتا ہے۔

ہماری رائے میں حتمی حقیقت اور انسانی رسائی دو ایسے موضوعات ہیں، جو ایک

طرف تو بین المذاہب مکالمے کو مشروعیت (Legality) عطا کرتے ہیں، اور دوسری طرف یہی دونوں موضوعات مکالمے کی اساس بھی بن سکتے ہیں۔ ان دونوں امور کی کوکھ سے دیگر انسانی مسائل کا حل وابستہ ہے۔ کیونکہ اگر ان دونوں حقیقتوں پر بین المذاہب مکالمہ کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے، تو انسانیت بجا طور پر اس مکالمے کا اطلاق دیگر پیچیدہ اور دقیق انسانی مسائل پر کر سکتی ہے۔ ورنہ یہ ساری مشقت اور کوشش بے سود ہوگی۔

بین المذاہب مکالمے کے حوالے سے فکری عملی اور طریق کار کی دشواریوں اور پیچیدگیوں کے باوجود ہم نے مذکورہ سطور میں جدید مکالمے کے جواز، اس کی مشروعیت اور اس کی اساس کے نمایاں پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ بین المذاہب مکالمے کی موجودہ ناقابل عمل اور ناقابل اعتماد صورتِ حال کو مثبت انداز میں بہتر کیا جا سکے۔

بین المذاہب مکالمے کا غالباً سب سے حساس پہلو یہ ہے کہ اس وقت عالمی مذاہب کے مابین ہم آہنگی اور افہام و تفہیم کی بجائے، باہمی دشمنی، شکوک و شبہات اور ایک دوسرے پر عدم اعتماد کی فضا قائم ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں عموماً اور دنیا کے دو عظیم مذاہب اسلام اور عیسائیت میں بالخصوص باہمی مسابقت کا نظام بھی رائج ہے۔ اس لئے عالمی مذاہب کو حقیقی مکالمے کی میز پر لانا اور اس مکالمے سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنا بہت دشوار عمل ہے اس لئے مکالمہ شروع کرنے سے قبل منہجی، عملی اور طریق کار کی ضرورت جیسے امور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے جو کسی نتائج خیز مکالمے کی ضمانت فراہم کر سکیں:۔

1۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات یہ ہے، کہ تمام مذاہب کو الگ الگ ایک اکائی کے طور پر تسلیم کیا جائے، اس کے چھوٹے بڑے ہونے، نسلی یا علاقائی ہونے کی بجائے اس امر پر توجہ مرکوز کی جائے کہ کیا وہ مذہب، کسی مذہب کے وجود میں آنے کے ضروری عناصر رکھتا ہے؟ کیا اس کے ہاں کا کوئی ایسا نظام ہے جو انسان کی روحانی اور مادی مشکلات کا قابل عمل حل پیش کر

سکے۔ ان اوصاف سے متصف مذہب کو مکالمہ میں شریک کیا جائے۔

2۔ تمام مذاہب اور ان کے پیروکار احترام آدمیت (Dignity of Man) کے جذبے سے سرشار ہوں، ان میں مساوات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے برتر یا افضل و اعلیٰ نہیں ہے تا آنکہ وہ اپنے اعمال' افعال اور اقوال کے ذریعے سے اپنے کو اس مرتبہ نہ گرا لے۔

3۔ ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (اپنے رب کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلاؤ) پر عمل کرتے ہوئے مناظرہ اور جدل کا طریق کار نہ اختیار کیا جائے۔ تمام مذاہب اور ان کے نمائندے باہمی افہام و تفہیم کا انداز اختیار کریں۔ ہر شخص اپنی بات مہذب اور شائستہ انداز میں بیان کرے اور دوسرے اس کی رائے کو پوری توجہ سے سنیں اور اس کی رائے کو ایک عاقل بالغ انسان کی رائے قرار دیتے ہوئے اس رائے کا احترام کریں۔ نہ اس مذہب کا تمسخر اُڑائیں' نہ اس کے پیروکاروں کو حقیر جانیں اور اس مذہب کے نکتہ نظر کو حقیر نہ سمجھیں بلکہ اس پر مطلوبہ توجہ دیں۔

4۔ جب مختلف المذاہب اور مختلف الآراء افراد باہم گفتگو کرتے اور مذہب جیسے دقیق، حساس اور انتہائی نازک معاملہ زیر بحث لاتے ہیں' تو جذبات کا ابھرنا' اختلافات کا پیدا ہونا' متضاد آراء کا پیش کیا جانا اور متنوع آراء میں درجہ بندی کا اطلاق' ایسے طبعی امور ہیں' جن سے مفر نہیں۔ اس لئے قرآن حکیم کی زبان میں ضروری ہے ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل 124) کہ باہم مکالمے کا بہترین طریق کار اختیار کیا جائے۔ کہ ہر کسی کو اپنی بات کہنے اور رائے کے اظہار کا پورا پورا موقع

ہے۔ نہ کوئی کسی کی بات کاٹے نہ دخل اندازی کرے اور نہ ہی کسی کو خاص رائے اپنانے پر مجبور کیا جائے' چنانچہ ہر شخص اپنی رائے کا مکمل اظہار کرے اور دوسروں کی آراء اطمینان اور تسلی سے سنے اور ان پر غور کرتا رہے۔

5- بین المذاہب مکالمے کو پیش کرنے کے لئے قرآن حکیم نے ایک اور سنہری اصول ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (البقرہ:111) "اگر آپ سچے ہیں تو دلیل پیش کیجئے"۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ بین المذاہب مکالمے میں کوئی دعویٰ، کوئی امر، کوئی بات اور کوئی قول بلا دلیل پیش نہیں کیا جائے۔ چنانچہ شرکاء مکالمہ کسی بھی موضوع، رائے یا حکم کے ایجابی یا سلبی پہلو کو زیر بحث لاتے ہوئے صرف اپنی یا کسی اور کی رائے کا اظہار نہیں کریں گے۔ بلکہ کسی موضوع کے حق میں یا خلاف بات کرتے وقت دلائل سے بات کی جائے گی اور دلائل ہی کسی رائے کے قبول یا رد کرنے کا معیار قرار پائیں۔ یہ امر بھی واضح رہے کہ ایسے مکالمے میں نقلی، عقلی، تکوینی، سائنسی اور فنی ہر طرح کے دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جو موضوع کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر محیط ہوں۔

6- مکالمے کے حوالے سے قرآن حکیم کے اس اصول کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ ﴿فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الانبیاء:7) "اے لوگو! اگر آپ کو کسی چیز کا علم نہیں تو آپ اہل علم سے پوچھیں"۔ اس قرآنی آیت میں مکالمے کا یہ اصول بیان ہوا ہے۔ کہ مذہب جیسے عالمی اور انسانی موضوع پر ہر انسان لب کشائی نہیں کر سکتا۔ اس لئے تخصص کے اس دور میں مذہبی مکالمے میں اپنے اپنے مذہب

کے ماہرین شریک ہوں، جو نہ صرف اپنے مذہب پر پورا پورا عبور رکھتے ہوں بلکہ مذاہب عالم کی تعلیمات، شعائر، تقالید اور عملیات (Practices) سے بھی کماحقہ آگاہ ہوں۔ ہمارے رائے میں بین المذاہب مکالمے کو مفید اور کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے مکالمے کے شرکاء تقابل ادیان، جدید مذہبی رجحانات، انسانی معاشروں میں مذہب کی مقبولیت اور انسان کی عصر مشکلات سے بخوبی، آگاہ ہوں اور ان کی ذہنی اور فکری سطح اس قدر بلند ہو کہ وہ ہر طرح دلائل اور براہین کو صحیح معنوں میں سمجھ کر انہیں اپنا سکیں اور ان پر اپنے مثبت یا منفی ردعمل کا اظہار کر سکیں۔

7- بین المذاہب مکالمہ میں افراد، جماعتیں اور گروہ سبھی شریک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسا عملی مظاہرہ ہے۔ جس میں حق اور صداقت ثابت کرنے کیلئے تمام انسانی صلاحیتیں اور مہارتیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ قرآن حکیم اس حقیقت اور انسانی ضرورت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ وہ خود انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا﴾ (سبا:46) کہ ”آپ فرمایئے کہ میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ آپ اللہ کے لئے دو دو اور ایک ایک ہو کر کھڑے ہوں اور آپ غور و فکر کریں“۔ گویا مذہبی مکالمات کی انفرادی اور اجتماعی انداز میں تیاری کی جائے اور اس تیاری میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہ کیا جائے نیز مکالمے میں انفرادی اور اجتماعی طور پر شرکت کی جائے، تا کہ حقیقت کی جستجو میں تمام وسائل استعمال ہوں۔

8- ایک اور انسانی قاعدے کو مذاکرات میں رد و قبول کا معیار بنایا جائے۔ چنانچہ عربی زبان میں کہا جاتا ہے ”خذ ما صفی ودع ما کدر“ کہ جو کچھ

صاف ستھرا ہے وہ اپنا لیا جائے اور جو کچھ گدلا اور میلا ہے، اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس انسانی اصول کا مفہوم یہ ہے کہ مکالمات مشترکہ میں انسانی سعادت، نجات، ترقی، راحت، آرام اور خدمت کو معیار بنایا جائے اور جب بہت سے مذاہب اپنی اپنی آراء کا اظہار کریں تو ایسی آراء قبول کی جائیں جو خالق کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسانی خدمت پر مبنی ہوں اور دیگر تمام آراء کو ترک کر دیا جائے یا زیر غور رکھا جائے اور بوقت ضرورت استعمال میں لایا جائے ایسا کرتے وقت تمام مذاہب کو مساوی موقع اور مرتبہ دیا جائے اور کسی بھی رائے کو اس لئے' قبول نہ کیا جائے کہ وہ کسی بڑے مذہب نے پیش کی ہے یا کسی نظریے کو اس بنیاد پر ترک نہ کر دیا جائے کہ وہ کسی چھوٹے مذہب کی طرف سے سامنے آیا۔ بلکہ کسی رائے یا عقیدے یا نظریے کے ردّ یا قبول کا معیار اطاعتِ خالق اور خدمتِ خلق ہونا چاہیے۔

9- مذہب کے ساتھ جذباتیت اور عقیدت کا گہرا رشتہ ہے اور مذہب سے وابستگی ایسے عقائد کو جنم دیتی ہے جن کی وجہ سے حقائق دھندلے ہو جاتے ہیں اور ایسے نتائج مہیا کرتے ہیں جو پہلے سے سوچے سمجھے افکار (Pre-supposed ideas) پر مبنی ہوتے ہیں' جو تحقیق کے بنیادی تصور اور حق کی تلاش میں حائل ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ مذہبی جذبات' مذہبی تعصبات' مذہبی انتہاء پسندی اور مذہبی جنونیت سے خالی ہو کر حقائق کی تلاش پیش نظر رکھتے ہوئے بین المذاہب مکالمے میں شرکت کی جائے' تاکہ مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکیں۔ ورنہ مذکورہ بالا نفسیاتی امراض مکالمے پر منفی اثرات مرتب کریں گے۔

10- دنیا کے بڑے مذاہب ہندومت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں

اصلاحی تحاریک پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی رہی ہیں' جن کے عقائد' آراء اور افکار میں مغایرت اور تضاد جیسے پہلو سامنے آتے رہے ہیں اور ایک ہی مذہب کے دو فرقے باہم متضاد آراء رکھتے ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں نے علم ''مناظرہ'' ایجاد کر رکھا ہے۔ اس کے اصول و مبادی مقرر کر رکھے ہیں اور جرح و تعدیل کا ایک وسیع اور مؤثر نظام بھی مسلمانوں میں مروج ہے۔ اگر ایسے اصول و ضوابط دیگر مذاہب' ان کی اصلاحی تحاریک یا ان کے فکری نظام میں موجود ہوں تو بین المذاہب مکالمہ میں ان سے استفادہ بھی مفید ہوگا اور اس طرح ان کی مقدس کتب بھی مکالمے کے لئے راہ کھلا کر سکتی ہیں۔ جن کا مطالعہ مکالمہ فہمی میں مدد و معاون ہوگا۔

مذکورہ بالا تحریر ایسے اجزاء پر مشتمل ہے جو دینی مکالمے کی تاریخ' عصر حاضر میں بین المذاہب مکالمے کی مشکلات' مسلمانوں کے ہاں جدید مکالمے کے جواز اور بین المذاہب مکالمے کے اصول و ضوابط پر مبنی ہیں۔ جنہیں بیان کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ عصری مذاہب کے مابین افہام و تفہیم کو فروغ دیا جائے۔ ان مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ مذاہب کے مابین تعصبات اور انتہاء پسندی کو کم کیا جائے اور انسانوں میں تبادلہ افکار کو فروغ دیا جائے تاکہ انسانوں میں باہمی محبت، مروت، انسیت اور تعاون کو فروغ دیا جا سکے۔

اس مقالے کی تیاری میں قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کے ساتھ ساتھ درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا۔ یہ کتب زیر نظر موضوع پر مزید معلومات فراہم کرتی ہیں۔ جن سے محققین کرام مزید استفادہ کر سکتے ہیں:-

مصادر و مراجع

1-الکتاب العربی، محمود الرمیحی (رئیس التحریر) 10 اپریل 1995ء مجلۃ العربی کویت۔

2- طریقۃ الخلاف بین الاسلاف، سمرقندی، محمد بن عبدالحمید دار الکتب العلمیہ لبنان 1992ء۔

3- المناظرۃ بین الاسلام والنصرانیہ ریاض 1413ھ

4- عبدالحی لکھنوی۔ آداب البحث والمناظرۃ، مطبع الجتبائی 1303ھ

5- طٰہٰ جاعلوانی، الخلاف فی الفقہ الاسلامی، عالمی ادارہ فکر اسلامی واشنگٹن۔

6-DAVID HUMI, DIALOGUES CONCERNING NATURAL RELIGION, HUFNER PUBLICATIONS LO NEW YORK1963.

7-MARELLA, PAUL CARDINAL, PRESIDENT, GUIDELINES FOR A DIALOGUE BETWEEN MUSLIMS AND CITRISTIANS, RONA EDIZIONI ANCORA NOT DATED.

بین المذاہب مکالمہ
کی ضرورت واہمیت

ڈاکٹر محمد عبداللہ
اسسٹنٹ پروفیسر
ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت واہمیت

ڈاکٹر محمد عبداللہ

زیرِ نظر موضوع کی ضرورت

اسلام نے دیگر اقوام و مذاہب سے تعلقات باہمی کے لیے مکالمہ بین المذاہب کا دروازہ صدرِ اول ہی سے کھلا رکھا ہے اور مسلمانوں کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ ہر دور میں انہوں نے دیگر اقوام و ملل کے ساتھ حسنِ سلوک اور رواداری کا سلوک کیا یہاں تک کہ جنگ کی حالت میں بھی مسلمانوں نے اس طرز عمل کو ترک نہیں کیا تاہم نائن الیون (9/11) کے بعد جب کہ اسلام پر چہار سو اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے اور ببانگِ دہل بعض متعصب ممالک و اقوام کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں پر دہشت گردی، علیحدگی پسندی اور تنگ نظری کی پھبتیاں کسی جا رہی ہیں تو ان حالات میں تو اور بھی تعلقات باہمی کے لیے مکالمہ بین المذاہب کی ضرورت بڑھ جاتی ہے کہ آج کے عالمی تناظر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں اس پہلو کو اجاگر کیا جائے۔

مکالمہ بین المذاہب کیا ہے؟

مکالمہ بین المذاہب (Interfaith Dialogue) کے بارے میں ہمارے بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ یہ مغرب سے درآمد شدہ ایک اصطلاح ہے اور جسے مستشرقین

نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وضع کیا ہے۔اس اصطلاح یا دوسرے لفظوں میں اس طریقے کے ذریعے مغرب یا مستشرقین اپنے افکار و نظریات مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔اس سے ان کا مقصود برابری کی سطح پر تبادلہ خیال یا غلط فہمیاں دور کرنا نہیں ہے بلکہ اسلام اور مسلمانوں میں مزید شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے لہذا مسلمانوں کو مغرب یا مسیحیت کے اس جھانسے میں نہیں آنا چاہیے۔اسی طرح بعض مفکرین کے خیال میں ہر دور میں " مکالمہ بین المذاہب " کے مقاصد مغرب یا مستشرقین کے نزدیک مختلف رہے ہیں۔ان تمام نقطہ ہائے نظر سے اختلاف یا اتفاق کیا جاسکتا ہے۔تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے ساتھ مکالمہ اور بات چیت (Interaction) چاہتا ہے کیا ہم اس اصطلاح کے ذریعے اسلام کے پیغام کو دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے۔قرآن حکیم نے ان الفاظ کے ساتھ دیگر ادیان و مذاہب کو بالعموم اور اہل کتاب کو بالخصوص ''کلمہ سواء'' کی دعوت دی ہے' وہ کیا ہے؟

ہمارے خیال میں دیگر مذاہب و نظریات کے حامل افراد کو مشترکہ کلمہ کی دعوت ہی مکالمہ بین المذاہب ہے۔گویا ایسا پلیٹ فارم جس کے ذریعے دیگر مذاہب و نظریات کے حامل افراد سے تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ان سے رابطہ (Interaction) کیا جاسکے۔وسیع تر مفہوم میں یہ مکالمہ بین التہذیب (Inter Civilization Dialogue) بھی ہو سکتا ہے۔اسلام کی دعوت و تعلیمات ان لوگوں تک پہنچانا۔مزید برآں جو غلط فہمیاں محض جہالت، بے خبری اور تعصب کے نتیجے میں پیدا ہوسکتی ہیں' وہ اس قربت، ربط (Intraction) اور مکالمہ کے ذریعے دور کی جاسکتی ہیں۔اسلام ایک عالمگیر دین ہے' اس کی دعوت اور پیغام پوری دنیا کے لئے اور قیامت تک کے انسانوں کے لئے ہے۔وہ کسی طرح بھی اقوام عالم سے کٹ نہیں سکتا بلکہ وہ ان کے ساتھ محبت، رواداری اور عمدہ اخلاق کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔وہ دشمن کے دل کو بھی محبت کے ذریعے جیتنا چاہتا ہے

جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے۔

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَأَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ (حٰمٓ السجدہ:34)

''اور نہیں یکساں ہوسکتی نیکی اور نہ بدی۔ دفع کرو (برائی کو) ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو پھر تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی گویا کہ وہ جگری دوست بن گیا ہے''۔

تعلقاتِ باہمی کے لئے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ زندگی کے ہر پہلو کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:21)

''یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات ہی بہترین نمونہ ہے''۔

انسانی معاشرہ و تمدن، ترقی کی جن منازل تک پہنچ جائے اور جس قسم کے مسائل سے دوچار ہو، ہمارا یہ ایمان و یقین ہے کہ بحضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی رہنمائی کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ہم دیکھنا یہ چاہیں گے کہ تعلقات باہمی کے لیے آج کی صورتِ حال میں سیرتِ طیبہ ہماری کس طرح رہنمائی کرتی ہے۔

جیسا کہ قارئینِ کرام اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ سرورِ کائنات علیہ التحیہ والصلوات کی حیاتِ طیبہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک مکی دور، دوسرا مدنی دور۔ ہر دور کے حوالے سے آپ کے طرزِ عمل کے چند پہلو موضوع کی مناسبت سے اصحابِ فکر کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

مکی دور کا سب سے پہلا نمونہ تو وہ ماحول ہے جس میں آپ نے آنکھ کھولی۔ پورا نظام کفر، شرک اور گمراہی پر مبنی ہے۔ بالعموم اس دور کو ہمارے سیرت نگار'' زمانہ

جاہلیت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ کفر و شرک پر مبنی اس معاشرت اور تمدن میں آپ نے سماجی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ خیر و فلاح کے جو کام اس معاشرہ میں ممکن ہو سکتے تھے' ایک مفید شہری کی حیثیت سے سرانجام دیئے' خواہ وہ حلف الفضول میں شرکت ہو یا حرب فجار میں۔ حجر اسود کی تنصیب میں ثالثی کا کردار ہو یا شام و یمن میں تجارت کا معاملہ۔ آپ نے سماجی زندگی سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ اسی معاشرہ میں انہی لوگوں نے آپ کے پاکیزہ کردار اور حسن معاملہ ہی کی بدولت صادق وامین کے لقب سے نوازا۔ مکی زندگی کے اسی دور میں پیغامِ حق کی تبلیغ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ آپ کفر و شرک اور جاہلیت پر مبنی اسی معاشرہ میں اعلانِ حق فرماتے ہیں۔ وہی معاشرہ' وہی لوگ' جنہوں نے آپ کی پاکیزہ زندگی اور عمدہ اخلاق کی وجہ سے صادق وامین کا خطاب دیا تھا' یکسر مخالف ہو جاتے ہیں۔ استہزاء، تحقیر، تکذیب اور تعذیب کا وہ کون سا ہتھیار تھا جو آپ کے خلاف استعمال نہ کیا گیا۔ مگر آپ پیغامِ حق کے لئے مکہ کے گلی کوچوں میں گئے۔ قبائل کے پاس بھی گئے۔ طائف کی سنگلاخ وادیوں میں بھی پیغام حق سنایا۔ شعب ابی طالب کی صورت میں معاشرتی مقاطعہ کا سامنا بھی کیا۔ مکہ کی گلیاں اور در و دیوار آپ کے لیے اجنبی ٹھہرے' جہاں آپ کی زندگی کے ماہ و سال بسر ہوئے تھے۔

حالات جس قدر بھی سنگین ہوئے' ایک تو شفیع امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصادم اور ٹکراؤ کی راہ اختیار نہیں کی اور کُفُّوْآ اَیْدِیَکُمْ کے مصداق اہل ایمان کو بھی اسی طرزِ عمل کا سبق دیا۔ دوسرا آپ معاشرے سے کٹے نہیں۔ مکالمہ کے لئے قربت اور باہمی روابط کا ہونا ازحد ضروری ہے۔

آج کے عالمی حالات پر ہم اگر نظر ڈالیں تو اہل مکہ کے رویہ کے حامل کئی ملک دنیا میں نظر آئیں گے۔ یہاں پر ہمیں آپ کا مکی اسوۂ حسنہ مدنظر رکھنا چاہیے۔ مکالمہ اور دعوت اسلام کی حکمت عملی اس عمل کا تقاضا کرتی ہے کہ ان ممالک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اور اہل ایمان کا سا طرز عمل اختیار کریں۔ خفیہ حکمت عملی کو اپنائیں۔ ہم ٹکراؤ اور تصادم کی پالیسی اختیار نہ کریں اور نہ ایسے ممالک اور معاشرہ سے لاتعلقی اختیار کریں بلکہ اصلاح اور مکالمہ کی مسلسل کوشش کریں۔

مکی زندگی کا ایک اور نمونہ ہمارے سامنے ہے اور اس میں بڑے دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم براہ راست تو اس میں شامل نہ تھے لیکن آپ ہی کی ہدایت پر سب کچھ ہوا۔

مکہ کی سرزمین جب اہل ایمان کے لئے تنگ پڑ گئی اور تعذیب و تشدد حد سے بڑھ گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل ایمان کو ''سلامتی کی سرزمین'' حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔ حالانکہ آپ خوب جانتے تھے کہ وہ ایک مسیحی ریاست ہے۔ حبشہ کا حاکم نجاشی اپنی نیک نامی اور انصاف پسندی کی خوب شہرت رکھتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنے چچازاد سیدنا جعفر طیار کو ایک مختصر عریضہ دے کر نجاشی کے پاس بھیجا۔ اس میں تحریر تھا کہ میں اپنے چچازاد جعفر کو آپ کے پاس روانہ کر رہا ہوں۔ ان کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ہے۔ جب یہ آپ کے پاس آئیں تو ان کی توقیر کیجئے اور ان پر جبر نہ کیجئے''۔ اس تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے کہ کس طرح قریش نے اہل ایمان کی ایک مختصر جماعت کا تعاقب کیا اور کس طرح کامیاب سفارت کاری کے ذریعے نجاشی کے دربار میں پہنچے۔ نجاشی نے فریقین کا موقف پوری توجہ سے سنا اور ٹھنڈے دماغ سے اس پر غور کیا اور پھر یہ فیصلہ صادر کیا: جاؤ تم لوگ میری سلطنت میں مامون و محفوظ ہو' جو کوئی تمہیں تنگ کرے گا' اس پر جرمانہ ہوگا۔

سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق مسلمانوں کی یہ جماعت نبوت کے پانچویں سال حبشہ میں آئی۔ ان مہاجرین میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ سیرت نگاروں کے مطابق مہاجرین حبشہ کا آخری قافلہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قیادت میں یوم خیبر

7ہجری میں مدینہ منورہ پہنچا۔

یہ مسلمان حبشہ میں کم و بیش تیرہ برس تک رہے۔ نجاشی کی طرف سے انہیں عقیدے اور عبادت کی مکمل آزادی تھی۔ انہوں نے وہاں کے ماحول میں معاشرتی زندگی میں بھرپور حصہ لیا۔ ایمان کی شمع، جس بھی دل میں ہو، ماحول کو اپنی روشنی سے ضرور منور کرے گی۔ لیکن ان کے طرز عمل کی (مسیحی) ریاست کو کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ مقامی باشندوں نے کوئی شکایت کی۔ ان مسلمانوں نے وہاں کے قوانین اور ضوابط کی کس حد تک پابندی کی۔ نجاشی کی طرف سے کیا خصوصی مراعات حاصل تھیں اور سب سے بڑھ کر ایک غالب تہذیب (Dominent Culture) اور معاشرت میں ان مسلمانوں نے اپنے تشخص کو کس طرح محفوظ رکھا۔ نجاشی کے اس طرز عمل اور عمدہ برتاؤ کے پیش نظر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے کیا دعائیں کی۔ اور جب ایک مرتبہ حبشہ کی سلامتی کو خطرہ ہوا تو کس طرح مسلمانوں نے نجاشی کا ساتھ دیا۔

بین المذاہب تعلقات کے ضمن میں ہجرت حبشہ کا تحقیقی مطالعہ آج کے دور میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یقیناً آج کی دنیا پر ہم نظر دوڑائیں تو ایک دو نہیں بہت سے ایسے ممالک نظر آئیں گے جہاں کے عوام مسلمانوں کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں بلکہ بعض حکمران بھی اپنے جذبات میں وہ شدت نہیں رکھتے۔ ایسے ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ نجاشی اور حبشہ کے حالات کو پیش نظر رکھیں اور دعوت اور مکالمہ کے لئے ایسی زرخیز زمین کو اپنے لئے غنیمت سمجھیں اور تعلقات باہمی کو فروغ دیں۔

مکی دور کے ان دو نمونوں کی طرح مدنی دور کے دو نمونے بھی پیش خدمت ہیں۔

مدینہ منورہ میں اگرچہ حالات مکہ مکرمہ کی نسبت مختلف تھے۔ یہاں پر آپ کی آمد سے پہلے اسلام کی آبیاری ہو چکی تھی اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یہاں موجود تھی، جنہوں نے نہ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منورہ آنے کی دعوت دی بلکہ نصرت وحمایت

کا بھرپور یقین دلایا تاہم مدینہ منورہ کی ساخت ملی جلی ثقافت والے معاشرے (Multicultural Society) پر مبنی تھی۔ اوس اور خزرج کے علاوہ یہودی قبائل یہاں کا بااثر طبقہ تھا۔ چنانچہ کئی ایک مسائل کا یہاں بھی سامنا تھا۔ مہاجرین کی آباد کاری بھی مقصود تھی۔ اسلام کی اشاعت کے لیے امن و امان کا قیام بھی ناگزیر تھا۔ اسلام جو ابھی تک اعتقادی و فکری سطح پر تھا اس کو بھی ایک نظام کی شکل میں لانا مقصود تھا۔ چنانچہ ہجرت کے دوسرے ہی سال شفیع امم رحمتِ ہر عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں کے باشندوں کے ساتھ تعلقات باہمی کے لیے ایک معاہدہ کیا جسے میثاق مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس میثاق کو دنیا کا پہلا تحریری دستور بتایا ہے۔ چنانچہ اس معاہدہ میں جہاں قبائل یہود کو داخلی خود مختاری دی گئی وہیں قدیم رسوم و رواج کو برقرار رکھا گیا۔ عصبیت سے بڑھ کر بیرونی (باہر کے دشمن کے لیے) مدینہ منورہ کے دفاع کو یقینی بنایا گیا اور فریقین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیادت و قیادت کو قبول کر کے ایک مرکزیت کی بنیاد رکھ دی۔ یہ ایک طرح کا مقامی سطح کا معاہدہ تھا۔ میثاقِ مدینہ بین المذاہب تعلقات کے لئے ایسی دستاویز ہے جو آج بھی Multi Cultural Society یا Multi-Religion Society میں رہنما کا کام دے سکتی ہے۔

مدنی زندگی کا دوسرا دور وہ ہے جس میں مقامی سطح سے بلند ہو کر قومی و بین الاقوامی سطح پر معاہدات اور اسلامی کا کام ہوا۔

وہی مشرکین مکہ جو نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے اور جنہوں نے آپ کو مکہ مکرمہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا ان کے ساتھ بھی حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک معاہدہ فرمایا جسے صلح حدیبیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یاد رہے جب بھی آپ کو امن اور جنگ دونوں میں کسی ایک کو اختیار کرنے کا موقع ملا تو آپ نے ہمیشہ امن کو ترجیح دی۔ یہ معاہدہ ایک وسیع البنیاد معاہدہ (Broad Based Treaty)

تھا۔اس معاہدہ میں کم از کم پورے عرب کی حد تک' دس سالہ جنگ بندی کے ذریعے امن وامان کو یقینی بنا دیا گیا۔ اگرچہ اس میں ایسی شرائط بھی تسلیم کرنا پڑیں جو بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں تاہم قرآن حکیم نے اس کو فتح مبین کہہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی الہامی بصیرت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ امن وامان بحال ہو گیا۔ تجارتی سرگرمیاں خوب پروان چڑھیں۔ اگلے سال سے حرم کے دروازے مسلمانوں پر کھل گئے۔ اس معاہدہ کا سب سے روشن پہلو' مشرکین مکہ سے باہمی تعلقات ہیں' جو استوار ہوئے۔ اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ تھی کہ جو شخص مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جائے گا وہ واپس نہ کیا جائے گا۔ اس سے جو سماجی و تجارتی روابط بڑھے' تو اپنی جگہ 6 ہجری سے 8 ہجری تک صرف تین سال کے قلیل عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ بڑی بڑی شخصیات نے اسلام قبول کر لیا۔ آج کی دنیا میں مکالمہ کا یہ پہلو نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

صلح حدیبیہ کے وسیع تر اثرات کے نتیجے میں جب امن وامان بحال ہو گیا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عالمی سطح پر مکالمہ اور دعوت کا آغاز کیا اور عالمی فرماں رواؤں کو دعوتی خطوط تحریر کیے۔ یہ خطوط بین المذاہب مکالمہ کا ایک اہم ذریعہ تھے۔ ان خطوط کے ساتھ ایسے سفراء روانہ کیے جو وہاں کے حالات، زبان، رسم ورواج اور جغرافیہ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے چند مشترکہ نکات ہمارے سامنے آتے ہیں جو آج بھی مکالمہ بین المذاہب کی بنیاد بن سکتے ہیں:

1- سبھی فرماں رواؤں کو ان الفاظ کے ساتھ سلام تحریر کیا:

﴿سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى﴾

2- اکثر مکتوبات میں یہ جوامع الکلم تحریر کیے: اسلم تسلم۔

3- ہر مکتوب میں ان الفاظ کے ساتھ ترغیب فرمائی:

يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ.

4- ہر مکتوب میں ان الفاظ کے ساتھ تنبیہ فرمائی۔ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْقِبْطِ/اَلْمَجُوْسُ

5- ہر مکتوب میں قرآن حکیم کا انتخاب' مخاطب اور مدعو کی نفسیات اور حالات کے مطابق کیا۔ مثلاً سورۃ آل عمران کی آیت:

ہم دیکھتے ہیں کہ بین الاقوامی سطح پر اس مکالمہ کے نتیجے میں تین رویے سامنے آئے:

1- بعض فرماں رواؤں نے اسلام قبول کرلیا۔ اطاعت اختیار کرلی۔

2- بعض فرماں رواؤں نے اطاعت تو اختیار نہ کی لیکن دل جوئی اور نرمی کا رویہ اختیار کیا۔ اچھے الفاظ میں جواب دیا۔ تحفے تحائف بھی دیئے۔

3- بعض بدبخت ایسے بھی تھے جنہوں نے مکتوب گرامی کو چاک کیا اور نازیبا کلمات کہے۔

اہل علم کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اسوہ میں بین المذاہب تعلقات کے حوالے سے مکالمے کے کئی پہلو پنہاں ہیں۔ انہیں آج کی دنیا میں دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔ آج کے عالمی حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو کم و بیش ہر جگہ تین قسم کے رویے ہمیں ملیں گے:

1- اہل مکہ مکرمہ کا رویہ۔

2- اہل حبشہ کا رویہ۔

3- اہل مدینہ منورہ کا رویہ۔

وطن عزیز میں تعلقات باہمی کی ضرورت

آج کے حالات میں ہم عالمی سطح اور قومی سطح پر تعلقات باہمی کے لیے مکالمہ بین

المذاہب کی بات کرتے ہیں لیکن جس ملک میں ہم رہتے ہیں یعنی بحمد اللہ یہاں پر ستانوے فیصد (97%) مسلمان آباد ہیں ہم یہاں پر غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے یا اسلام کے قریب کرنے کے لیے بحیثیت مجموعی ہم نے کیا لائحہ عمل اختیار کیا ہے۔ ہمارے گردونواح میں مسیح پورہ، یوحنا آباد، مریم آباد کے ناموں سے جو بستیاں آباد ہیں کبھی ہم نے ان کے مسائل جاننے کی کوشش کی؟ ہمارے دفتروں اور گھروں میں جو لوگ کام کرتے ہیں جو اسلام کی نعمت سے محروم ہیں کبھی ہم نے ان کے بارے میں سوچا ہے۔

[illegible]

[illegible]

1- [illegible]

2- [illegible]

[illegible]

3- [illegible]

[illegible]

[illegible]

1- [illegible]

2- [illegible]

3- [illegible]

[illegible]

[illegible]

مکالمہ بین المسالک

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس
جی سی یونیورسٹی، لاہور

مکالمہ بین المسالک

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

مکالمہ (Dialogue/حوار) کا مذاہب کی تاریخ میں استعمال بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں شروع ہوا۔ جدید ثقافتی اور سیاسی سوچ کے تناظر میں اس کا استعمال عام ہوا۔ ہر زمانہ میں اصطلاحات ایک خاص تاریخ، مابعد الطبیعات افکار اور ثقافت سے نکلتی ہیں۔ ان کا خاص ڈھانچہ اور سانچہ ہوتا ہے۔ "مکالمہ بین المذاہب" (Inter faith dialogue) کی اصطلاح نے بھی کئی تاریخی ادوار دیکھے۔ "اسلام اور مسیحیت کی ہم آہنگی"، "مکالمة بين الاسلام والمسيحية"، "مکالمۂ ادیان"، "ادیانِ ابراہیمی کے درمیان مکالمہ" اور "تہذیبوں کا مکالمہ" جیسی مختلف اصطلاحات سامنے آتی رہی ہیں۔ ان مکالمات کا مقصد اگر تو یہ ثابت کرنا ہے کہ تمام ادیان اللہ تعالیٰ تک رسائی کا ذریعہ ہیں اس لئے تبدیلی مذہب کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں، پھر تو یہ مسلمانوں کے نزدیک اسلام کی حقانیت، اور ختم نبوت کے تقاضوں کے منافی ہے۔ لیکن اگر مقصد روئے زمین پر پُرامن بقائے باہمی کے اصولوں کو قائم کرنا ہے تو "كَلِمَةٍ سَوَآءٍ"[1] کی بنیاد پر یہ ضرور ممکن ہے اور سودمند بھی۔[2]

دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں اس مکالمہ کی حیثیت واہداف کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں ہم آہنگی کو

فروغ دینے کے لئے "مکالمہ بین المسالک" کا اہتمام کیا جاتا۔ اہل اسلام میں فرقوں کی تعداد انتہائی کم ہے۔ مگر باہمی خلا زیادہ ہے۔ نکتہ ہائے اختلاف کی کثرت کے باوجود ہم مکالمہ بین المذاہب کیلئے تو تیار ہیں مگر نکتہ ہائے اشتراک کی کثرت کے ہوتے ہوئے بھی مکالمہ بین المسالک سے خوفزدہ ہیں۔ دوسروں سے مکالمہ کیلئے ہر وقت تیار ہیں مگر اپنوں کے خلاف تلواریں اٹھائی ہوئی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ غلامی میں سوچیں بدل جاتی ہیں یا کمزور قومیں بندگلی میں ہوں تو نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے میں سرگرداں رہتی ہیں۔ مگر ان حالات میں بھی ہماری نجات کا راستہ، مکالمہ بین المسالک ہی تھا۔ آج اس مکالمہ کی ضرورت کہیں زیادہ ہے کیونکہ نظریاتی جنگ کا میدان انتہائی کثیر الاطراف اور پیچیدہ ہو چکا ہے۔ اس مکالمات کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنی کلاسیکل فکری اور روحانی روایات کا تحفظ کر سکے اور نہ ہی جدید صحت مند روایات کا ساتھ دے سکے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی اجتماعی، اقتصادی، سیاسی اور عسکری زندگی کو بھی صدمہ پہنچا ہے۔ ہمارے خیال میں اس مکالمہ کی راہ میں حائل رکاوٹیں درج ذیل ہیں:

(i) خود اپنے اور دیگر مکاتب فکر کے نظریات و افکار سے متعلقہ معلومات کی کمی اور عموماً دوسرے مکاتب فکر کے بنیادی مآخذ تک ہماری رسائی نہیں ہوتی جس کے نتیجہ میں غلط فہمیاں اور شکوک جنم لیتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ہر مکتبہ فکر کی علمی سوچ اور طرز عمل میں تضاد ہوتا ہے۔(3)

(ii) مذہبی جماعتوں کی سیاسی وابستگیاں بھی اس مکالمہ کی راہ میں ایک رکاوٹ ہیں۔

(iii) فروعی مسائل[1] میں تشدد کا رویہ برتا گیا۔ اعتدال و توازن کو چھوڑ دیا گیا اور پھر میڈیا نے رائی کا پہاڑ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ عیسائیوں میں سینکڑوں ایسے جواب ... ایسے اختلافات موجود ہیں مگر ان کے لیے میڈیا بنیاد پرستی اور تشدد پسندی جیسے القابات منسوب نہیں کیے ...

(iv) امت میں سیاسی، فقہی اور اعتقادی بنیادوں پر اختلافات سامنے آئے۔ اعتقادات جیسے اہم ترین مسئلہ پر علماء نے ضروریات دین اور ضروریات مسلک یا دوسرے الفاظ میں قطعی اور ظنی عقائد میں فرق نہ کیا اور نہ ہی عوام الناس کو آگاہ کیا جس وجہ سے عملاً مکالمہ کا کام ترک کیا گیا۔ (4) اس تقسیم کا حاصل یہی ہے کہ کسی مکتب فکر سے خروج کا نتیجہ ضروری نہیں کہ دین سے خروج ہی ہو۔ اس طرح اس تقسیم سے عدم آگاہی ہی مکالمہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

(v) معاشرہ تین عناصر افکار، افراد اور اشیاء سے تشکیل پاتا ہے۔ مکالمہ اسی وقت ممکن ہے جب افراد اور اشیاء کو افکار کے تابع کیا جائے۔ افراد اور اشیاء افکار کے گرد گھومتی ہیں۔ اس طرز زیست میں اختلاف رائے وحدت فکر پر منتج ہوتا ہے نہ کہ مخالفت پر۔ مگر جب افراد بالادست ہوتے ہیں تو مسلکی تعصب عود آتا ہے۔ افکار و اشیاء گروہی مصلحتوں کے تابع ہو جاتے ہیں اور مذہبی تعصب انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہی المیہ ہے، ہمارے اکابرین علماء، پیرزادگان اور خطباء امام ہیں اور فکر اسلامی کی حیثیت ثانوی ہے، حالانکہ اس فکر کی اہمیت بنیادی ہے۔ یہ رکاوٹ جب تک دور نہ ہوگی مکالمہ بین المسالک ممکن نہ ہو گا۔

مکالمہ کی بنیادیں

اسلامی ادبیات کا مطالعہ کریں تو مکالمہ کی درج ذیل عملی صورتیں سامنے آتی ہیں:

(i) مُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ

اسلام کا جوہر اصلی اور اساسی عقیدہ توحید ہے مگر وہ ذات جس پر مکالمہ کی بنیاد استوار کی جا سکتی ہے، وہ ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے۔ آپ کی ذات اقدس کی اسی مرکزی حیثیت کی وجہ سے تاریخ گواہ ہے، تمام تر سیاسی اور دیگر اختلافات کے باوجود امت ہمیشہ اکٹھی ہوئی، عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے کوششیں اور قربانیاں

رسالت پر ردعمل اس کی واضح مثالیں ہیں۔اغیار نے بھی ہمیشہ اسی مرکزی نقطہ کو اپنی اسلام دشمن سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہے۔اعتراضات قرآن پر ہوں یا احادیث وسیرت پر ان کی کوشش صرف یہ ہوتی ہے "بدنِ مسلم" سے "روح محمدی" کو نکال دیا جائے۔امت کیلئے آپ کی اس مرکزیت کے اشارے ان احادیث میں موجود ہیں:۔

"وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ" (5)

"فَمَنْ اَطَاعَ مُحَمَّدًا فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصٰی مُحَمَّدًا فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ وَمُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَیْنَ النَّاسِ" (6)

اقبال کے الفاظ میں ذات محمد عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جدید اور قدیم کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت رکھتی ہے۔ (7)

بالکل اسی طرح تمام فرق اسلامیہ کے وسط میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مسعود ہی ہے اور تمام مکاتب فکر آپ ہی سے مستفیض ومستنیر ہو رہے ہیں۔آپ سے غیر منقسم وفاداری ہی معاشرہ کو اختلال وافتراق سے بچا سکتی ہے۔اس وفاداری میں کسی فرد کو شریک کرنا "شرک فی النبوت" ہے اور یہ شرک امت کو انتشار میں مبتلا کرتا ہے۔صحابہ کرام، اہل بیت، صلحاءِ امت، سب اسی سراج منیر سے اکتساب فیض کرنے والے ہیں اور ان سے محبت، ایمان کا تقاضا اور نسبتِ عظیم ہے۔

حضور شفیع امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسولِ وحدت ہیں۔آپ نے مختلف الاوطان اور مختلف الالوان افراد میں یگانگت پیدا کردی۔اعلانِ نبوت سے قبل معاہدہ حلف الفضول میں آپ کی شرکت معاشرتی ہم آہنگی اور بقائے باہمی کی خوشگوار فضا قائم کرنے کے لئے ہی تھی۔آپ نے گالیوں کے بدلے دعائیں دی، لوگوں نے کانٹے بچھائے آپ نے پھول رکھے، مگر ہم ہیں کہ اپنی تحریر وتقریر میں اپنوں کو ہی گالیاں دے رہے ہیں۔ نبی رحمت علیہ

التحیہ والسکینت کی ذات سے مسلمانوں کے تعلق ورشتہ کی بنیاد پر ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ دنیا میں ہماری شناخت کیا ہو؟ نسبت رسول (ﷺ) کے حوالہ سے اسلام یا مسلک؟

(ب) فروعی مسائل میں اعتدال

مکالمہ کی اہم صورت فروعی مسائل میں اعتدال وتوازن ہے۔ اس سے معاشرہ کو ہر قسم کی اعتقادی کجی، فکری زیغ، عملی ضلال، ذہنی اختلال اور نفسیاتی پیچیدگی سے بچایا جا سکتا ہے۔ معاشرہ میں جتنے انسان ہوتے ہیں اتنے ہی رَویے سامنے آتے ہیں مگر وسیع حلقہ بنانے کے لئے عمل کو عادت بنایا جائے۔ عفو کو رویہ اور رواداری کو بطور شعار اپنایا جائے۔ فروعی مسائل میں ہم نے شدت اور تعصب کے رویے کو اپنایا۔ جن مسائل پر صدیوں سے اختلاف رائے موجود تھا۔ انہیں ہی موضوع بحث بنا کر باہمی قربتیں دور کیں۔ یہ اختلاف تو امت کے لئے آسانی وسہولت پیدا کرنے والا تھا، مگر ہم نے انہی کے ذریعے دین کو مشکل سے مشکل تر بنا دیا۔ ہم اس اختلاف رائے کی روح سمجھنے ہی سے قاصر رہے۔ امام سیوطیؒ نے اس تناظر میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے:

وَاعْلَمْ اَنَّ اِخْتِلَافَ الْمَذَاهِبِ فِيْ هٰذِهِ الْمِلَّةِ نِعْمَةٌ كَبِيْرَةٌ وَفَضِيْلَةٌ جَزِيْلَةٌ وَعَظِيْمَةٌ وَلَهُ سِرٌّ لَطِيْفٌ اَدْرَكَهُ الْعَالِمُوْنَ وَعَمِيَ عَنْهُ الْجَاهِلُوْنَ.

اس امت میں فقہی آراء کا اختلاف، نعمت عظمیٰ اور فضیلت کبریٰ ہے اور اس میں ایک لطیف نکتہ مضمر ہے جس سے عالم آگاہ اور جاہل بے خبر ہیں۔

علامہ سیوطیؒ کی رائے ہے کہ سابقہ امتوں کا اختلاف (ان کے لئے) عذاب وہلاکت تھا۔ لیکن فروعی مسائل میں اس امت کا اختلاف، اس کے لئے آسانی' توسع اور ہمہ گیریت کا سبب ہے۔ سابقہ امم میں اس سہولت کے نہ ہونے سے وہ تنگی میں مبتلا ہوئیں۔ لیکن اس امت کو فروعی مسائل میں اختیار دیا گیا ہے۔ ان کے اصل الفاظ درج ذیل ہیں:-

وَكَانَ اِخْتِلَافُ الْاُمَمِ السَّابِقَةِ عَذَابًا وَّهَلَاكًا فَعُرِفَ بِذٰلِكَ اَنَّ اخْتِلَافَ الْمَذَاهِبِ فِیْ هٰذِهِ الْمِلَّةِ خَصِیْصَةٌ فَاضِلَةٌ لِّهٰذِهِ الْاُمَّةِ وَتَوْسِیْعٌ فِیْ هٰذِهِ الشَّرِیْعَةِ السَّمْحَةِ السَّهْلَةِ فَكَانَ الْاَنْبِیَآءُ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَیْهِمْ یُبْعَثُ اَحَدُهُمْ بِشَرْعٍ وَّاحِدٍ وَّحُكْمٍ وَّاحِدٍ حَتّٰی اِنَّهٗ مِنْ ضِیْقِ شَرِیْعَتِهِمْ لَمْ یَكُنْ فِیْهَا تَخْیِیْرٌ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْفُرُوْعِ الَّتِیْ شُرِعَ فِیْهَا التَّخْیِیْرُ فِیْ شَرِیْعَتِنَا (7 بدالفسل)

آئمہ کے اختلافات میں تغیر کا سبب زمان و مکان میں تغیر تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس سلسلے میں امام سیوطی کا یہ قول نقل کیا ہے: "آئمہ کے اقوال میں جو اختلافات واقع ہوئے ہیں ان کی وجہ ان کے اجتہاد کا تغیر ہے جس موقع پر وہ جس بات کو صحیح سمجھتے وہ وہی بات ہوتی جو ان کے اجتہاد میں اس وقت صحیح معلوم ہوتی تھی۔" (8)

زمان و مکان کے تغیر سے اجتہاد میں تبدیلی کی مثال دیتے ہوئے امام شعرانی نے امام شافعی کے مزار امام ابوحنیفہ پر قنوت نہ پڑھنے کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

انما كان لموافقة فی اجتهاده لهما في ذلك الوقت (9)

کہ اُس وقت دونوں اماموں کا اجتہاد ایک ہو گیا تھا (یعنی قنوت نہ پڑھنے میں) متحد ہو گیا تھا۔

آئمہ کے افکار سے یہ واضح ہوتا ہے فروعی مسائل میں شدت و غلو کا رویہ اپنانے کی بجائے اعتدال و توازن کا رستہ اختیار کرنا چاہیے کیونکہ یہ حسب افعال و اعمال وراثت ہیں جو آپ (ﷺ) سے منسوب ہیں۔ فقیہ محمد تقی عثمانی نبوی کی تشریح میں فرماتے ہیں علاوہ

بات ہے کہ نتائج میں اختلاف رائے سامنے آ جاتا ہے۔

مکالمات کے لئے ضروری ہے کہ فقہی مسائل میں اختلافات کو سہولت و آسانی اور امت کی خصوصیت سمجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے ہر کوئی اپنی فقہ پر عمل کرے مگر اپنی رائے کو وحی کا درجہ نہ دے اور ان مسائل میں مناظرہ کی بجائے مکالمہ کا اسلوب اختیار کرے۔ کلیات سے جڑے رہنا اصول پسندی ہے اور جزئیات پر اڑنا جمود کی علامت ہے۔ ان جزئیات پر دوسروں کی آراء کے احترام ہی سے مکالمہ کی راہ ہموار ہو گی۔

(ج) افکار صوفیاء سے استفادہ

صوفیاء کا عملی زندگی میں اپنایا ہوا رویہ مکالمہ بین المسالک میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ صوفیاء نے غیر مسلموں کو بھی بحیثیت انسان محبت و الفت دی۔ سیدنا عبدالقادر جیلانی حنبلی تھے مگر آپ کے ارادت مندوں و عقیدت مندوں میں احناف کا وسیع حلقہ ہے۔ مولانا روم حنفی ہونے کے باوجود ہر کلمہ گو کے دل میں بستے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ صوفیاء نے مکاتب فکر سے بالاتر ہو کر انسانیت کو احترام دیا اور آج سب کی عقیدتوں کا مرکز بن گئے۔ ڈاکٹر قاسم غنی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

”پانچویں صدی ہجری میں علماء اور اہل مدرسہ مذہبی نزاع میں مبتلا تھے اور ہر فرقہ اپنے مسلک کی حمایت میں دوسرے فرقوں سے جنگ و جدال کر رہا تھا۔ صوفیاء نے خود کو اس جنگ و جدال سے علیحدہ رکھا اور اپنے معاملات میں مصروف رہتے تھے۔“ (10)

صوفیاء کا رویہ حامل علماء کا اسلوب نگارش بھی اعتدال پر مبنی تھا۔ صوفیائے چشت کا تذکرہ کرتے ہوئے خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

”شیعوں نے مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود ان بزرگوں سے اپنے عادات و اطوار اور اپنی عقیدت میں فرق نہ آنے دیا۔ وہ ہر چیز کو اصل کی حقیقی

صورت میں دیکھتے تھے، اور کبھی وقتی مخالفت کی رو میں بہ کر عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے، ایک شخص نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے شیعوں کو کافر قرار دینے کے متعلق فتوی دریافت کیا تو شاہ صاحب نے اختلاف کیا۔ وہ شخص یہ کہہ کر کہ ''ایں شیعی است'' چلا گیا۔

ایک روہیلہ پٹھان آفتاب نامی شاہ عبدالعزیزؒ کے درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن شاہ صاحب نے سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے فضائل ومناقب بیان فرمائے تو اس کو اس قدر غصہ آیا کہ (خود شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان ہے) ''بندہ را شیعہ فہمیدہ، آمدن درس موقوف کرد'' (بندہ کو شیعہ سمجھ کر درس میں شریک ہونا بند کر دیا)۔

جن بزرگوں کا کام انتشار وابتری کے زمانے میں قوم کے ذہنی توازن کی نگہبانی کرنا تھا وہ کس طرح عوام کے جذبات کا شکار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان ہی بزرگوں کا کام تھا کہ اگر ایک طرف انہوں نے شیعوں کے عقائد باطلہ کی تردید میں اپنی زبان اور اپنے قلم کو جنبش دی، تو دوسری طرف انہوں نے سنی مسلمانوں میں ان کے خلاف تشدد کو روکا اور عدل وانصاف کو کبھی نظر انداز نہ کیا۔''(11)

اسی طرح خواجہ غلام فریدؒ کی زندگی رواداری واعتدال کا نمونہ تھی۔ اس سلسلہ میں یہ دو واقعات قابل مطالعہ ہیں جن کا ذکر کپتان واحد بخش سیال نے کیا ہے:

حضرت خواجہ صاحب کا مقام اس قدر بلند تھا کہ مخالفین طریقت کی بھی عزت کرتے تھے۔ اگرچہ سر سید احمد خاں کے عقائد ایسے تھے کہ علماء ان کی مذمت کرتے تھے لیکن خواجہ صاحب کا مسلک نہایت فراخدلانہ تھا۔ ایک دفعہ جب ریاست جھل کے حکمران قیصر خان مگسی نے عرض کیا کہ قبلہ سر سید احمد خان نیچری کیسا آدمی تھا۔ آپ نے فرمایا نہایت ہی اچھے آدمی

تھے اور ان کے چہرے سے برکت ٹپکتی تھی۔ان کا اسلام کے کسی فرقے سے اختلاف نہیں تھا اور ہر فرقے کو اچھا کہتے تھے۔ان کے والد شاہ ابوسعید دہلویؒ کے مرید وخلیفہ تھے۔شاہ ابوسعید،شاہ غلام علی دہلویؒ کے مرید وخلیفہ تھے۔وہ مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کے مرید وخلیفہ تھے۔میں نے سرسید احمد خاں سے پوچھا کہ آپ کی کسی بزرگ سے بیعت ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے کسی شخص کے ساتھ بیعت نہیں کی۔اگر کسی سے بیعت کی ہے تو ان کے ساتھ کی ہے۔(یعنی شاہ ابوسعید کے ساتھ) جن کی شکل وصورت فراموش نہیں ہوسکتی۔اس کے بعد فرمایا کہ میں نے ان سے ملاقات کی تو انہوں نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔اس دوران رسول اللہ (ﷺ) کا ذکرِ خیر اور صحابہ کرامؓ کی محبت کا ذکر ہوا تو بات کرتے کرتے وہ رو رہے تھے اور آنکھوں سے اس قدر آنسو جاری تھے کہ ریش تر ہوگئی اور قطرے نیچے ٹپک رہے تھے اور کمال شوق اور جوش سے پاؤں زمین پر اس طرح مارتے تھے کہ جیسے کوئی شخص رقت کے وقت مارتا ہے۔رسول خدا (ﷺ) کی محبت ان کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی۔اس کے بعد فرمایا کہ سرسید کا 1315ھ میں انتقال ہوا۔تاریخ انتقال یہ ہے۔

اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ

مولانا نذیر حسین کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"اسی طرح جب مخالف طریقت مولانا نذیر حسین دہلوی کے متعلق آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد بخش نے عرض کیا کہ حضورا لوگ مولوی نذیر حسین کو غیر مقلد اور وہابی کہتے ہیں، وہ کیسے آدمی تھے؟ آپ نے فرمایا

کہ کسی شخص کی عظمت کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ دنیا میں اس کی مانند کا کوئی نہ ہو چنانچہ آج کل کے زمانے میں علم حدیث میں ان کی کوئی نظیر نہیں ہے نیز وہ اس قدر بے نفس ہیں کہ اہل اسلام کے کسی فرقے کو برا نہیں کہتے نہ یہ بات کسی میں ہے اب اگرچہ وہ بہت ضعیف ہو چکے ہیں تاہم وہ اپنا کام خود کرتے ہیں حتی کہ مہمان کو کھانا بھی خود اٹھا کر دیتے ہیں۔ وہ کسی شخص سے یہ نہیں پوچھتے کہ تم صوفی ہو یا کیا مذہب رکھتے ہو۔"(12)

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ڈاکٹر محسن جہانگیری کی رائے ہے:

"ابن عربی نہ تو متشدد اول معنی میں شیعہ تھے نہ معروف مفہوم میں سنی، وہ ایک وحدت الوجودی صوفی تھے، وجود کو واحد جانتے تھے غیر حقیقت اور دین و مذہب کو بھی، بنا بریں ان کا طریقہ یہ تھا کہ خود کو خارجی تعصبات کی قید و بند اور دینی و کلامی مناظرات اور مجادلات سے آزاد کر لیا جائے، البتہ یہ معلوم نہیں کہ وہ اپنے اس مقصد کو پہنچے یا نہیں"(13)

مکالمہ کی راہیں: علماء کی آراء

ذیل میں اس موضوع کے حوالے سے چند علماء کی آراء نقل کی جاتی ہیں:

(ا) مختلف الرائے مکاتب فکر میں اتحاد کس طرح ممکن ہے؟ متحارب و مخالف فریقین کن بنیادوں پر متحد ہو سکتے ہیں؟ ایسے ہی سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان اصولی و اساسی امور کا تذکرہ کیا ہے جن پر اتحاد ممکن ہے اور ہر فریق اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے امن و سلامتی، صلح و آشتی اور الفت و محبت کی لڑی میں منسلک ہو سکتا ہے۔ اس اتحاد کا لائحہ عمل ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"جو اتحاد مطلوب و مقصود ہے، اس کے لئے صرف اصل اصول کا اشتراک بالکل کافی ہے۔ فروع بلکہ غیر اہم اصول کی طرف جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ انضمام اور چیز ہے (اور اس پر کوئی بھی فرقہ کیوں راضی ہونے لگا) اور اتحاد اور اتحاد کی دعوت تو قرآن مجید نے غیر مسلموں (یہود و نصاریٰ) تک کو دی ہے، یہ کہہ کر کہ توحید کو بطور نقطہ اشتراک قبول کرلو، اور ان کے دوسرے عقیدوں سے کوئی بحث ہی نہیں رکھی اور مدینہ آ کر یہود سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدۂ اتحاد قائم ہی کر لیا تھا۔ یہ طے کر لیجیے، اس پر سختی سے جم جایئے تو اتحاد و مصالحت کی صورت بالکل آسان ہو جاتی ہے۔ نقطہ اشتراک و اتحاد اقرار شہادتین ہے، یعنی اقرار توحید و رسالت، مسئلہ امامت و تفضیلِ صحابہ وغیرہ گو اپنی جگہ اہم ہیں لیکن توحید و رسالت کی طرح اور وحدت کلمہ و قبلہ کی طرح بنیادی چیزیں نہیں۔ جزئیات کی طرف جایئے گا تو خود اہل سنت کے ہاں کتنے فرقے، کتنی تفریقیں نکل آئیں گی۔ (14)

(ب) پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ نے مکالمہ کیلئے پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا۔ ان کے نزدیک اس فارمولا کی بنیاد پر مکالمہ ممکن ہے:

1- اتحاد کے داعی کو اپنی دعوت کی سچائی اور افادیت پر اتنا پختہ یقین ہونا چاہیے کہ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے کسی طرح ہراساں نہ ہو۔

2- زیادتی کرنیوالے فریق کو روکا جائے، جس کی حق تلفی ہو، اس کی حق رسی کی جائے خواہ اس کا تعلق کسی جماعت یا مکتب فکر سے ہو یعنی

حقوق وفرائض کا پلڑا متوازن رہنا چاہیے۔

3- ہر ایک فریق کو اتنا وسیع الظرف ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے فریق کی بات سنے، اس میں دیانت داری سے غور وفکر کرے اور جس چیز کو حق جانے اسے اپنا لے۔

4- عظمتِ رسالت اور تقدسِ نبوت ہی دین کی بنیاد ہے۔ اگر کسی بھی مکتبِ فکر کے لٹریچر میں کوئی ایسی عبارت ہو جس سے دین کی اس بنیاد پر اشارۃً یا صراحۃً حرف آتا ہو اسے حذف کر دینا چاہیے کیونکہ کوئی بھی غیرت مند مسلمان ایسی صورت حال سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

5- ایک دوسرے پر الزام تراشی کے وقت ہر مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور فرزندان اسلام پر شرک وکفر کے فتوے لگانے سے بھی باز نہیں آتے، اس سلسلہ میں ایسے ٹھوس اقدامات کرنے چاہئیں کہ اس قسم کی غیر محتاط زبانیں بند ہو جائیں۔(15)

(ج) سید خورشید گیلانی لکھتے ہیں:

(1) ہر فرقہ اپنی تاریخ اور فقہ کو قرآن و حدیث کا درجہ نہ دے اور بات اسلام کی بنیادی اور جوہری تعلیمات تک رکھے۔

(2) ہر شخص اسلام کے اعلیٰ وارفع نصب العین کو پیش نظر رکھ کر امت کے وسیع تر مفاد کا تحفظ کرے۔

(3) فروعی مسائل کی بجائے اخلاقی اور معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع تقریر وتحریر بنائے۔

(4) اپنی ذات، مالی مفادات، گروہی تعصبات اور شخصی تحفظات سے اوپر

اٹھنا ہی اتحادِ امت کی خشت اول ہے۔ سخن سازی نہیں بلکہ اپنے ضمیر
سے فتویٰ لے کر ہر ایک کو وحدتِ امت اور فرقہ واریت کے نفع
ونقصان کا میزانیہ تیار کر کے فیصلہ کرنا ہوگا۔ (16)

علماء کے یہ افکار، تجاویز و آراء اپنی جگہ لائحہ عمل کا تعین ضرور کرتی ہیں مگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، مکالمہ کے لئے درج ذیل دو نکات بڑی اہمیت کے حامل ہیں:-

(ا) ہر قسم کی بیرونی تبدیلی سے پہلے اندرونی تغیر و تبدل ضروری ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کو سب سے پہلے اپنے اندر تبدیلی لانا ہوگی۔ تحمل، برداشت، رواداری اور باہمی اعتماد و محبت کی فضا پہلے اپنے وجود میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ (الرعد:11) کا یہی مفہوم ہے۔

(ب) مکالمہ کے لئے اخلاصِ عمل ساتھ ساتھ درست حکمتِ عملی بھی ضروری ہے۔ دونوں کے اکٹھا نہ ہونے سے ثمرات کا حصول ممکن نہیں۔ ہمارے ہاں اس سلسلہ میں جو بھی کوششیں ہوتی ہیں' ان کے نتیجہ میں ایک نیا گروہ سامنے آ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دونوں عناصر میں سے کوئی ایک عنصر مفقود ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں انتظامیہ کے علاوہ مختلف تعلیمی اداروں کالجز، یونیورسٹیز اور مدارس کا کردار کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

مصادر و مراجع

(1) مکالمہ (Dialogue/حوار) کا مفہوم دو یا زیادہ افراد کے مابین تحریری یا زبانی گفتگو ہے۔
ابتداء میں عیسائیوں میں اس اصطلاح نے بے چینی بھی پیدا کی۔ 1970ء کی دہائیوں کے وسط میں یہ لفظ عیسائیوں کے Liberal Wing کیلئے استعمال ہوا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے:

(i) اردو لغت، اردو لغت بورڈ کراچی، جلد 18، ص 518

(ii) المورد، منیر البعلبکی، دار العلم للملایین، 1999ء، ص: 269

(iii) New Oxford Illustrated Dictionry Vol:1, p:460

(iv) Encyclopedia of religion Vol: 4, pp:344-348

(v) ''الحوار الاسلامی النصرانی اوالحوار بین مسلمین و نصاریٰ'' اس مضمون کا اردو ترجمہ ''مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مکالمہ جدید واقعات، اسباب، نظریات واہداف، شرعی حیثیت'' کے عنوان سے ہوا اور افکار رضا ممبئی (جولائی تا ستمبر 2005ء جلد 11 شمارہ: 3) میں شائع ہوا۔

(2) الشیخ احمد رضا خاں محدث بریلویؒ کا بدعات کے بارے میں نقطہ نظر ان کی کتابوں میں دیکھیں اور عملی طور پر جو ہو رہا ہے اس کو ملاحظہ کریں تو ایک واضح فرق نظر آئے گا۔ سید محمد فاروق القادری کی کتاب ''فاضل بریلوی اور امورِ بدعت'' شائع کردہ رضا پبلی کیشنز لاہور، اس سلسلہ میں قابل مطالعہ ہے۔

(3) یہاں علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی کی تحقیق کے مطابق اہل سنت و جماعت کے قطعی اور ظنی عقائد کی فہرست نقل کی جاتی ہے:

عقائد قطعیہ

اللہ عزوجل کی ذات کو وجود و وجوب، استحقاقِ عبادت اور استقلال بالصفات میں واحد بلا شریک ماننا، اللہ تعالیٰ کی صفات کے لئے حسن و کمال کو واجب اور نقص اور عیب مثلاً کذب اور جہل کو محال ماننا، یہ ماننا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں، وہ کسی فعل پر جواب دہ نہیں، اس کا نیکوکاروں کو ثواب عطا فرمانا محض اس کا فضل ہے اور عذاب دینا اس کا عدل ہے۔
تمام فرشتوں، کتابوں، انبیاء اور رسل پر ایمان لانا، حضور نبی مکرم (ﷺ) کو آخری نبی ماننا، قیامت، حشر و نشر اور جزاء و سزا پر ایمان رکھنا، مرتکب گناہِ کبیرہ کو مسلمان اور قابل عفو سمجھنا۔
انبیاء اور ملائکہ معصوم ہیں، ان کے سوا کسی کی عصمت ثابت نہیں وغیرہا۔

حضور نبی مکرم (ﷺ) کا امت کے تمام اعمال پر گواہ ہونا (جس کو حاضر و ناظر سے تعبیر کیا جاتا ہے) حضور پر نور کا اطلاق کرنا، حضور کا سایہ نہ ہونا، حضور کو شرعی اور تکوینی امور کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفوض کیا جانا، حضور کو "ما کان وما یکون" کا عالم جاننا، حوائج اور مشکلات میں حضور سے استمداد اور یارسول اللہ کے کہنے کو جائز سمجھنا، حضور سے دنیا اور آخرت میں شفاعت کو جائز سمجھنا، حضرت ابوبکر کی تمام صحابہ پر فضیلت اور خلفاء راشدین کی خلافت علی الترتیب کو حق اور فضیلت کا معیار سمجھنا۔ خلیفہ کے تقرر کو حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق جائز سمجھنا، موزوں پر مسح کرنا، تمام صحابہ، ازواج مطہرات، آل رسول' سادات کرام اور اولیاء اللہ کا تعظیم سے ذکر کرنا، اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کرنا، ان کے توسل سے دعا مانگنا' ایصال ثواب کی مختلف صورتیں: مثلاً سوئم، چہلم، عرس وغیرہ بطور استحباب کرنا، حضور کا ذکر بعنوان میلاد شریف بطور استحسان کرنا، پنج وقتہ نمازوں اور جمعہ کے بعد استحباباً صلوۃ وسلام پڑھنا' وغیرھا من الاعمال الفرعیۃ" (سعیدی غلام رسول' مقالات سعیدی، فرید بک سٹال، لاہور 2000ء ص 326-235)

اہل تشیع کو نظریہ امامت کی بناء پر مطعون کیا جاتا ہے، مگر باقر مجلسی کے بقول یہ نظریہ ضروریات دین سے نہیں ضروریات شیعہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زمانہ رسالت مآب میں شہادتین کا اقرار کرنے سے ہی آدمی کی جان محفوظ ہو جاتی تھی (باقر المجلسی، محمد، مرآۃ العقول، تحقیق السید ہاشم الرسولی، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، جلد 7، ص 121)۔

علامہ سید محمود احمد رضوی نے اسی تقسیم کے پیش نظر ایمان ابو طالب کے مسئلہ میں الشیخ احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "ایمان ابو طالب کے متعلق اعلیٰ حضرت عظیم البرکت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز نے اپنے موقف کو مدلل بیان فرما دیا ہے۔ ان کی تحقیق میری تصدیق کی محتاج نہیں۔ البتہ یہ واضح ہے کہ یہ مسئلہ نہ ضروریات دین سے ہے نہ ضروریات مذہب اہل سنت سے۔"

احمد رضا خاں، الشیخ، رسائل رضویہ، مکتبہ حامدیہ لاہور 1976ء ص 485

(4) بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الایمان باب حب الرسول من الایمان، رقم الحدیث: 12

(5) ایضاً کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء بسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رقم الحدیث: 728

(6) محمد اقبال، علامہ، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم، سید نذیر نیازی، بزم اقبال لاہور 1986ء،

ص:193
(7) نابلسی، عبدالغنی، خلاصة التحقیق فی بیان حکم التقلید والتلفیق، ترکی،1981،
ص:8
(8) شاہ ولی اللہ، الانصاف فی بیان مسبب الاختلاف، ترجمہ مولوی عبید اللہ، علماء اکیڈمی لاہور،
1981، ص:65
(9) شعرانی، عبدالوہاب بن احمد، المیزان الکبریٰ، دارالکتب العلمیۃ بیروت1988، جلد اول
ص:74
(10) لطف اللہ، پروفیسر، تصوف اور سیرت، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور؟196، ص198
(11) خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دارالمؤلفین اسلام آباد ص365
(12) واحد بخش سیال، کپتان، حیات و تعلیمات حضرت خواجہ غلام فرید، محکمہ اوقاف پنجاب،2002ء
ص 390-391
(13) محسن، جہانگیری، ڈاکٹر، محی الدین ابن عربی، حیات و آثار، مترجمین، احمد جاوید، سہیل عمر، ادارہ
ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص 458,459
(14) الشریعہ، گوجرانوالہ جلد15، شمارہ12 ص:16
(15) مقالات ضیاء الامت، مرتبہ پروفیسر احمد بخش، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور1990، جلد اول،
ص:53
(16) خورشید گیلانی، الہدیٰ، خورشید گیلانی ٹرسٹ لاہور، ص150

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

احترام آدمیت

عورتوں کے حقوق، معاشرتی زندگی میں عورت کا مقام ومرتبہ معاشی پیش رفت میں عورتوں کا کردار، تعلیمی کاوشوں میں عورتوں کے فرائض، عصری تقاضوں کے حوالے سے عورتوں کے مسائل اوران کا حل

معاشرتی زندگی میں عورت کا مقام و مرتبہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

محمد اکرم ساجد

جامعہ شیخ الاسلام لاہور

معاشرتی زندگی میں عورت کا مقام و مرتبہ
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں

محمد اکرم ساجد

آفتاب اسلام کے طلوع ہونے سے قبل عورت طرح طرح کی ناانصافیوں اور ظلم وستم کا شکار تھی۔ تمام تہذیبوں میں اسے عیاشی کا سامان سمجھا جاتا تھا۔ نامور عالم دین اور محقق پیر محمد کرم شاہ الازہری کے بقول عرصہ ہائے دراز سے یہ صنف نازک ظلم وستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ قدرت نے اگرچہ اسے مرد کی طرح ذی روح اور ذی شعور بنایا تھا لیکن اس کے ساتھ برتاؤ مٹی کی بے جان مورتیوں کا سا کیا جاتا تھا۔ جوئے میں داؤ پر اسے لگایا جاسکتا تھا۔ کہیں اسے تمام برائیوں کی جڑ اور انسان کی ساری بدبختیوں کا سرچشمہ یقین کیا جاتا تھا اور کہیں چوٹی کے نامور فلسفی اس کے انسان ہونے کو بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ اس کو ملکیت کے حقوق حاصل نہ تھے۔ اسے ازدواجی بندھوں میں مقید کرنے سے پہلے اس سے کوئی رائے لینے کا تصور تک نہ تھا۔ یہ بلکہ اس سے بھی بدتر حالات تھے، جن میں اسلام سے پہلے یہ صنف نازک گرفتار تھی۔ (1) مزید لکھتے ہیں:

عورت مرد کی ایک تابع مہمل تھی۔ اگر اس کا خاوند عنفوان شباب میں ہی مرجائے تو اس کے لئے باعزت اور بہترین طریقہ یہ تھا کہ وہ مرد کی لاش

کے ساتھ ہی جل کر ستی ہو جائے اور اگر وہ اپنے آپ کو جلا دینے کی جرأت نہیں کر سکتی تو اسے ساری عمر ایسی زندگی بسر کرنا ہو گی جس میں اسے نہ اچھا لباس پہننے کی اجازت ہو گی، نہ وہ زیورات سے اپنی آرائش کرنے کی مجاز ہو گی۔ اسے دوسری شادی کرنے کی بھی اجازت نہیں ہو گی، خواہ وہ اس وقت بیوہ ہوئی ہو جب کہ اس نے ابھی جوانی میں قدم رکھا ہو۔ عورت زیورات کی مالک تو ہو سکتی تھی لیکن کسی غیر منقولہ جائیداد کی مالک نہیں بن سکتی تھی۔ عورت ہر حالت میں غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ کنواری تھی تو باپ کے حکم کی پابند، بیاہی گئی تو خاوند کے ہر حکم کی پابند، با اولاد ہو گئی تو بچوں کا ہر حکم ماننا اس پر واجب۔ (2)

حکیم الامت مفتی احمد یار خاں نعیمی کے بقول اسلام سے پہلے عرب بلکہ ہندوستان میں عورت مثل مال مویشی کے سمجھی جاتی تھی کہ شوہر فقط اپنی خدمت کے لئے کھانا کپڑا دے کر ان سے غلاموں کا سا برتاؤ کرتے تھے بلکہ انہیں جائیداد کی طرح استعمال کرتے تھے۔ (3)

اسلام نے عورت کو شمع محفل نہیں، بلکہ گھر کی ملکہ و مالکہ قرار دیا، اس کو عزت نفس دی، اس کی عزت و عصمت کو قیمتی ترین دولت قرار دیا، جس کی حفاظت کے لئے اسے گھر کی چار دیواری میں رہنے کا حکم دیا۔ اس کے حسن کو بیش بہا موتی قرار دیا، جس کو ہر ایرے غیرے کی نظر سے محفوظ رکھنے کے لئے پردے کا حکم دیا۔ اس کے قدم کو گھر کے لئے باعث برکت اور وسعت رزق کا ذریعہ قرار دیا۔ ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے رشتوں میں منسلک کر کے اس کا تقدس بحال کیا، اس کی گود' قوم کی اولین تربیت گاہ بنائی۔ مرد کو عورت کے لوازم زندگی فراہم کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ غلط روی سے بچانے اور اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے مرد کو اس پر حاکم کی حیثیت دی اور ان حکام کو عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ

کرنے کا پابند بنایا۔ اسلام کا عورت پر یہ احسان ہے کہ اسے زندگی کی الجھنوں سے آزاد کرنے کے لئے مرد کی اطاعت وفرمانبرداری کا حکم دیا۔ زندگی کے نشیب وفراز کی فکر مردوں کا کام ہے' صنف نازک پر یہ بوجھ نہیں۔ اسلام کی نظر میں عورت حسن و جمال کا وہ پیکر ہے' جس کی ناز ونعم کے ساتھ پرورش کرنا مردوں کی ذمہ داری ہے۔ غرضیکہ اسلام عورت کو ہر اعتبار سے عیش آرام کی اور سکون کی زندگی مہیا کرتا ہے۔ (4)

آیئے اب ذرا تفصیل سے جائزہ لیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں معاشرتی زندگی میں عورت کا کیا مقام ومرتبہ ہے۔

عورت بحیثیت ماں

قرآن مجید نے خصوصیت کے ساتھ ماں کا تذکرہ فرمایا اور ساتھ ان تکالیف کو بھی بیان فرما دیا جو بچے کی پیدائش کے وقت اور اس کی پرورش میں اسے برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ خالق کائنات کی قدرت کاملہ پر ذرا غور تو فرمایئے کہ ایک بچی میں دیگر جذبات کے ساتھ ماں بننے کا جذبہ بھی ودیعت رکھا جاتا ہے اور جوں جوں یہ بچی بڑی ہوتی چلی جاتی ہے' اس کے دوسرے جذبات کے ساتھ اس کا یہ جذبہ بھی پرورش پاتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اپنی بھرپور جوانی کی عمر کو پہنچتی ہے تو اس کا یہی جذبہ یوں شدت اختیار کر جاتا ہے کہ وہ کسی مرد کے پہلو میں پہنچ کر صرف اسی جذبہ کی تکمیل کے لئے ان بے شمار ذمہ داریوں بوجھ اٹھانے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے جو شادی کے بعد یقیناً اسے پورا کرنا ہوتی ہیں اور جس دن وہ حاملہ ہوتی ہے وہ اس کی زندگی کا اہم ترین دن ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنی مراد مل جاتی ہے۔ اس وقت حاصل ہونے والی خوشی کی قدر وہ عورت جانتی ہے جو بیچاری ماں بننے کے لئے ساری عمر تڑپتی رہتی ہے لیکن اپنے بانجھ پن کے باعث اس سعادت سے محروم رہتی ہے۔ اس کو ساری دنیا کا عیش وآرام ہی کیوں نہ مل جائے لیکن اس کے چہرے پر کبھی مسرت کے آثار پیدا نہیں ہوتے۔ وہ عورت' جو امید سے ہوتی ہے' اسے اس قدر خوشی

حاصل ہوتی ہے جو دنیا کی کسی بڑی سے بڑی نعمت ملنے پر بھی نہیں ہوتی۔ حمل کے بعد عورت کی تمام قوت و طاقت حتیٰ کہ اس کے خون کا بڑا حصہ بھی بچے کی طرف منتقل ہونے لگتا ہے۔ وہ عورت جو پہلے ہی پیدائشی طور پر کمزور مخلوق اور صنف نازک ہے، مزید کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی کیفیت کو قرآن کریم نے ﴿وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ﴾ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا لیکن یہ کمزوری پر کمزوری بھی اس عورت کے جذبہ ماںتا کو کم نہیں کر پاتی اور وہ بڑی بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگتی ہے، جس دن وہ اپنے پیٹ کے بچے کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے لگے۔ یہ عورت ہی جانتی ہے کہ بچے کو جنم دینا کس قدر مشکل کام ہے لیکن پھر بھی اس پر نہ کوئی خوف طاری ہوتا ہے اور نہ ہی اسے اپنی جان کا کوئی خطرہ ہوتا ہے۔ ولادت کا یہ دورانیہ جس قدر سخت اور جان لیوا ہوتا ہے اتنا ہی سکھ اور چین ماں کو بچے کی پہلی آواز سن کر حاصل ہوتا ہے اور وہ سارا دکھ درد بھول جاتی ہے۔

غور فرمایئے! قدرت نے عورت کے دل میں ماںتا کا جذبہ پیدا کر کے انسان کی پیدائش کا کیا عجب اہتمام فرمایا ہے۔ (5)

آیئے! اب ماں کے مقام بلند کو جاننے کے لئے چند احادیث مبارکہ کا مطالعہ کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَبِرُّ؟ قَالَ اُمَّكَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمَّكَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمَّكَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبَاكَ ثُمَّ الْاَقْرَبَ فَالْاَقْرَبَ (6)

''حضرت بہز بن حکیم نے اپنے والد اور انہوں نے ان کے دادا سے روایت کی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: یارسول اللہ! میں کس کے ساتھ نیکی کروں؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ، میں نے پوچھا: اس کے بعد، فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ، میں نے پوچھا اس کے بعد،

فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ، میں نے عرض کیا: اس کے بعد، فرمایا: اپنے باپ کے ساتھ، پھر اس کے بعد جو قریبی رشتہ دار ہو"۔

اس حدیث مبارکہ میں آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تین مرتبہ ماں کو حسن سلوک کا حق دار قرار دیا اور چوتھی مرتبہ باپ اور دیگر رشتہ داروں کو۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے، آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّھَاتِ. (7)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے ماں کی نافرمانی کو تم پر حرام کیا ہے"۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّھَاتِکُمْ (8)

"جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے"۔

ایک موقع پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کسی کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

اَلْزِمْ رِجْلَھَا فثم الْجَنَّۃ (9)

"ماں کے قدموں سے چمٹے رہو کہ جنت وہیں ہے"

ذرا غور تو فرمایئے کہ ان احادیث کی روشنی میں ماں کا مقام کتنا بلند ہے۔

سیدنا معاویہ بن جاہمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ میرے باپ جاہمہ نے جہاد میں شریک ہونے کا ارادہ کیا۔ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم) میں جہاد کے لئے جانا چاہتا ہوں آپ سے مشورہ کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کیا تمہاری ماں ہے؟ عرض کیا جی ہاں، فرمایا: جاؤ اپنی ماں کی خدمت کرتے رہو فَاِنَّ الْجَنَّۃَ عِنْدَ رِجْلِھَا جنت تو اسی کے پاؤں کے پاس ہے۔ (10)

روایت میں ہے کہ وفات کے قریب ایک جوان کی زبان کلمہ شہادت سے رک

گئی۔ صحابہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھے اور اس صحابی کے گھر تشریف لائے۔ آپ نے اس کے قریب آ کر کلمہ شہادت کا ورد شروع کیا۔ وہ صحابی اپنی زبان کو حرکت دیتے ہیں لیکن زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ اپنی زبان سے کوئی کلمہ نکالنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کیا یہ شخص نماز ادا نہیں کرتا تھا؟ کیا روزے نہیں رکھتا تھا؟ کیا زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تھا؟

صحابہ کرام نے عرض کیا:

یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! یہ سب کام تو کیا کرتا تھا۔

پھر آپ نے فرمایا:

هَلْ عَقَّ وَالِدَيْهِ کیا یہ اپنے والدین کا نافرمان تھا؟

صحابہ کرام نے عرض کیا:

یہ اپنے ماں باپ کا نافرمان تو تھا۔

آپ نے فرمایا:

اس کی والدہ کو بلایا جائے۔

اس کی والدہ حاضر ہوئی جو بوڑھی عورت تھی اور اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کیا تو اپنے بیٹے کو معاف نہیں کر دیتی؟

اس نے عرض کی:

یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! میں اسے معاف نہیں کر سکتی، اس نے مجھے ایک مرتبہ تھپڑ مارا تھا اور میری آنکھ ضائع کر دی تھی۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لکڑیاں اور آگ لے آؤ۔

اس عورت نے پوچھا:

آپ لکڑیوں کو کیا کریں گے؟

آپ نے فرمایا:

تمہارے سامنے اس کو جلا دیتے ہیں کیونکہ اس نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کی یہی جزاء ہے (یعنی قیامت میں بھی اسے جہنم میں ہی جلنا ہے)۔

اس عورت نے کہا:

میں معاف کر رہی ہوں' میں معاف کر رہی ہوں' کیا میں نے آگ کے لئے اسے نو ماہ پیٹ میں اٹھایا تھا؟ کیا میں نے آگ کے لئے اسے دو سال دودھ پلایا تھا؟

اس کے بعد علامہ رازی فرماتے ہیں:

فَاَیْنَ رَحْمَةُ الْاُمِّ ؟ فَعِنْدَ ذَالِکَ انْطَلَقَ لِسَانَهٗ وَذَکَرَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ماں جیسی رحمت اور کہاں ملے گی! جونہی ماں نے معاف کیا تو صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان چلی اور کلمہ شہادت کا ذکر کیا۔ (11)

سیدنا ابو الطفیل غنوی سے مروی ہے، آپ نے کہا کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

اِذَآ اَقْبَلَتِ امْرَاَةٌ فَبَسَطَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ رِدَآئَهٗ حَتّٰی قَعَدَتْ عَلَیْهِ فَلَمَّا ذَهَبَتْ قِیْلَ هٰذِهٖ اَرْضَعَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ . (12)

ایک عورت آئی جس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چادر

بچھائی، وہ اس پر بیٹھی پھر چلی گئی تو لوگوں کو بتایا گیا کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دودھ پلایا ہے۔

یہ سیدہ حلیمہ سعدیہ تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی والدہ تھیں۔ان تفصیلات کو سن کر کون ہے جو اپنی والدہ کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے بے چین نہ ہو جائے۔

عورت بحیثیت بیوی

بحیثیت بیوی بھی اسلام میں عورت کو بڑا بلند مقام حاصل ہے۔خاوند کو اس کی ہر قسم کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔جس طرح خاوند کے بیوی کے ذمہ حقوق ہے اسی طرح بیوی کے بھی خاوند کے ذمہ حقوق ہیں۔ارشادی باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (13)

ترجمہ: ''اور ان (بیویوں) کے بھی حقوق ہے (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق''۔

زندگی کے باقی شعبوں کی طرح' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ برتاؤ، ہمارے لئے مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ذرا غور تو رفرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی تمام بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک کریں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا کہ آپ پر کوئی پابندی نہیں لیکن اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ ہر بیوی کے ساتھ مساویانہ اور عادلانہ سلوک فرماتے۔ (14)

خطبہ حجۃ الوداع میں حضور سرورکائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

اَیُّهَا لنَّاسُ اتَّقُو اللّٰهَ وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَیْرًا فَاِنَّهُنَّ عِنْدَ كُمْ

عَوَانٌ لَّا يَمْلِكْنَ لِاَنْفُسِهِنَّ شَيْئًا وَّاَنَّكُمْ اِنَّمَا اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانَةِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَلَّا يُوْطِئْنَ فِرَاشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَهٗ وَعَلَيْهِنَّ اَنْ لَّا يَاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَّاِنْ فَعَلْنَ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذِنَ لَكُمْ اَنْ تُهَاجِرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَتَضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ فَاِنِ انْتَهَيْنَ فَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (15)

ترجمہ: اے لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو، میں تمہیں عورتوں کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ تمہارے زیردست ہیں، وہ اپنے بارے میں کسی اختیار کی مالک نہیں اور وہ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ وہ تم پر حلال ہوئی ہیں۔ تمہارے ان کے ذمہ حقوق ہیں اور ان کے تمہارے ذمہ حقوق ہیں۔ تمہارا ان پر حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کی حرمت کو برقرار رکھیں اور ان پر لازم ہے کہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب نہ کریں اور اگر ان سے کوئی بے حیائی کی حرکت سرزد ہو تو پھر اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ تم ان کو اپنی خوابگاہوں سے الگ کر دو اور تم (ایسی صورت میں) انہیں مار سکتے ہو لیکن ایسی ضرب کے ساتھ جو شدید نہ ہو۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو تم پر لازم ہے کہ ان کے خورد و نوش اور لباس کا عمدگی سے انتظام کرو"۔

ایک اور ایمان افروز ارشاد گرامی ملاحظہ فرمائیں:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ. تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرتا ہو۔ کاش ہم سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ وہ گھر جس میں میاں بیوی میں ان بن ہو وہ کبھی سچی مسرتوں سے لطف اندوز نہیں

ہوسکتا اور نہ کبھی ترقی کرسکتا ہے۔ (16)

عورت کے خاوند پر اخلاقی حقوق کثیر ہیں۔ ہر وہ حق جو حسن اخلاق میں آتا ہو وہ خاوند پر اخلاقاً لازم ہے اور ہر وہ قول و فعل جو بدمزاجی میں آتا ہو اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان زوجہ کو اپنے گھر کا ایک فرد سمجھے تو یقیناً تمام گھریلو جھگڑے اور فساد ختم ہو جائیں۔

خاوند پر اخلاقاً لازم ہے کہ وہ اپنی زوجہ کی ہر قسم کی تکلیف کو دور کرنے کی اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرتا رہے۔ بیمار ہونے پر جتنا ہو سکے علاج کرائے۔ اس کے والدین کو اس کی ملاقات سے نہ روکے کیونکہ اس میں قطع رحمی ہے جو گناہ ہے۔ (17)

عورت بحیثیت بیٹی

عہد جاہلیت میں کئی قبیح اور سنگدلانہ رسمیں رائج تھیں جنہیں وہ بڑے شرح صدر سے انجام دیا کرتے تھے۔ انہی غیر انسانی رسوم میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ اس پر غمزدہ یا پشیمان ہونے کے بجائے وہ فخر و مباہات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ یہ ظالمانہ رسم عرب کے جاہلی معاشرے میں اپنے پنجے بہت گہرے گاڑ چکی تھی۔ عام طور پر اسے کوئی معیوب چیز یا ظلم بھی نہ سمجھا جاتا۔ باپ اپنی اولاد کا مالک کل ہے، چاہے اسے زندہ رکھے چاہے قتل کر دے، کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، لیکن اس سنگدل معاشرے میں خال خال ایسے لوگ موجود تھے جو معصوم بچیوں کی بے کسی پر خون کے آنسو بہاتے اور ان سے جتنا کچھ بن آتا اس سے دریغ نہ کرتے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی عمرو بن نفیل کو جب پتہ چلتا کہ فلاں کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے اور وہ اس کو زندہ دفن کرنا چاہتا ہے تو دوڑ کر اس کے پاس جاتے اور اس کی بچی کی پرورش اور اس کی شادی وغیرہ کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھاتے اور اس طرح اس معصوم کی جان بچاتے۔

لیکن اس ظالمانہ رسم کا پوری طرح قلع قمع اس وقت ہوا جب اللہ تعالیٰ کا محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رحمۃ للعالمین بن کر تشریف لایا اور بیٹی کو وہ شان بخش دی کہ وہ باعثِ عار ہونے کے بجائے اپنے والدین کے لئے وجہ صد افتخار بن گئی۔ (18)

حضور سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس احسن انداز میں اپنی بنات طیبات کی پرورش اور تربیت فرمائی اور جو حسن سلوک آپ ان سے روا رکھتے تھے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ آیئے چند ارشادات نبوی ملاحظہ فرمائیں تاکہ آپ کے دل میں اپنی بچیوں کی قدر و منزلت پیدا ہو:

1-مَنِ ابْتُلِیَ مِنْ هٰذِهِ الْبِنَاتِ بِشَيْیءٍ فَاَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهٗ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ. (19)

ترجمہ: جو شخص ان بچیوں کا باپ بننے سے آزمایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے لئے آتش جہنم سے پردہ ثابت ہوں گی۔

2-مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَآءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنَا وَهُوَ هٰكَذَا وَضَمَّ اَصَابِعَهٗ. (20)

ترجمہ: جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغہ ہوگئیں تو قیامت کے دن میں اور وہ اس طرح کھڑے ہوں گے، یہ فرمایا اور اپنی انگلیوں کو باہم پیوست کر دیا۔

3-مَنْ كَانَتْ لَهٗ اُنْثٰی لَمْ يَئِدْ هَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ عَلَيْهَا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ. (21)

ترجمہ: جس کی ایک بچی ہو، وہ اسے زندہ درگور نہ کرے۔ اس کی توہین بھی نہ کرے، اپنے بیٹے کو اس پر فوقیت بھی نہ دے تو اس امر کے بدلے اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

4-اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ لِسُرَاقَۃَ بْنِ جَعْشَمَ اَلَا اَدُلُّکَ عَلٰی اَعْظَمِ الصَّدَقَۃِ اَوْمِنْ اَعْظَمِ الصَّدَقَۃِ قَالَ بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِبْنَتُکَ الْمَرْدُوْدَۃُ اِلَیْکَ لَیْسَ لَھَا کَاسِبٌ غَیْرُکَ۔ (22)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سراقہ بن جعشم سے فرمایا کیا میں تمہیں سب سے بڑے صدقہ پر آگاہ نہ کروں؟ عرض کیا! ضرور مہربانی فرمائیے۔ فرمایا: تیری وہ بیٹی جو (طلاق پاکر یا بیوہ ہوکر) تیری طرف پلٹ آئے اور تیرے سوا اس کے لئے کوئی کمانے والا نہ ہو"۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قسم کے ارشادات اور اپنی دختران عالی مرتبت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غایت درجہ پیار اور ہر موقع پر ان کی قدر افزائی یہی وہ اسباب تھے جن کے باعث بچیوں کے متعلق صرف اہل عرب کے نظریات میں ہی انقلاب نہیں آیا بلکہ دنیا بھر میں بچیوں کی قدر و منزلت بلند ہوگئی۔ (23)

آج جب کہ عورت کو اس کے مقام بلند سے نیچے گرانے کی کوششیں بڑے عروج پر ہیں، ہم پر لازم ہے کہ ہم اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تعلیمات نبوی کو دل وجان سے اپنائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔

مصادر و مراجع

1 - الازہری، محمد کرم شاہ پیر: ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور 1995ء،
جلد 1 صفحہ 312

2- الازہری، محمد کرم شاہ پیر: ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، اشاعت
چہارم، ربیع الاول 1420ھ، جلد 1 صفحہ 225۔

3- نعیمی، احمد یار خاں، مفتی: تفسیر نعیمی، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، جلد 2 صفحہ 409۔

4 - سعادت علی قادری، علامہ: اچھا برتاؤ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور مارچ 2001ء
صفحہ 111۔

5- ایضاً ملخصاً صفحہ 38,37۔

6- ترمذی، ابو عیسیٰ بن عیسیٰ جامع ترمذی (موسوعۃ الحدیث الشریف الکتب الستۃ) دار السلام للنشر
والتوزیع، الریاض، طبع سوم، اپریل 2000ء۔

7- البخاری، محمد بن اسماعیل: الجامع الصحیح (موسوعۃ الحدیث الشریف الکتب الستۃ)
دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، طبع سوم، اپریل 2000ء۔

8- اچھا برتاؤ، صفحہ 49 بحوالہ کنز العمال۔

9- ابن ماجہ محمد بن یزا بن ماجہ القزوینی: سنن ابن ماجہ (موسوعۃ الحدیث الشریف الکتب الستۃ)
دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، طبع سوم، اپریل 2000ء

10- مسلم بن حجاج القشیری: الجامع الصحیح (موسوعۃ الحدیث الشریف الکتب الستۃ)
دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، سوم، اپریل 2000ء۔

11- عبدالرزاق بھتر الوی، قاضی، قرآن حدیث کی رو سے اسلام میں عورت کا مقام، مکتبہ ضیائیہ،
راولپنڈی، س ن، صفحہ 51۔

12- ولی الدین تبریزی، شیخ: مشکوٰۃ المصابیح، قدیمی کتب خانہ کراچی، س ن۔

13- البقرہ 2:228

14- ضیاء القرآن، 85/4

نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں

عورتوں کے حقوق، معاشرتی زندگی میں عورت کا مقام و مرتبہ

معاشی پیش رفت میں عورتوں کا کردار، تعلیمی کاوشوں میں عورتوں کے فرائض

عصری تقاضوں کے حوالے سے عورتوں کے مسائل اور ان کا حل

قاضی محمد غوث
چیف ایڈیٹر ماہنامہ زم زم بہاولپور

نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں

عورتوں کے حقوق، معاشرتی زندگی میں عورت کا مقام و مرتبہ

معاشی پیش رفت میں عورتوں کا کردار، تعلیمی کاوشوں میں عورتوں کے فرائض

عصری تقاضوں کے حوالے سے عورتوں کے مسائل اور ان کا حل

قاضی محمد غوث

تاریخ انسانی بتاتی ہے کہ سابقہ اور قدیم تہذیبوں میں خواتین کے حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا۔ مثلاً بابلی تہذیب میں کوئی انسان اگر کسی کو قتل کر دیتا تو اس کے جرم میں اسے پکڑنے کی بجائے اس کی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔

اسی طرح یونانی تہذیب جسے بڑے فخر سے پیش کیا جاتا ہے اس میں خواتین کو تمام حقوق سے نہ صرف محروم کر دیا گیا بلکہ مستزاد یہ کہ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اہل یونان خاتون کو غیر متمدن جنس قرار دیتے تھے اور بدکاری کے مرکز ومحور کے طور پر پیش کرتے تھے۔

رومن تہذیب جب اپنے نکتہ عروج پر پہنچی تو اس نے مرد کو یہ حق تفویض کر دیا کہ اگر وہ چاہے تو بیوی کو جان سے مار دے اور اہل مصر عورتوں کو شیطانی علامت قرار دیتے تھے۔ (1)

اسلام سے قبل عرب تمدن میں خواتین کی حیثیت

عرب معاشرت میں خواتین از حد مجبور، مقہور اور مظلوم تھیں۔ انہیں تمام برائیوں کی

جزؤ سمجھا جاتا تھا۔ ہر نوع کی فضیلت، مراتب اور مقامات مردوں کیلئے مخصوص تھے۔ عام معاملات زندگی میں اچھی چیزیں مرد اپنے لئے مخصوص کر لیتے۔ بیکار اور ردی اشیاء خواتین کے سپرد کر دیتے تھے۔ اس طرز عمل کو قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓی اَزْوَاجِنَا (الانعام:137)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دودھ خواتین کیلئے حرام تھا۔ دودھ صرف مردوں کا طبقہ ہی نوش جان کرسکتا تھا۔ اسی طرح بکری کے بچوں سے نر بچے مردوں کیلئے مخصوص ہوتے۔ بکری اگر مردہ بچہ جن دیتی تو دوڑ کر اس میں سب شریک ہو جاتے۔

ان کی اپنی خواتین اگر کسی لڑکی کو جنم دیتیں تو لڑکی پیدا کرنے پر وہ سخت غصے میں آجاتے اور اس حد تک آگے چلے جاتے کہ اپنی ہی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے۔ اس رسم قبیح کو قرآن کریم نے سورۃ النحل کی آیت نمبر 58 میں وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا اور سورۃ التکویر آیت 8،9 میں وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ کے الفاظ میں مذکور ہے۔ تفسیر طبری اور جامع البیان فی تفسیر القرآن کے مطابق قیس بن عاصم نے سید المرسلین رحمۃ للعالمین علیہ اکرم الصلوات واعلی التسلیم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بارہ بیٹیوں کے زندہ دفن کرنے کا ذکر کیا تھا۔ (2)

حقوق ملکیت سے محرومی

عرب زمانہ جاہلیت میں خواتین کے کسی چیز کے مالک بننے کا تصور ہی نہیں تھا۔ صرف مرد وارث بنتے تھے اور دلیل یہ دی جاتی تھی کہ مرد ہتھیار اٹھاتے ہیں، دشمنوں سے برسر پیکار ہوتے ہیں اور دفاعی پوزیشن سنبھالتے ہیں۔ (3)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

مالدار بیوہ خاتون کو اس خیال سے نکاح سے روک دیا جاتا کہ یہ اپنا مال

واسباب ساتھ لے جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ مجبور، مایوس، محبوس ہو کر جان آفریں کو اپنی جان سپرد کرتی یا پھر مال واسباب سپرد کر کے اپنی جان چھڑا لے جاتی۔ خواتین کو نہ صرف وراثت سے محروم کر دیا جاتا بلکہ خود خاتون کو بھی سامان وراثت کی طرح بانٹ لیا جاتا۔ (4)

زمانہ جاہلیت میں خواتین کی حیثیت روزمرہ استعمال کی اشیاء کی مانند تھی۔ جو چاہتا جتنی مقدار میں چاہتا خرید وفروخت کر لیتا۔ زمانہ جاہلیت میں شادی کے نو طریقے رائج تھے۔ جس کی تفصیل فتح الباری شرح بخاری میں علامہ ابن حجر عسقلانی ؒ نے اس طرح بیان کی ہے:-

1) تزويج البعولة
2) تزويج البدل
3) تزويج المتعه
4) تزويج الخدن
5) تزويج الضفينه
6) تزويج شعار
7) تزويج الاستبضاع
8) تزويج الرهط
9) تزويج البغايا

شادی کی ان بےہودہ اقسام میں سے صرف ایک کی تفصیل میں جانے سے اخلاق تنزلی اور اقدار انسانی کے انحطاط کا اندازہ لگایئے۔ تزویج الاستبضاع میں ایک شخص اپنی بیوی کو ایک خوبصورت مرد کے ساتھ ازدواجی تعلقات کی اجازت دیکر بھیج دیتا خود اس سے الگ رہتا تاکہ خوبصورت اولاد حاصل ہو۔ اُمید ہونے کے بعد عورت اپنے سابقہ خاوند کے

پاس واپس آجاتی۔ (5)

مغربی معاشرہ میں خواتین کی حیثیت

مغربی معاشرے میں بھی خواتین کی حیثیت اطمینان بخش تو کجا بلکہ پریشان کن ہے اور عالمی ذرائع ابلاغ اس حقیقت کو نہ چھپا سکتے ہیں نہ مٹا سکتے ہیں۔اس کا اندازہ آپ وہاں پر طلاق کی شرح سے لگا سکتے ہیں۔

سال 1996ء میں کیوبا میں طلاق کی شرح 75 فیصد رہی۔آسٹریلیا میں ایک لاکھ شادیوں میں سے 52,500 کا نتیجہ علیحدگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔فرانس میں ایک لاکھ شادیوں کے بعد 95 فیصد خواتین نے عدم تحفظ کی شکایت کی۔کم و بیش یہی صورت حال سکاٹ لینڈ اور سوئٹزرلینڈ کی ہے Statistical of USA کے مطابق امریکہ کی مختلف ریاستوں میں شرح طلاق ہر آنے والے سال ترقی پذیر رہی اور اس میں کو یہ کو اضافہ ہوا اور طلاق دی جانے والی خواتین کی عمر بیس (20) سے اُنتیس (29) سال کے درمیان رہی۔

خلاصۂ کلام

جس بھی انسانی تہذیب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے چاہے وہ رومی ہو کہ بابلی، وہ یونانی ہو یا رومن، ہندی ہو یا چینی، خواتین ہمیشہ محرومی، ظلم اور استحصال کی تصویر نظر آتی ہیں۔ پروردگار عالم نے تو اس کو احسن تقویم کا مسند نشین بنایا لیکن اس کے ساتھ چوپایوں جیسا سلوک روا رکھا گیا کہیں اس کو مٹی کی مورتیوں کے برابر درجہ دیا گیا۔کہیں اس کو جوّا بازی میں داؤ پر لگا دیا گیا۔کہیں خاوند کی میت کے ساتھ اس کو بھی چتا کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔کہیں فکر و نظر کا بزعم خویش زیادہ اثاثہ رکھنے والے فلسفیوں نے اس کو انسانیت کے درجہ سے نکال کر حیوانیت کے سپرد کر دیا۔سب سے بڑھ کر تاریخ کا المیہ ہے کہ خواتین کو نجس جانور سمجھ کر مقید رکھا جاتا تھا۔اور بعض اقوام میں تو باپ اپنی بیٹیوں کو فروخت کر دیتے تھے۔ (6)

حقوق کی بازیابی کی جدوجہد پر ایک نظر

اقتصادی ناہمواریوں پر کنٹرول' حقوق کی بازیابی' بلند معیار زندگی' انسانیت سوز مظالم سے نجات کیلئے خواتین کی فلاح کیلئے پہلا آئینی قدم 1882ء میں برطانیہ میں اٹھایا گیا جس میں خواتین کی آزادی اور حقوق کی نگرانی کیلئے یہ قرارداد منظور کی گئی۔

"خواتین اپنی مزدوری اور کمائی کی رقم اپنے اختیار سے استعمال کریں گی اور انہیں اس سلسلہ میں مکمل آزادی ہوگی۔ مرد جبر نہیں کرسکیں گے"

اس چہار سطری قانون میں خواتین کی محنت اور مزدوری کی آمدنی کا تحفظ کیا گیا ہے۔ ان کے باقی حقوق' عصمت' عظمت' تعلیم' تربیت' معاشرتی مقام' حقوق ملکیت' حسن سلوک اور عائلی مسائل پر ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔ (7)

عالمی سطح پر کانفرنسوں کا انعقاد

خواتین کے حقوق کی حمایت میں پہلی عالمی کانفرنس 1975ء میں میکسیکو میں ہوئی۔ دوسری 1980 میں کوپن ہیگن میں' تیسری 1985ء میں نیروبی میں' چوتھی کانفرنس ستمبر 1994ء کو قاہرہ میں اور پانچویں کانفرنس 1995ء میں چین کے شہر بیجنگ میں ہوئی۔

آیئے مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں منعقد ہونے والی کانفرنس پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ اس اجتماع میں 182 ممالک شریک ہوئے۔ خود امریکی نائب صدر رونق افروز محفل تھے۔ ظاہری طور پر اس کو بہبود آبادی کا عنوان اور ٹائٹل دیا گیا مگر اس کا اصل مقصد طبقہ خواتین سے تہذیب واخلاق اور عفت وعظمت کو سمیٹنا اور لپیٹنا تھا اور ان مقاصد کے حصول کیلئے 34 ارب ڈالر خرچ کئے گئے۔ کانفرنس کا ایجنڈا ایسا حیا سوز تھا کہ عالم اسلام اس پر چیخ اٹھا۔ جامعہ ازہر کے رئیس نے اس کو اسلامی خاندانی اور معاشرتی اقدار کے متضاد قرار دیا۔ سعودی عرب' سوڈان' لبنان' اردن' شام ایران اور عراق نے کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ دنیائے عیسائیت کے رہنما پاپائے روم نے شدید ترین مخالفت کی۔

مصر کے اخبار "الشہاب" نے لکھا کہ کانفرنس کے اختتامی مراحل سے ہی بے حیائی

اور فحاشی کے منصوبوں پر عمل درآمد کا آغاز ہوگیا ہے۔ روزنامہ جنگ کراچی 8/ستمبر 1994ء کے اداریتی صفحہ پر لکھتا ہے۔ قاہرہ کانفرنس کا دستورالعمل خاندان کے مسلمہ تصور کو پاش پاش کرتا ہے۔ غیر منکوحہ جوڑوں کو بھی خاندان کے مفہوم میں شامل کرلیا گیا ہے۔

ناروے کی وزیراعظم نے یہاں عریانیت' فحاشی اور مادر پدر آزاد معاشرے کی طرف سے نمائندہ تقریر کی۔ یورپی طاقتیں یہ تہیہ کیے بیٹھی ہیں کہ اسلامی معاشرہ جو عائلی اور مذہبی خطوط پر قائم ہے' اسے تباہ و برباد کردیا جائے۔ اسلامی معاشرہ میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے ذریعہ منصوبہ بندی سے جنسی برائیوں کا زہر داخل کیا جارہا ہے جو ملک اس کے خلاف آواز اٹھانے کا ارادہ کرتا ہے اسے انسانی حقوق کے تحفظ اور انہیں ترقی کے راستہ پر ڈالنے کیلئے ایک کانفرنس اقوام متحدہ کے زیر انتظام چین کے شہر بیجنگ کے انٹرنیشنل کنونشن سنٹر میں ہوئی جو 4/ستمبر سے 15/ستمبر 1995ء تک نو دن مسلسل ہوتی رہی۔ اس کا افتتاح عوامی جمہوریہ چین کے صدر جیانگ زے من نے گرینڈ کلچرل شو سے کیا۔ پاکستانی وفد کے ایک رکن نے شرماتے شرماتے سارا قصہ اس شعر میں اگل دیا۔

شام تک کھینچے لئے پھرتے ہیں اس دنیا کے کام
صبح فرش ندامت پر پڑا رہتا ہوں میں

کانفرنس کے ایجنڈے کی چار شقوں کو دیکھیے۔

1) استقاط حمل کو قانونی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

2) خاندانی منصوبہ بندی کی تمام شکلوں پر خواتین کو مکمل کنٹرول ہو۔

مزید دو شقوں کو یہاں بیان کرنے میں قلم اور زبان دونوں مکمل طور پر انکاری ہیں۔

وطن عزیز پاکستان سے بیگم مہناز رفیع نے نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک میں خواتین کی شرح خواندگی 23.3 فیصد ہے جو عالمی دنیا میں سب سے کم ہے۔ وہی

علاقوں میں حالت اور بھی قابل رحم ہے۔ باپ اور بھائی جائیداد ہضم کرنے کے چکر میں ہیں۔ اس لئے لڑکیوں کی شادی نہیں ہونے دیتے اور کچھ علاقوں میں قرآن پاک سے نکاح کی غیر شرعی رسم بھی چلی آ رہی ہے۔ ایک خرابی یہ بھی ہے کہ جائیداد اور زرعی رقبے کو خاندان کے اندر رکھنے کیلئے نوعمر لڑکوں کے ساتھ عمر رسیدہ خواتین کی شادی کر دی جاتی ہے۔ بیگم مہناز رفیع نے یہ انکشاف بھی کیا کہ بھارت میں Ultra Sound کے ذریعہ جنس معلوم کر کے لڑکیوں کو پیدائش سے قبل ہی موت کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ بھارت کے کلینک اس سہولت کی فراہمی کیلئے یہ سلوگن استعمال کرتے ہیں "500 روپے خرچ کر کے 50,000 سے نجات حاصل کیجئے جو بچی کی نگہداشت پر خرچ ہوں گے۔"

امریکی محقق مارکوس فیلڈ مین (Marcos Fieldman) نے کہا کہ ایشیائی ممالک میں مناسب اقدامات میں تاخیر کی گئی تو 2010ء تک ایسے مردوں کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ جائے گی جنہیں شادی کیلئے خواتین دستیاب نہیں ہوں گی۔ جنوبی کوریا کے انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ سوشل سائنسز (Institute of health and social sciences) کے مطابق لڑکوں اور لڑکیوں کے موجودہ تناسب کو برقرار رکھا گیا تو شادی کے اہل ہر سو افراد کیلئے ستتر (77) خواتین دستیاب ہوں گی۔

نقاد اور مبصرین نہ جانے کیوں آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں کہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں ترقی پذیر ممالک سے خواتین کو سنہرے مستقبل کا خواب دکھا کر متمول ممالک میں لایا جاتا ہے۔ بعد میں ان سے برائے نام معاوضہ، خوراک اور لباس کے عوض مشقت لی جاتی ہے اور خلیجی ریاستوں میں اس کے مظاہر دیکھے اور دکھائے جاتے ہیں، سنے اور سنائے جاتے ہیں۔

اندرون ملک وڈیرے، سیاست دان، عوامی نمائندگان اور افسر شاہی سے تعلق رکھنے والے طبقہ کی رہائش گاہوں میں کام کرنے والی خواتین کی حالت کس سے اوجھل ہے۔ اچھے

بزنس، ملازمت اور اچھے ماحول کی پروردہ خواتین جو حقوق انسانی کی بڑی علمبردار اور عالمی فورمز پر بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے کپڑے کون دھو کر استری کرتا ہے۔ جوتوں کو کون پالش کرتا ہے۔ ان کے کچن میں کھانا کون پکاتا ہے۔ ان کے بچوں کے جھولے کون جھلاتا ہے۔ صبح دم ان کے سکول بیگ کون اٹھاتا ہے۔ بنگلوں کے فرش شیشہ کی مانند کون چمکاتا ہے؟؟......غریب نوکرانیاں یہ سارے کام نپٹاتی ہیں۔

حقوق انسانی اور حقوق نسواں کیلئے کام کرنیوالی این جی اوز (NGOs) کے نمائندے اسلامی معاشرہ اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو مغربی، سیکولر اور مادر پدر آزاد معاشرے کے مد مقابل کھڑا کر کے مغربی ثقافت کی خوبیاں اور اسلامی تمدن کی خرابیاں گنواتے تھکتے ہی نہیں۔ جب دنیوی زندگی کے تمام ثمرات پر عورتوں کا بھی برابر حق ہے۔ جب عالمی دنیا میں کوئی انقلاب، کوئی تحریک خواتین کے بغیر ایک قدم آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک خاتون چولہا جھونکتی رہے۔ برتن مانجھتی رہے۔ نونہالوں کو سنبھالتی رہے۔ فرش صاف کرتی رہے اور دوسری خاتون دنیا جہان کے فوائد و ثمرات سمیٹتی رہے۔ فیشن شو میں حصہ لیتی رہے۔ مقابلہ حسن میں جسم کی نمائش کرتی پھرے۔ تہذیبی اور ثقافتی سطح پر خواتین کی نمائندگی کرنے اور ان کے حقوق کیلئے مستعد خواتین کی ذات سوالیہ نشان ہے؟؟

اسلامی معاشرہ میں خواتین کے حقوق

تخلیق انسانی کی تاریخ کے مطابق خاکدان عالم روئے زمین کائناتِ ارضی پر سب سے پہلے تشریف لانے والے ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ نسل آدم کو جاری رکھنے، اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے کیلئے، اس کی ترقی، سرفرازی اور کامرانی کیلئے حضرت آدم علیہ السلام کو اکیلا نہیں بھجوایا گیا۔ First Lady خاتون اول سیدہ حضرت حوا علیہا السلام بھی دنیا میں ساتھ ہی تشریف لائیں تو یہ جوڑا نسل انسانی کے تسلسل، ارتقاء اور ارتفاع کا ضامن

بنا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تخلیق انسانی کے مقاصد اور اس کا تاریخی تسلسل اس وقت نہ تو مکمل ہوتا ہے نہ ہی با مقصد جب تک کہ دونوں کا صحیح مقام مرتبہ اور تشخص متعین اور اجاگر نہ کیا جائے۔ اس لئے دنیا میں موجود اور مفقود الہامی اور غیر الہامی ادیان ہوں یا صرف انسانی فکر و نظر یعنی محض عقل کے نتائج میں فلسفیانہ طور پر ظہور پذیر ہونیوالے مذاہب ہوں' عورت کا ذکر کہیں تفصیلی اور کہیں بالکل مختصر موجود ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر تشریف فرما ہونے سے لیکر لمحہ موجود تک انسانی تاریخ میں سیدہ حوا' سیدہ حاجرہ' سیدہ سارہ' سیدہ صفورہ' سیدہ یوحانذ' سیدہ آمنہ' سیدہ مریم' سیدہ خدیجۃ الکبریٰ' سیدہ عائشہ' سیدہ اسماء' سیدہ فاطمۃ الزہرا' سیدہ زینب بنت علی المرتضیٰ' سیدہ خولہ بنت ضرار' سیدہ اُم عمارہ' سیدہ خنساء' سیدہ ام سلیم' سیدہ فاطمہ بنت المثنیٰ (سلام اللہ علیہن اجمعین) سے لے کر زبیدہ ہارون الرشید' رضیہ سلطانہ' چاند بی بی' فلسطین کی مجاہدہ لیلیٰ خالد' جیسی جلیل القدر' اولوالعزم اور انسانیت نواز خواتین کے نام ملتے ہیں۔

دین حق' دین فطرت' اسلام کے ظہور کے ساتھ اولین وحی کے نزول کے بعد خواتین کا کردار شروع ہو جاتا ہے۔ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سب سے پہلی مصدقہ' نبوت ہیں۔ نصیب کی بلندی دیکھئے۔ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا دروازہ کھولنے کا شرف خاتون کو حاصل ہوا ہے اور خدائے لم یزل کی زمین پر دین حق کو سینے سے لگا کر شریعت محمدی میں اولین نمازی بھی سیدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ہیں۔ یہ سعادت عظمٰی ہمیشہ کیلئے مسلم خواتین کیلئے سرمایہ افتخار ہے۔ سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے پہلی بار خواتین کو انسانی شرف سے سرفراز فرمایا۔ آپ کی تعلیمات کی برکتوں سے خواتین کو علم کی دولت سرمدی میں حصے دار بننے کا حق عطا ہوا۔ خواتین کو جن کی ہمسری کا کوئی تصور نہ تھا' صحابیہ رسول ہونے کی سند عطا ہوئی۔ ماں' بہن' بیٹی کی حیثیت سے ان کا رتبہ بلند کیا گیا۔

طلاق، خلع، نکاح، رائے، وراثت، عدت کیلئے متعینہ مدت، حق مہر، حق نفقہ، حق نسب، تعلیم کا حق، بیوہ کی قدر و منزلت کے ساتھ ساتھ سبحان اللہ یہ اسلام کا طرہ امتیاز ہے کہ اگر اس نے مردوں کو نبوت کے مقام پر سرفراز فرمایا ہے تو خواتین کو سردار ملائکہ سیدنا جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سلام بھی بھجوائے ہیں۔ صدیقہ کائنات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں وحی الٰہی نازل ہو رہی ہے۔ اولین وحی کے نزول کے بعد سیدہ خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا رسول الثقلین، نبی الحرمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسکین دے رہی ہیں۔ تصدیق بھی کر رہی ہیں۔(8) جس خاتون کا کوئی سرپرست نہ ہو حاکم وقت کو اس کا سرپرست بنایا جا رہا ہے۔(9)

سیدنا حضرت فاروق اعظم اپنی ہی بیٹی سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کر رہے ہیں۔ جلیل القدر اصحاب الرائے موجود ہیں۔ گھر میں درون خانہ کی گتھیاں اندرون خانہ ہی سلجھائی جا رہی ہیں۔(10)

یہ مذہب اسلام ہی ہے جو خواتین کو رزم و بزم، حکومت، مالیت، معیشت تمام میدانوں میں اپنا کردار ادا کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہ خاتون ہی ہے جو ماں، بہن اور بیوی کی حیثیت میں بیٹے بھائی اور خاوند کی یعنی من حیث المجموع انسان کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ انسانیت کو اس کے ارفع و اعلیٰ مقام تک لے جاتی ہے، اس کے گھریلو فرائض کی ادائیگی کی اہمیت کے پیش نظر اس کو عبادات کے نظام میں خصوصی رعایت دی گئی ہے۔ مثلاً اس کیلئے جمعہ واجب نہیں جہاد واجب نہیں۔ نماز باجماعت کی پابندی نہیں۔ محرم کے بغیر حج ساقط ہے۔(11)

قرآن مجید فرقان حمید میں پوری ایک سورۃ نازل فرما کر اس کا نام سورۃ النساء رکھا گیا اور اس میں نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے اصول و ضوابط بیان کئے گئے ہیں۔ سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر 35 میں اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ

وَالْمُؤْمِنَاتِ ......الخ. میں دس انسانی صفات کو بیان کر کے ایک حصے کا ترجمان مرد اور دوسرے کی نمائندگی خواتین کو سونپی گئی ہے۔ ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (النساء:1) فرما کر خاتون اور مرد دونوں کو تخلیق میں برابر حصے دار قرار دیا گیا۔

رہنمائے کاروان انسانیت علیہ التحیہ والسکینت نے اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّهَاتِكُمْ فرما کر جنت کو والدہ کی عزت و احترام اور خدمت گذاری کے ساتھ مشروط کر دیا۔

اسی حقیقت کو نپولین بوناپارٹ نے ان الفاظ میں ٹرانسلیٹ کیا:

"Give me good mothers and I Will give you good nation".

اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ افراد کی تیاری نشو و نما اور ذہنی تربیت میں ماں کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ماں گھریلو ریاست کی سربراہ ہے اور بچے اس ننھی منی ریاست کے باشندے ہوتے ہیں۔ اس ریاست کے قواعد و ضوابط اور اصول و دستور کی پابندیوں کے خوگر ہو کر ان میں وہ صلاحیت اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ کے ذمہ دار اور باوقار فرد بن کر اپنا کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ ہر ماں کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بچے سچے مسلمان اور اچھے انسان ثابت ہوں۔ باطن کی دنیا ماں روشن کر دے تو باہر کی دنیا میں بھی اجالے پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

جمیل الشیم، شفیع الامم، صاحب الجود والکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے خواتین کی تعلیم و تربیت کو اہمیت دیتے ہوئے انہیں مسجد نبوی میں درس سننے کی اجازت فرمائی۔ ہفتہ میں ایک دن خواتین کی تعلیم و تربیت کیلئے مخصوص فرمایا۔ چنانچہ اس تعلیم نبوی کے نتائج کس قدر فقید المثال اور حوصلہ افزا نکلے کہ صدیقۂ کائنات سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے تقریباً دو ہزار دو سو دس (2210) حدیثیں کتب احادیث میں جگمگا رہی ہیں۔ سیدہ

عائشہ رضی اللہ عنہا حج کے زمانہ میں دو پہاڑوں کے درمیان خیمہ لگاتیں اور مخلوق خدا ان کی تبلیغ و تدریس سے فیض حاصل کرتی۔ حتیٰ کہ جلیل القدر صحابہ آپ سے استفادہ کرتے۔ سیدنا عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ معانی قرآن' احکام حلت و حرمت' علم الانساب اور عرب شعراء کے کلام میں سیدہ کی معلومات مثالی تھیں۔ لخت جگر رسول سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا قرآن و حدیث کے ساتھ علم عروض کی ماہر تھیں۔ سیدہ زینب بنت علی رضی اللہ عنہما کی خطیبانہ للکار سے یزیدیوں کا پانی پتہ ہوتا تھا۔ سیدہ سکینہ بنت حسین رضی اللہ عنہما کا گھر علماء و فقہاء شعراء' ادباء کی مجالس کا مرکز تھا۔ حضرت اُم دردا رضی اللہ عنہا کے علم و فضل سے امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ نے صحیح بخاری میں استدلال فرمایا ہے۔

امام مالک امام دارالہجر ۃ کی صاحبزادی کا حافظہ اس قدر مضبوط تھا کہ وہ اپنے کمرے سے سن کر بتادیتیں کہ مؤطا امام مالک صحیح پڑھی جارہی ہے یا غلط۔ (12)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ عائشہ کے شاگردوں میں امام مالک کا نام نامی اسم گرامی چمک رہا ہے۔ (13)

سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کی پوتی سیدہ نفیسہؒ سے امام محمد بن ادریس شافعیؒ نے علم حدیث حاصل کیا۔ (14)

سیدہ صفیہ' سیدہ ام حبیبہ اور سیدہ فاطمہ بنت قیس کے فتاویٰ تاریخ فقہ میں محفوظ ہیں۔ (15)

سائب ابن جندب کی بیوہ بہترین کاشت کاری کرتی تھیں۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا گھوڑے کی سواری کرتی تھیں۔ چارہ کاٹ کرلاتی تھیں۔ قیس بن شماس کی اہلیہ باغبانی میں مہارت رکھتی تھیں۔ طبقہ خواتین کے لئے حصول علم کے ساتھ معاشی جدوجہد میں شرکت کی ہر دور میں حوصلہ افزائی کی گئی۔

تحریک آزادی کی جدوجہد میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح' بیگم رعنا لیاقت علی

خاں اور بیگم سلمیٰ تصدق حسین کی خدمات فراموش نہ کی جا سکیں گی حتیٰ کہ آزادی کے بعد سول سیکرٹریٹ پر وطن عزیز کا سبز ہلالی پرچم لہرانے والی بھی ایک خاتون محترمہ ہی تھیں۔

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں ہم آسانی سے اس نتیجہ پر آ پہنچتے ہیں کہ شریعت اسلامی زندگی کے تمام شعبوں میں خواتین کو اپنی فطری صلاحیت کے مطابق فعال ہونے کی اجازت دیتی ہے اور حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے۔

مصادرومراجع

(1) ڈاکٹر عبدالکریم' عورت کا مقام و مرتبہ' فیملی میگزین 12 تا 18/ اکتوبر 2003ء

(2) پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری' الحقوق الانسانیۃ فی الاسلام' ص 359

(3) امام جعفر محمد بن جریر الطبری' متوفی 311 ہجری' جامع البیان

(4) فتح الباری شرح بخاری کتاب النکاح 30/ 66' کتاب النکاح علی ابن حجر عسقلانی شافعی متوفی 852ء

(5) مولانا عبدالماجد دریا آبادی' تفسیر ماجدی' ص 185

(6) خطبات سید زوار حسین شاہ مطبوعہ ادارہ مجددیہ 2/5 ناتھ ناظم آباد کراچی' ص 239

(7) ماہنامہ زم زم اکتوبر 1995ء ص 7' 8

(8) تہذیب الاسماء' ص 170

(9) ابوداؤد' کتاب النکاح

(10) الاستیعاب فی اسماء الاصحاب' ص 212

(11) ابوداؤد' بخاری شریف

(12) محسن نسواں' خطبات بین الاقوامی سیرت کانفرنس 1986ء اسلام آباد' ص 131

(13) تہذیب التہذیب' جلد 12' ص 73

(14) ابن خلکان' ص 130

(15) ماہنامہ زم زم بہاولپور' جنوری 2006ء ' ص 11

سیرت طیبہ کی روشنی میں عورت کا مقام اور دائرۂ کار

پروفیسر شہباز احمد چشتی
چیف ایڈیٹر
ماہنامہ وائس آف ضیاء الاسلام گجرات

سیرت طیبہ کی روشنی میں عورت کا مقام اور دائرۂ کار

پروفیسر شہباز احمد چشتی

اسلام وہ واحد دین ہے جو صرف مذہبی معاملات میں ہی رہنمائی فراہم نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں کامل ہدایات سے نوازتا ہے۔ اسلام جس ضابطہ حیات کا درس دیتا ہے اس کی رو سے ہر مسلمان چاہے مرد ہو یا عورت' چند مخصوص ذمہ داریوں اور فرائض کو ادا کرنے کا پابند اور چند حقوق و مراعات حاصل کرنے کا مستحق ہے۔

ویسے تو معاشرے میں عورت کے مقام کا موضوع صدیوں سے موضوع گفتگو ہے لیکن ماضی قریب میں ان موضوعات نے خاصی سنجیدہ صورت اختیار کر لی ہے اور بعض مسائل کے حوالے سے تو صورت حال خاصی پیچیدہ ہو چکی ہے۔

عورت کی سیاسی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں شرکت ایسے موضوعات ہیں جن پر میڈیا میں بھی بالعموم بحث جاری رہتی ہے۔ قبل اس کے کہ سیرت طیبہ کی روشنی میں مسلمان عورت کے مقام و مرتبہ سے آگاہی حاصل کی جائے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ دیگر مذاہب اور ثقافتوں میں عورت کا مقام و مرتبہ کیا تھا اور اسلام نے اسے کن خوبیوں اور کمالات سے نوازا ہے کیونکہ جب تک کسی چیز کا تقابل نہ کیا جائے دوسری چیز کا حسن نکھر کر سامنے نہیں آ سکتا۔

یہ فقط دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ اسلام جدید معاشرے کی

عورت کو بھی وہی حقوق، عزت ووقار، عزتِ نفس اور پاکی وطہارت عطا فرماتا ہے جو اس نے زمانہ قدیم کی عورت کو عطا کر کے اسے زمین کی پستیوں سے اٹھا کر اوج ثریا تک پہنچا دیا۔

یہودیت اور عورت

یہودی مذہب کے پیروکاروں نے بھی الہامی ہدایات کا چہرہ مسخ کر کے عورت کے بارے میں ایسے رجحان کو پروان چڑھایا جو کسی طور پر بھی عدل وانصاف کے تقاضوں سے مناسبت نہیں رکھتا۔ یہودی مذہب کے مطابق مرد نیکی کا پتلا ہے جبکہ عورت برائی کا مجسمہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام بذات خود جنت کی نعمتوں میں تھے مگر حوا نے انہیں خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کیا۔ عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے خدا نے آدم علیہ السلام سے ممنوعہ پھل کھانے کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جس عورت کو تو نے میرا ساتھی بنایا ہے اس نے مجھے دیا اور میں نے کھایا چنانچہ اس سزا میں خدا نے عورت کو حمل اور ولادت کی تکلیف میں ڈالا۔ (1)

یہودی قانون میں مرد وارث کی موجودگی میں عورت وراثت سے محروم رہتی ہے اور اسے دوسری شادی کرنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ عہد نامہ قدیم کی عبارت کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:۔

> ”جو کوئی خدا کا پیارا ہے جو اپنے کو عورت سے بچائے گا ہزار آدمیوں میں سے میں نے ایک خدا کا پیارا پایا ہے لیکن تمام عالم کی عورتوں میں ایک عورت بھی نہیں پائی جو خدا کی پیاری ہو۔ (2)

عورتوں کے لئے ایک یہودی ربی کا کہنا تھا کہ عورت کو تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہئے اس کی مغفرت اسی میں ہے کہ وہ خاموشی سے بچے جنتی رہے۔

سینٹ پال نے کہا: ”مرد کو عورت پر اس لئے بھی فوقیت حاصل ہے کہ خدا نے آدم کو پہلے پیدا کیا اور حوا کو بعد میں تخلیق کیا“۔

عیسائیت اور عورت

مسیحیت نے بھی عورت کو اپنے معاشرے سے خارج کر دیا تھا اور عورت سے نفرت کا بیج بو کر اپنے معاشرے کی تشکیل کا پروگرام مرتب کیا۔ کلیسا کی یہی زیادتیاں تھیں جنکی وجہ سے بڑے بڑے پادریوں نے عمر بھر اپنی ماؤں کی شکل نہیں دیکھی کیونکہ وہ عورت کو برائی کا پیکر اور گناہ کی مشین سمجھتے تھے۔

سینٹ پال نے تیمتھیس کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

"عورت کو چپ چاپ کمال تابعداری سیکھنی چاہیئے میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے یا مرد پر حکم چلائے بلکہ خاموش رہے کیونکہ پہلے آدم بنایا گیا پھر حوا بنائی گئی اور آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ حوا فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی"۔(3)

عیسائیت کے ابتدائی دور کی ایک بہت بڑی مذہبی شخصیت ترتولیون (Tritulion) عورت کے متعلق یہ نظریہ ظاہر کرتے ہیں:-

"وہ شیطان کا دروازہ، وہ شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی' خدا کے قانون کو توڑنے والی اور خدا کے خلاف ورغلانے والی تحریش اور مرد کو غارت کرنے والی ہے"۔

مسیحی فضلاء میں سے سینٹ پال، سینٹ آگسٹائن اور دیگر مشائخ کلیساء کے خیالات میں بھی عورت شیطان کا آلۂ کار مجسمۂ بدی اور خواہشات نفسانی کا مبدأ ہے۔ بائبل میں آدم وحوا کے قصے کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ حوا کو شیطان نے بہکایا اور پھر اس نے آدم کو۔(4)

بدھ مت اور عورت

بدھ مذہب کے تاریخی مطالعہ سے عورت کو کوئی باعزت مقام حاصل ہونے کا

ثبوت نہیں ملتا۔ اسکے برعکس عورت سے نفرت اور اس کی تذلیل وتحقیر کے ثبوت ملتے ہیں۔
بدھ مت میں عورت کے متعلق نظریات کا ایک نمونہ ''انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (Encyclopaedia of Religion and Ethics) کے مقالہ نگار نے ایک بدھ مفکر چھلا واگا (Chulla Vagga) کے قول سے پیش کیا ہے جسے اولڈ برگ نے اپنی کتاب بدھا (Buddha) (مطبوعہ 1904ء صفحہ 149) میں نقل کیا ہے کہ:

''پانی کے اندر مچھلی کی نا قابل فہم عادتوں کی طرح عورت کی فطرت بھی ہے اس کے پاس چوروں کی طرح متعدد حربے ہیں اور سچ کا اس کے پاس گزر نہیں ہے۔ (5)

انہی خیالات کا عکس گوتم بدھ کی تعلیمات وتلقینات میں بھی ملتا ہے کہ گوتم بدھ نے اپنے معتقدین کو حکم دیا کہ ''اگر تم نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنی عورتوں سے تعلقات منقطع کر لینے چاہئیں چنانچہ موصوف خود بھی اس پر عمل پیرا ہوئے اور انہوں نے اپنی چہیتی بیٹی کو چھوڑ کر پہاڑوں میں سکونت اختیار کی تھی۔

ہندو مذہب اور عورت

نامور محقق عباس محمود عقاد ہندو معاشرے میں عورت کے مقام سے بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

''ہندوستان میں منو (جو ہندوستان کے معاشرتی وعائلی قوانین کا ماخذ سمجھا جاتا ہے اسے ''منوسمرتی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے ''منوسمرتی'' ہندوستان کی سب سے قدیم قانون کی کتاب سمجھی جاتی ہے اکثر محققین کا خیال ہے کہ اس کتاب کا زمانہ تالیف تیسری صدی عیسوی ہے' اس) قانون کے مطابق باپ، شوہر یا دونوں کی صورت میں بیٹے سے علیحدہ عورت کا کوئی مستقل حق نہیں۔ چنانچہ عورت صغرسنی میں باپ کی مطیع ہوتی ہے جوانی

میں شوہر کی اور شوہر کے بعد اپنے بیٹوں کی، اگر بیٹے بھی نہ ہوں تو اپنے اقرباء کی۔ معاشی معاملات میں اس کی حق تلفی سے زیادہ سخت امر یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے ساتھ ہی اس کا بھی مرجانا اور چتا پر ''ستی'' ہوجانا ضروری تھا۔ یہ قدیم رسم برہمنی تمدن کے دور سے سترہویں صدی عیسوی تک برقرار رہی اور اسکے بعد مذہبی حلقوں کی ناپسندیدگی کے باوجود اسے حکومت ہند کے سرکاری حکم کے تحت ممنوعہ قرار دیا گیا۔ ہندوؤں کے قانون کے مطابق تو تقدیر، طوفان، موت، زہر اور زہریلے سانپ بھی اتنے خراب نہیں جتنی عورت بری ہے''۔

چانکیہ برہمن جس نے ہندوستان کی مقنن منو مہاراج کی ''منوسمرتی'' کو حشو وزوائد سے پاک کیا، عورت کے متعلق لکھتا ہے:۔

''جھوٹ بولنا، بغیر سوچے سمجھے کام کرنا، فریب، منافقت، طمع، ناچاقی اور بے رحمی یہ عورت کے کرداری عیوب ہیں''۔

امریکہ سے ایک خاتون صحافی طیبہ ضیاء لکھتی ہیں:۔

''زمانہ قدیم میں ہندوستان میں مادرانہ نظام قائم تھا شوہر بیاہ کر بیوی کے گھر جاتا۔ اس میں طلاق بہت آسان ہوتی تھی ایک وقت آیا جب مادرانہ نظام دم توڑ گیا اور عورت عمر بھر کے لئے خود کو شوہر کے لئے وقف کر دیتی اس طرح عورت کا سماجی رتبہ بالکل ختم ہوگیا۔ جو عورت شوہر کی چتا پر جل جاتی وہ پاک باز سمجھی جاتی تھی۔ ہندو تاریخ کی کتب میں ستی کی پہلی رسم 510ء میں ملتی ہے۔ ہندو معاشرہ میں عورت کی آزادی انگریز کے زمانہ میں ہوئی اور ستی کی رسم پر پابندی لگائی۔ (6)

عورت اور عہد جہالت

اسلام سے قبل عرب کے معاشرے میں عورت کا مقام بڑا ہی فروتر تھا۔ عہدِ جاہلیت میں عورت کو صرف مرد کے نفسانی جذبات اور ذاتی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور لڑکی کی پیدائش کو ذلت و عار کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:۔

''جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ اسے بڑی بری خبر خیال کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دوسروں کے سامنے آنے سے شرم کرتا ہے اور سوچتا ہے کیا میں اسے ذلت کے لئے زندہ رہنے دوں یا زمین میں گاڑ دوں' یاد رکھو وہ جو بھی فیصلہ کرتے ہیں بہت برا ہے۔ (7)

مشہور ہندو سیرت نگار سوامی لکشمی پرشاد ''معصوم بچیاں تکبر کی قربان گاہ پر'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:۔

''عربوں کو اپنی شجاعت و بہادری پر بڑا ناز تھا ان کی طبیعت بڑی غیور تھی وہ کسی دوسرے انسان کے آگے واجب طور پر جھکنے کے خیال کو بھی سراپا استحقار سے ٹھکراتے تھے۔ یہ غلط وقار ان کے صفحہ دماغ پر ایک نقش حقیقت بن کر ثبت ہو گیا تھا جسکے آگے انہوں نے اس عورت کی حفاظت کو بھی جس کے گلشن شباب کو وہ اپنی ہوس کارانہ دست برد کے لئے سامان نشاط سمجھتے تھے' پس پشت ڈال دیا تھا۔ بساط ہستی کی نو وارد جیتی جاگتی معصوم بچیوں کا گلا گھونٹ دینا' انکی اتنی جہالت کا' جو شجاعت کے غلط استعمال نے ان کے قلب پر مستوی کر دی تھی' ایک ادنٰی کرشمہ تھا۔ پانچ پانچ، سات سات سال کی نو عمر پھول جیسی بچیوں کو کھلا پلا کر اور خوبصورت کپڑوں میں باہر

لے جا کر کسی گڑھے میں دھکیل کر پیوند زمین کر دینا ان کے ظلم وستم کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ (8)

معروف فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤلی بان اپنی تصنیف میں لکھتا ہے کہ

"عورتوں پر اور ان کی حالت پر اسلام کے اثر کے دریافت کرنے کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ قبل از اسلام ان کی حالت کیا تھی؟ جو برتاؤ عوروں کے ساتھ قبل از اسلام ہوتا تھا اس کا پتہ ہمیں قرآن کے بعض احکام ونواہی سے بھی ملتا ہے"۔ (9)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں عربوں کی دختر کشی کی رسم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے بیٹی کو زندہ درگور کیا وہ قیس بن عاصم تھا۔ (10)

قیس بن عاصم جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے نے ایک موقع پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ میں نے عہد جاہلیت میں بارہ یا تیرہ بیٹیوں کو زندہ درگور کیا تھا۔ (11)

اسی طرح امام ابو عبداللہ دارمی المتوفی 255ء نے عہد جاہلیت میں عربوں کے لڑکیوں کے ساتھ بدسلوکی کے واقعات کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے کہ جب عرب قبائل اسلام قبول کر لیتے تو بعد ازاں وہ بڑے دردناک انداز میں اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبل از اسلام کے واقعات بتاتے جن میں انکی اپنی بچیوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کی منظر کشی ہوتی جسے سن کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت پریشان ہو جاتے۔ (12)

اسلام اور عورت

اسلام نے عورت کو سماجی اور تمدنی حوالے سے ان رفعتوں اور عظمتوں سے نوازا

ہے جس کا اس نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ آفتابِ اسلام کی ضیاء بار کرنوں نے عورت کے حوالے سے انسانیت کے تصورات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ مسلمان مؤرخین اور اہل علم نے اسلام میں عورت کے مقام و مرتبہ پر تو بڑا وقیع کام کیا ہے۔ تاہم ذیل میں چند غیر مسلم اصحابِ دانش کے حوالہ جات نقل کر رہا ہوں جنہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے وقارِ نسواں میں اس قدر اضافہ فرمایا کہ حورانِ جنت بھی مسلمان عورت کے مقام پر رشک کرنے لگیں۔

چنانچہ ای ڈرمنگھم لکھتا ہے۔

"اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے عربوں کی زندگی بدل دی تھی اس سے پہلے طبقہ نسواں کو بھی وہ احترام حاصل نہ ہو سکا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے انہیں حاصل ہوا، جسم فروشی، عارضی شادیاں اور آزادانہ محبت ممنوع قرار دے دی گئیں۔ لونڈیاں اور کنیزیں جنہیں اس سے قبل محض اپنے آقاؤں کی دل بستگی کا سامان سمجھا جاتا تھا۔ وہ حقوق و مراعات سے نوازی گئیں۔ (13)

اسی طرح ای پلائیڈن کا بیان ہے:

"سچا اور اصل اسلام جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے اس نے طبقہ نسواں کو وہ حقوق عطا کئے جو اس سے پہلے اس طبقہ کو تاریخ انسانی میں نصیب نہیں ہوئے تھے"۔ (14)

اسلام نے عورتوں کو جن حقوق اور مراعات سے نوازا ہے ذیل میں ان حقوق کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

عورت کے معاشی حقوق اور معاشی پیش رفت میں عورت کا کردار

اسلام نے عورتوں کو ایسے معاشی حقوق سے نوازا ہے جن کی بدولت ایک مسلمان عورت عزت نفس کے ساتھ اپنی زندگی کے شب و روز بسر کرسکتی ہے۔ اسلام نے بنیادی طور پر معاش کی ذمہ داریاں مرد کو سونپی ہیں۔ ایک مرد اپنے خاندان کی معاشی ضروریات کا کفیل اور ذمہ دار ہے۔ اسلام نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل عورت کو ان معاشی حقوق سے نوازا ہے جن کے بارے میں آج مغرب میں تحریکیں اٹھ رہی ہیں۔ مثلاً اسلام میں ایک عاقل و بالغ لڑکی جائیداد کی مالک بن سکتی ہے اور اس کی خرید و فروخت کرسکتی ہے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا نہ ہو۔ وہ اپنے مال کے بارے میں مرد کی طرح آزادانہ فیصلے کرنے کی مجاز ہے۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ بیوی چاہے کتنی ہی مالدار کیوں نہ ہو جائے روٹی، کپڑا اور مکان کی ذمہ داری شوہر کے کندھوں پر ہے۔ اسی طرح طلاق یا علیحدگی کی صورت میں عدت کے دوران بیوی کے نفقے کا ذمہ دار بھی مرد ہے اور بچوں کے اخراجات برداشت کرنا بھی مرد کی ذمہ داری ہے۔ اسلام میں حق مہر کا مستحق بھی عورت کو قرار دیا گیا ہے اس سلسلہ میں حق مہر کی زیادہ سے زیادہ رقم مقرر نہ کرکے عورت کے معاشی حقوق کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو دیگر ثقافتوں کے برعکس اسلام میں عورت کو زیادہ معاشی تحفظ فراہم کیا گیا ہے کیونکہ فکر معاش کی بنیادی ذمہ داری سے عورت کو مستثنیٰ رکھ کر مرد کو پابند کیا گیا کہ وہ عورت کی ضروریات کو پورا کرے لیکن اگر عوت یہ سمجھے کہ اسے خود اپنے قدموں پر کھڑے ہونا ہے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ کیونکہ جہاں تک عورتوں کی معاشی پیش رفت کا تعلق ہے تو اسلام میں کہیں بھی عورت کو معاشی تگ و دو سے منع نہیں کیا گیا تاہم اس کی معاشی سرگرمیوں کی چند حدود کا تعین کر دیا ہے تاکہ کوئی اس کے تقدس و طہارت پر حرف گیری نہ کرسکے۔ ایک حقیقی اسلامی معاشرے میں عورت طب یا میڈیکل سائنس کا شعبہ اختیار کرسکتی ہے جس کا ثبوت ہمیں عہد نبوی کی چند مسلم خواتین کے کردار سے بھی ملتا ہے کہ بعض خواتین جنگوں میں

زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور انکی نگہداشت کا فریضہ بھی سرانجام دیتی تھیں چنانچہ عصر حاضر میں خواتین کے علاج معالجے کے لئے نرسوں اور لیڈی ڈاکٹرز کی ضرورت ہے۔ اسی طرح خواتین تعلیم کے شعبے سے بھی وابستہ ہوسکتی ہیں۔ ٹیچرز، لیکچررز اور پروفیسر بن کر نونہالانِ وطن کو علم کے نور سے منور کرسکتی ہیں لیکن عہد حاضر میں حقوق نسواں کی نام نہاد تنظیمیں جس طرح عورت کو ''کمرشل ازم'' کا شکار کر کے اسے جنسی تسکین اور تجارتی اشیاء کی فروخت کا سستا ذریعہ بنا کر پیش کر رہے ہیں اسلام اس کی کسی طور پر بھی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ عورت کی بے لگام معاشی سرگرمیوں کی وجہ سے گھر کا سکون تباہ ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان اختلاف رونما ہونے لگتے ہیں۔ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت نہیں ہوتی۔ مغربی ممالک کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ عورت کی بھرپور معاشی جدوجہد سے گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت کی آمدن زیادہ اہم ہے یا خاندان کی تعلیم و تربیت، جس کی تمام تر ذمہ داری عورت کے کندھوں پر ہے؟ اسلام نے ذمہ داریوں کی تقسیم کا نظام متعارف کروا کر عورت کے مزاج، صحت اور فطرت کے مطابق اسے فرائض سونپے ہیں، جبکہ محدود دائروں میں اسے معاشی پیش رفت کی بھی اجازت دی ہے۔ اسلام اختلاط مردوزن کی اجازت نہیں دیتا لیکن بدقسمتی سے آج کا معاشی نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اختلاط مردوزن کو سماج کی ضرورت نہیں بلکہ سب سے بڑی خوبی تصور کرتے ہیں جس کے نتیجے میں خاندان کا نظام شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ اسلام ہی ہے جس نے افراط و تفریط سے پاک ایک ایسا خاندانی نظام متعارف کروایا ہے جس میں مسلمان عورت کی معاشی ضروریات کی کفالت کا اہتمام بھی ہے اور اس کی ذات، صحت، وقار اور پاک دامنی کی حفاظت کی ضمانت بھی ہے۔

خواتین کے لئے اسلامی حقوق بمقابلہ مغربی حقوق

اسلام نے اس کائناتی تاریخ میں سب سے پہلے عورتوں کو ان کے حقوق سے نوازا

ہے جس کے بارے میں صدیوں بعد مغرب کے معاشروں میں احساس وشعور پیدا ہوا مثلاً 1881ء تک برطانیہ میں عورت کو جداگانہ حق جائیداد حاصل نہیں تھا۔ جبکہ 1881ء میں جا کر برطانیہ' جس کو جمہوریت کی ماں کہا جاتا ہے' نے The married women Act پاس کیا جس کی رو سے شادی شدہ خواتین کو حق جائیداد دیا گیا۔ جبکہ اسلامی معاشرے میں چودہ سو سال قبل قرآن مجید کی زبان میں یہ اعلان کیا جارہا تھا ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ کہ جائیداد میں جس طرح مرد کا حق ہے اسی طرح عورت کا بھی حق ہے۔ اسی طرح مسلمان بچی پیدائش کے وقت سے ہی جائیداد کی حق دار بن جاتی ہے۔

اس حوالے سے نامور محقق پروفیسر کرشنا راؤ اپنی کتاب ''اسلام کے پیغمبر'' میں لکھتا ہے:۔

> ''اسلام کی یہ جمہوری روح جس نے عورتوں کو مردوں کی غلامی سے نجات دلائی۔ عربوں کی مضبوط روایت یہ تھی کہ وارث صرف وہی ہوسکتا ہے جو برچھے سے کھیل سکے اور تلوار استعمال کر سکے لیکن اسلام کمزور جنس کا دفاع کرتا ہے اور عورت کو ماں باپ کے ورثے سے حصہ دیتا ہے۔ اسلام نے صدیوں قبل عورت کو جائیداد رکھنے کا حق دیا۔ اسلام میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ عورتیں اپنے تسلیم شدہ حقوق سے محروم نہ ہوں''۔ (15)

اسی طرح امریکہ میں جو انسانی اور نسوانی حقوق کا نام نہاد ٹھیکیدار ہے 1925ء تک عورتوں کو حق رائے دہی حاصل نہ تھا۔ عورت نہ تو ووٹ کاسٹ کرسکتی تھی اور نہ ہی پارلیمنٹ کی ممبر بن سکتی تھی لیکن اسلام میں بالغ عورت کو رائے دہی کا حق اور مکمل آزادی دی گئی ہے۔ اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ خلیفہ ثانی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنی مجلس شوریٰ (Consultative Body or Parliament) میں حق مہر کی زیادہ سے زیادہ رقم کی تخصیص کا ایک بل پیش کیا تھا' ایک مقتدر عالمہ خاتون نے اٹھ کر اس بل کو چیلنج کر دیا اور دلائل دیتے ہوئے عرض کی: اے عمر! اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں

عورتوں کے حق مہر کے حوالے سے ''قِنطَارًا'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم عورتوں کو بطور مہر ڈھیروں ڈھیر بھی دے چکو تو واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ اے عمر! آپ اپنی رائے سے قرآن کے مطابق حکم کو قید نہیں کر سکتے۔

اسلامی معاشرے میں رائے کی آزادی عورتوں کے حقوق کے تحفظ اور فریق مخالف کی رائے کے احترام کا یہ عالم تھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھرے مجمع میں فرمایا:

''قَدْ اَخطَأَ اِمْرَأٌ وَاَصَابَتْ اِمْرَأَةٌ'' تحقیق ایک مرد سے غلطی ہو گئی ہے اور ایک عورت حق پر ہے۔ اس عورت کی وجہ سے آج تک اسلامی تاریخ میں حق مہر کی تخصیص کا بل پاس نہیں ہو سکا بلکہ حق مہر کو مرد کی معاشی حالت کے مطابق مقرر کرنے پر منحصر رکھا گیا ہے۔ ان حقوق کے علاوہ بیسیوں ایسے حقوق ہیں جن کے بارے میں مغرب کو ابھی شعور بھی حاصل نہیں ہوا تھا اور اسلامی معاشرے کی خواتین ان حقوق سے مستفیض ہو رہی تھیں۔

مغرب میں ابتداءً عورت کو گواہی دینے کے حق سے بھی محروم رکھا گیا تھا۔ یہودی ربی حضرات بیسویں صدی میں غور و فکر کر رہے تھے کہ عورت کو گواہی دینے کا حق ہونا چاہئے یا نہیں جبکہ اسلام ڈیڑھ ہزار سال قبل سے عورت کو گواہی دینے کا حق عطا فرما چکا ہے۔

مغرب کے معاشروں میں عورت کے کردار پر انگلی اٹھانا قابل سزا جرم نہیں ہے جبکہ اسلام کے معاشرے میں جو لوگ پاکدامن عورتوں پر برائی کی تہمت لگاتے ہیں اور پھر اس کو ثابت نہیں کر سکتے تو ان کے لئے اِسّی (80) کوڑوں کی سزا مقرر ہے۔ (16)

ان دلائل سے صاحب عقل آدمی خود نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ مغرب عورتوں کے حقوق کا زیادہ محافظ ہے یا اسلام؟ اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو ہر ذی شعور یہ فیصلہ کرے گا کہ اسلام نے عورتوں کو جن حقوق سے نوازا اس کا عشر عشیر بھی مغرب کی عورتیں حاصل نہیں کر سکیں۔

تعلیمی کاوشوں میں عورتوں کے فرائض

اسلام نے مردوں اور عورتوں کو یکساں طور پر حصول علم کی تاکید فرمائی بلکہ دین و دنیا کے بنیادی مسائل کا علم مردوں اور عورتوں کے لئے فرض قرار دیا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:۔

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ"

ترجمہ: علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے لئے چند دن مخصوص تھے جن میں آپ انہیں دین و شریعت کی بنیادی باتوں سے آگاہی بخشتے تھے اور دورِ صحابہ میں ہمیں متعدد عالم خواتین کی مثالیں نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنے جاندار علمی کردار سے مسلم معاشروں سے جہالت کے اندھیروں کو دور کیا۔ سب سے اہم مثال سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہے آپ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہونے کی حیثیت سے ام المؤمنین ہیں۔ آپ سے خلفائے راشدین اور بیشتر صحابہ کرام نے علمی استفادہ کیا۔ آپ کے ممتاز ترین شاگرد عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:۔

"میں نے تفسیرِ قرآن، فرائض، حلال و حرام، ادب و شعر اور تاریخ و ادب کا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں دیکھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ علوم دینیہ کی عالمہ تھیں بلکہ دیگر علوم مثلاً طب پر بھی انہیں ماہرانہ دسترس حاصل تھی"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں آنے والے وفود جب آپ ﷺ سے گفتگو کرتے تو آپ اس گفتگو سے حاصل ہونے والی معلومات کو ذہن نشین کر لیتیں۔ سیدہ عائشہ کو علم ریاضی سے بھی دلچسپی تھی۔ متعدد صحابہ کرام میراث کے مسائل آپ سے پوچھتے

اور آپ انہیں ہر وارث کے حصے نکال کر بتاتیں۔ متعدد مسائل میں آپ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بھی راہنمائی فرمائی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے تقریباً دو ہزار دو سو دس (2210) احادیث مروی ہیں۔

سیدنا ابو موسیٰ اشعری جو خود بہت بڑے عالم تھے' فرماتے ہیں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی مسئلے کے بارے میں علم نہ ہوتا تو ہم سیدہ عائشہ صدیقہ سے دریافت کرتے وہ ہماری صحیح راہنمائی فرماتیں۔ آپ سے اٹھاسی (88) علماء نے مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کی چنانچہ تاریخ میں آپ کو ''استاد الاساتذہ'' کا مقام حاصل ہے۔ سیدہ عائشہ کے علاوہ بھی متعدد صحابیات کے علم و فضل کا پتہ چلتا ہے۔

ام المؤمنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو بھی علم فقہ (Islamic law) میں مہارت حاصل تھی۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول وہ اپنے وقت کی بہت بڑی عالمہ خاتون تھیں۔ اسی طرح ام المؤمنین سیدہ ام سلمٰی رضی اللہ عنہا کے بارے میں ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ بتیس (32) علماء نے آپ سے تعلیم حاصل کی۔

سیدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن کسی مسئلہ پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی آپ سے سارا دن بحث ہوتی رہی لیکن وہ سیدہ فاطمہ بنت قیس کو غلط ثابت نہ کر سکے۔

سیدنا انس کی والدہ اُم سُلیم رضی اللہ عنہا بھی بہت بڑی عالمہ تھیں اور دعوت میں خصوصی مہارت رکھتی تھیں۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی پوتی سیدہ نفیسہ رحمۃ اللہ علیہا کے بارے میں منقول ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح سیدہ ام الدرداء رضی اللہ عنہا جو مشہور صحابی سیدنا ابو درداء کی والدہ تھیں انہیں علوم عقلیہ پر کمال حاصل تھا۔ ان کے علم و فضل کی گواہی امام بخاری جیسے محدث و عالم نے بھی دی ہے۔ (17)

خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی بودان کی بہن فخر النساء بغداد کی جامع مسجد میں بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب کرتی تھیں ادب، بیان، بلاغت اور شاعری میں انہیں ممتاز ترین مقام حاصل تھا۔ وہ کئی جنگوں میں شریک ہوئیں اور مردوں کے شانہ بشانہ لڑیں۔

اسلامی تاریخ میں ولادہ بنت المستکفی کا نام بڑا مشہور ہے جو اسپین کے امراء میں سے ایک کی صاحبزادی تھیں۔ بادشاہوں کی طرح ان کے علمی وادبی دربار منعقد ہوتے اور بڑے بڑے ادباء ان کی خدمت میں علمی استفادہ کے لئے آتے تھے۔

ان کے علاوہ اندلس، بغداد، قاہرہ اور حرمین شریفین سے تعلق رکھنے والی ایسی بے شمار علامہ عورتوں کے حالات ملتے ہیں جن سے لوگ مسائل پوچھتے اور عربی لغت کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ ان دلائل وشواہد سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اسلام میں عورتوں کو حصول علم کی نہ صرف آزادی حاصل ہے بلکہ اسلام تعلیم حاصل کرنے والی عورت کو تحسین اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن ایسی تعلیم یا ایسا نظام ونصاب تعلیم جو عورت کے وقار میں اضافے کی بجائے کمی کا باعث بنے' اسلامی طور پر مستحسن نہیں ہے کیونکہ عورت کی تعلیم کا مقصد اس کی حیاداری اور طہارت وتقدس کا تحفظ ہے۔ جبکہ موجودہ سیکولر نظام تعلیم عورت کو مخلوط تعلیم کے ذریعے شمع محفل بنا کر اسے اس مقام رفیع سے نیچے گرانا چاہتا ہے جن کا اسلام نے اسے امین بنایا ہے۔

قرآن کریم کا نسوانی نقطہ نظر سے مطالعہ

اسلامی مآخذ کی تعبیر نو اور بالخصوص ان کی نسوانی تعبیر ایک ایسا موضوع ہے جس پر بعض علمی حلقوں کی طرف سے پرزور وکالت کی جاری ہے کہ ایک عالمہ خاتون کو بھی قرآنی احکامات کی تشریح وتفسیر کا حق اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح مرد عالم دین کو یہ حق حاصل ہوتا ہے۔ اہل علم کی غالب اکثریت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تفسیر قرآن جیسا سنجیدہ کام عورتوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ کیونکہ وہ جذباتی اور غیر منطقی مزاج رکھتی ہیں۔ اور بعض اہل علم "جدید

مسلم تحریک نسواں" کے مطالبات کی تائید اس لئے بھی نہیں کرتے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ خواتین نسوانیت (Feminism) کے تمام تصورات اور اصطلاحیں مغربی فکر و فلسفہ سے اخذ کرتی ہیں۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن و سنت میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ عورت الہامی پیغام کی تفسیر و تشریح نہیں کر سکتی اور یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ اسلام کے ابتدائی معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں عالمہ خواتین نے کارہائے نمایاں ادا کئے ہیں۔ جدید اسلامی تاریخ میں چند مسلم اہل علم خواتین ایسی ہیں جنہوں نے اس وادی میں قدم رکھا ہے۔ ان میں عائشہ عبدالرحمٰن (م 1998ء) جو بنت الشاطی کے نام سے معروف تھیں۔ جنہوں نے قاہرہ میں تعلیم حاصل کی بعد ازاں وہاں کئی برس عربی ادب کی استاد رہیں اور پھر مراکش میں اسلامیات کی پروفیسر رہیں۔

پہلی مسلم خاتون ہیں جن کے خیال کے مطابق قرآن مجید کو اس کے زمانہ نزول اور حالات نزول کے تناظر میں سمجھنا ضروری ہے۔ اسی طرح وہ قرآن پاک کے اخلاقی اور روحانی مطالعہ پر بھی زور دیتی ہیں۔ اس انداز فکر کو ہم ابتدائی تفاسیر پر تنقیدی نظر بھی کہہ سکتے ہیں۔ انکے علاوہ ایک اور عالمہ خاتون جن کا نام ناظرہ زین العابدین (1976-1908) تھا جو لبنان سے تھیں اور شیخ سید زین العابدین جو 1920ء میں لبنان کی کورٹ آف اپیل کے صدر تھے کی صاحبزادی تھیں، انہوں نے 1928ء میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے عورت کے فروتر مقام کے حوالے سے اہل مذہب پر تنقید کی۔ اسی طرح مصر کی زینب الغزالی (1997) معاصر تاریخ میں وہ واحد خاتون ہیں جنہوں نے نسوانی پہلو سے قرآن پاک کی مکمل تفسیر لکھی۔

عصر جدید میں جو خواتین بطور خاص اس نقطۂ نظر کی داعی ہیں ان میں نمایاں تر مصر کی ہبہ رؤف عزت اور افریقی نژاد امریکی خاتون امینہ ودود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امینہ ودود ان دنوں ورجینیا کامن ویلتھ یونیورسٹی آف امریکہ کے شعبہ فلسفہ والہیات کی استاد ہیں۔انکی کتاب قرآن اور عورت جو اصلاً ان کا .Ph.D کا مقالہ ہے اور کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ امینہ ودود کی یہ کتاب جدید عہد کی خواتین کی زندگی سے قرآن کے تعلق کو واضح کرتی ہے، امینہ نسوانی حوالے سے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہتی ہیں:۔

> ''میرا ایمان ہے کہ قرآن مجید جدید مسلم عورت کے حالات کا بھی اسی کامیابی سے لحاظ رکھتا ہے جس طرح اس نے چودہ صدیاں پہلے بنیادی مسلمان معاشرے کی عورت کا لحاظ رکھا ہے۔اگر جدید عورت کو ذہن میں رکھتے ہوئے قرآن کی تفسیر کی جائے تو اس حقیقت کو نمایاں کیا جا سکتا ہے۔اس طرح قرآن کی افادیت بھی واضح ہوتی ہے ایسی تفسیر جو قرآنی ہدایات کو صرف بنیادی اسلامی معاشرے کے مخصوص تناظر اور الفاظ کے ظاہری معنی کی نقالی تک محدود رکھتی ہے زندگی بلکہ دراصل قرآن کے ساتھ ناانصافی ہے''۔

امینہ ودود کے نزدیک تمام روایتی تفاسیر' چاہے ان کا تعلق دور جدید سے ہو یا قدیم سے' مردوں نے لکھی ہیں۔لہٰذا انہوں نے یا تو نسوانی تجربات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے یا انہیں مردانہ تناظر میں دیکھا اور لکھا ہے۔لہٰذا ایسی تفاسیر کو مکمل اور جامع کیسے کہا جا سکتا ہے۔ جو مسلم معاشرے کی نصف آبادی کے مسائل کو نظر انداز کر دے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ردعمل کے طور پر مسلم معاشروں میں عورت کی کمزور حیثیت کو بنیاد بنا کر اسلام اور قرآن پر تنقید کی جاتی ہے۔ایسے لوگ متن اور تفسیر میں فرق کرنے میں خود ناکام رہتے ہیں اور الزام کلام الٰہی پر دھرتے ہیں۔لہٰذا ایک مکمل(Holistic) اور جامع تفسیر وہ ہے جو جدید سماجی، اخلاقی،

معاشی اور معاشرتی مسائل بشمول خواتین کے معاملات کو پیش نظر رکھ کر لکھی جائے۔ (18)

عورت کا معاشرتی مقام و رتبہ

اسلام نے عورتوں کو جس معاشرتی و سماجی مقام سے نوازا ہے اس کا اندازہ ان آیات کریمہ اور احادیث نبویہ سے ہوتا ہے جن میں مسلمان عورت کو وہ مقام رفیع دیا گیا ہے جس کا مقابلہ مغرب کے معاشرے شاید صبح قیامت تک نہ کر سکیں۔

ظہور اسلام سے قبل عرب معاشرہ میں بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس مکروہ اور ظالمانہ رسم کا خاتمہ کر دیا لیکن آج جدید دور میں بے شمار معاشروں میں ابھی تک بچیوں کو زندہ درگور کر دینے کا رواج موجود ہے۔ مثلاً عالمی نشریاتی ادارے B.B.C نے کچھ عرصہ قبل ایک رپورٹ تیار کی، جس کا موضوع تھا "اسے مرنے دو" (Let her Die)۔ بی بی سی کی ایک خاتون رپورٹر (Emy Bedcenen) نے برطانیہ سے ہندوستان آ کر اس موضوع پر تحقیقات کیں اور یہ رپورٹ تیار کی جسے سٹار ٹی وی پر بھی کئی مرتبہ دکھایا گیا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں روزانہ تین ہزار حمل ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ والدین بچے کی جنس معلوم کرتے ہیں جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ بچی پیدا ہونے والی ہے تو حمل ضائع کروا دیتے ہیں۔ ان اعداد و شمار کی رو سے ہندوستان جیسے خود کو جمہوری روایات کا پاسدار کہلوانے والے ملک میں ہر سال تقریباً دس لاکھ بچیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ تامل ناڈو اور راجستان جیسی ریاستوں میں ایسے بورڈ اور پوسٹر نظر آتے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے کہ "پانچ سو خرچ کریں اور پانچ لاکھ بچائیں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے یا بچی کو جنس معلوم کرنے کے لئے پانچ سو روپے طبی معاینے پر خرچ کریں اور بچی کی تعلیم و تربیت اور جہیز پر اٹھنے والے پانچ لاکھ روپے کے اخراجات بچائیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد کم ہے۔ جبکہ اسلام کے معاشرے میں جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد ربانی

ہے اس کے برعکس ہدایات دی گئی ہیں: ''اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے''۔ (19)

ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس شخص نے اپنی دو بیٹیوں کی اچھی طرح پرورش کی اور ان کا خیال رکھا اور محبت کے ساتھ انہیں پالا وہ شخص جنت میں داخل ہوگا''۔

اسلام نے عورت کو بیٹی کی حیثیت سے پیش کیا تو اسے ماں باپ کی بخشش کا باعث بنا دیا۔ اسی طرح عورت کو ماں کی حیثیت سے پیش کیا تو اس کی خدمت کا صلہ جنت قرار دیا۔ ارشاد نبوی ہے ''وَاعْلَمُوْ اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ'' جان لو کہ تمہاری جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اسی طرح بیوی کے ساتھ حسن سلوک کا درس دیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ''

تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں (اہلیہ اور خاندان) کے لئے بہتر ہے اور میں تم سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہوں۔

اسلام میں بالغ عورت کو نکاح کے معاملے میں رضامندی کا اختیار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق ایک عورت کا نکاح اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف کر دیا۔ وہ عورت شکایت لے کر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نکاح کو منسوخ فرما دیا۔ (20)

اسلام عورت کو بھرپور معاشرتی مقام اور مرتبہ سے نوازتا ہے اور اسے خاندان کی بنیادی اکائی قرار دے کر اسکے وجود کو معاشرے کے لئے باعثِ رحمت بناتا ہے اور اس کے ذمے آنیوالی نسلوں کی تربیت کی ذمہ داری لگاتا ہے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ اپنے زمانے کی تاریخ

میں اپنے کردار کی بدولت ممتاز ترین مقام کی حاصل تھیں۔ اپنے محاسن وفضائل کی بدولت انہوں نے ایسا مقام چھوڑا جس کا آئندہ کی نسلوں میں عزت ووقار سے تذکرہ کیا گیا۔

فروج مدنی کی بیوی حمیدہ نے اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں جو چوبیس (24) سال تک جنگی مہمات میں مصروف رہا' تنہا اپنے نوعمر لڑکے کی ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا کہ اس لڑکے نے بڑے ہو کر اپنے دور کے علمائے فقہ میں نمایاں ترین مقام حاصل کیا۔

ان دلائل وشواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام مسلمان عورت کو معاشرتی سرگرمیوں کی اجازت بھی مرحمت فرماتا ہے اور اس سلسلہ میں اس کے اندر مسابقت کا جذبہ پیدا کر کے دیگر خواتین کو ترغیب بھی دلاتا ہے کہ نسلوں کی تیاری اور تربیت ماؤں کی گود سے وابستہ ہے۔ ماں اگر سیدہ حاجرہ رضی اللہ عنہا جیسی ہو تو بیٹا اسماعیل علیہ السلام جیسا پیدا ہوتا ہے۔ اور ماں اگر سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا جیسی ہو تو بیٹا امام حسین علیہ السلام جیسا پیدا ہوتا ہے۔

مسلمان عورت فکر اقبال کی روشنی میں

علامہ اقبال فرماتے ہیں مسلمان عورت کو پردہ کے اہتمام کے ساتھ بھی معاشرہ اور زندگی میں ایسی شان پاکبازی کے ساتھ رہنا چاہیئے کہ اس کی طہارت کے اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہو سکیں اور اس کے پرتو سے حریم کائنات اس طرح روشن رہے کہ جس طرح ذات باری تعالیٰ کی تجلی حجابات کے باوجود کائنات پر پڑ رہی ہے۔ فرماتے ہیں:

ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب است
کشاوش در نمود رنگ و آب است
جہاں تابی زنور حق بیاموز
کہ او باصد تجلی در حجاب است

اسی طرح علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ دنیا کی سرگرمیوں کی اصل ماؤں کی گود ہے ان کی ذات امین ممکنات اور انقلاب انگیز تخیلات کی حامل ہے جو قومیں ماؤں کی عزت نہیں

کرتیں ان کا نظام زندگی سنبھل نہیں سکتا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کا اس لئے حامی نہیں بن سکتا کہ اس کا نتیجہ دوسرے انداز میں عورتوں کی غلامی ہے اس سے ان کی مشکلات آسان نہیں بلکہ اور پیچیدہ ہو جائیں گی۔ جس علم سے عورت اپنی خصوصیات کھو دیتی ہے وہ علم نہیں بلکہ عورت کے حق میں موت ہے۔

مغرب اخلاقی زوال کی وجہ سے صنفی پاکیزگی کے خاتمہ اور عورت کی بے لگام آزادی کا داعی ہے لیکن اس کا نتیجہ مغرب کے خاندانی نظام کی تباہی کی صورت میں نکل رہا ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں تفوق و برتری (uper hand) کس کو حاصل ہے۔ مرد کی فضیلت و برتری صنفی یا نسلی اعتبار سے نہیں بلکہ عورت کے حیاتیاتی، عضویاتی فرق اور فطرت کی وجہ سے اس کے حقوق و مصالح کی رعایت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ نگرانی یا قوامیت ایسی چیز نہیں جو محض عورت کے سپرد کر دی جائے۔ علامہ اقبال مغرب کے نام نہاد ''آزادیٔ نسواں'' کے نعرہ کی پرواہ کیے بغیر مسلمان عورت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی وکالت کرتے ہیں اور عورت کی حفاظت کے عنوان سے کہتے ہیں:۔

اک زندہ حقیقت مرے سینہ میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

یہ نظم درحقیقت حدیث پاک ''لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا عَلَیْهِمْ اِمْرَاَۃٌ'' کی ترجمانی

کرتی ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں اے مسلمان عورت زمانے کی نگاہوں سے چھپ جا اور بے حیا نظروں سے اپنی حفاظت فرما تا کہ تیری گود میں وقت کا حسین پیدا ہو سکے۔فرماتے ہیں۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیر بگیری

امام حسن جیسا مرد مجاہد اور امام حسین جیسا مرد میداں صرف اسی عورت کی کوکھ سے جنم لے سکتا ہے جس کی زندگی سیدہ فاطمۃ الزہراء کی پاکیزہ سیرت کی تابندگی سے دمک رہی ہو۔

یوں تو مسلمان عورت کے مقام و مرتبہ کے اور بھی کئی ایسے پہلو ہیں جن پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔مگر طوالت سے بچتے ہوئے صرف انہی الفاظ کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے پر اکتفاء کر رہا ہوں کہ مغرب کی آزاد منش عورت مادی ترقی کی جتنی بھی بلندیوں پر پہنچ جائے وہ سکونِ قلب، عزت اور تحفظ سے محروم رہے گی۔جبکہ مسلمان عورت اگر اسلامی تعلیمات کے زیور سے خود کو آراستہ کر لے تو وہ دنیا بھر کی عورتوں کے لئے نمونہ عمل و کردار (Role Model) بن کر قیادت نسواں کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے۔

مصادر و مراجع

1- پیدائش باب دوم

2- عہد نامہ قدیم باب واعظ

3- پہلا خط باب دوم

4- پیدائش باب سوم

5- اولڈ برگ کی کتاب Budda p-149-85

6- روزنامہ نوائے وقت 9 ستمبر 2006ء

7- النحل: 58-59

8- عرب کا چاند ص 35 تا 37

9- Civilization de Arabs Page 372-373

10- فتح الباری جلد 10 ص 406 از ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ

11- اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جلد 4 صفحہ 433 از ابن اثیر الجزری۔

12- سنن دارمی بیروت دار الاحیاء

13- The life of Muhammad 1930 Dermengum

14- Christianity, Islam and Nagro race 1969

15- Muhammad the prophet of Islam

16- النور: 24

17- اسلام میں خواتین کے حقوق صفحہ 42 تا 44 از ڈاکٹر ذاکر نائیک۔

18- جدید مسلح تحریک نسواں از چیفاء جواد

19- بنی اسرائیل: 17 تا 31

20- صحیح بخاری از امام محمد بن اسماعیل البخاری

نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں عورتوں کے حقوق

پروفیسر بشیر احمد رضوی، پنڈی گھیب (اٹک)

نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی روشنی میں
عورتوں کے حقوق

پروفیسر بشیر احمد رضوی

اسلام امن وسلامتی کا دین ہے اس کا مقصد دنیا میں عدل وانصاف کے ابدی اصولوں پر مبنی ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں ہر حقدار کو اس کا پورا پورا حق ملے اور کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے تاکہ اولادِ آدم اس دنیا میں حیاتِ مستعار کے لمحات امن وسکون کے ساتھ بسر کر سکے۔ اسلام کے اس نظام کی بنیاد انسانی مساوات پر ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قائم کردہ معاشرہ طبقاتی اونچ نیچ سے یکسر پاک تھا اس میں، جنس، رنگ، زبان، نسل، امارت، غربت وغیرہ کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کا کوئی تصور نہ تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عَصَبِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْآبَاءِ إِنَّمَا هُوَ مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ أَوْ فَاجِرٌ شَقِيٌّ، اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ (1)

بے شک اللہ نے دور کر دیا تم سے جاہلیت کا تکبر اور آباء پر فخر کرنا مگر یہی کہ وہ یا تو مومن پرہیزگار ہو یا نافرمان وبدبخت سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔

حج آخر کے خطبہ مبارکہ میں آپ نے عورتوں کے حقوق ادا کرنے اوران سے نیک سلوک کرنے کی تاکید یوں فرمائی:

أَ لَآ اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا اَلَااِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَآءِ كُمْ حَقًّا وَّلِنِسَآءِ كُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا اَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ اِنْ تُحْسِنُوْهُنَّ فِيْ كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ. (2)

خبردار! عورتوں کے ساتھ بھلائی کے حق میں میری نصیحت قبول کرو۔ خبردار تمہاری عورتوں کے ذمہ تمہارا حق اور تمہارے ذمہ تمہاری عورتوں کے حق ہیں۔ عورتوں کے حق یہ ہیں کہ انھیں اچھا لباس پہناؤ اور اچھا طعام کھلاؤ۔

ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"خِيَارُ كُمْ خِيَارُ كُمْ لِنِسَآءِ هِمْ". (3)

تم میں بہتر وہ ہیں جو اپنی ازواج کے ساتھ اچھائی کرنے والے ہیں۔

ابوداؤد شریف میں سیدنا معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم! مرد پر عورت کا کیا حق ہے فرمایا:

"أَنْ تُطْعِمَهَآ اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوْهَآ اِذَا اكْتَسَيْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ" (4)

یہ کہ تو اسے کھلائے جب خود کھائے اور اسے پہنائے جب خود پہنے اور اسے منہ پر نہ مار اور نہ بدصورتی کا طعنہ دے اور اس سے علیحدگی اختیار نہ کر مگر گھر کے اندر۔

حضور شفیع اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید بھی کی اور پوری وضاحت وتفصیل کے ساتھ ان کے حقوق کا تعین بھی کر دیا۔ رحمتِ کائنات

علیہ التحیہ والصلوات کی تشریف آوری سے قبل، وحشی معاشروں کا تو ذکر ہی کیا' متمدن دنیا میں بھی عورتوں کو بنیادی انسانی حقوق حاصل نہ تھے۔ ازمنہ قدیمہ کے بعض مفکرین کو تو عورت کو ذی روح ماننے میں بھی تامل تھا، جبکہ بعض مفکرین عورت کو ذی روح تو مانتے تھے لیکن انسان ماننے کو تیار نہ تھے بلکہ ان کے خیال میں عورت ایک جانور تھی جسے مرد نے خدمت لینے کیلئے سدھالیا تھا۔

اہل مغرب جو آج دنیا کو یہ باور کرانے میں لگے ہوئے ہیں کہ اسلام نے عورت کو مرد کی باندی بنا دیا اور مرد کو اس کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک روا رکھنے کا حق دے دیا ہے حقیقتاً یا تو تاریخ عالم سے بے خبر ہیں یا کسی مکروہ سازش کے تحت اسلام کو بدنام کرنے کے لیے ایسی جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں۔

درحقیقت یورپ میں عورت ہمیشہ مظلوم رہی اور ہے۔ قرون وسطیٰ میں عورت گناہگار اور لعنت ابدی کی سزاوار سمجھی گئی اور جب تک اہل گرجا کو غلبہ حاصل رہا عورتوں کے ساتھ بے حد ظلم ہوا، لاکھوں عورتوں کو جادوگرنیاں قرار دے کر زندہ جلایا گیا۔

The Webster Family Encyclopaedia نے لکھا ہے:

During the principal period of witch-persecution during the 16th and 17th centuries, large number of people were killed. Estimates of the men, women and children executed by hanging or burning range from 3,000,000 to as many as 9,000,000. (5)

سولہویں اور سترھویں صدی میں جب جادوگروں پر ظلم وستم انتہا پر تھا تو لوگوں کی بہت بڑی تعداد قتل کی گئی۔ مارے جانے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کی تعداد نوے لاکھ تک پہنچتی ہے۔

Lexicon Universal Encyclopedia لکھتا ہے:

About 80% of all accused witches were women.(6)

جن پر جادوگری کا الزام لگایا گیا ان میں اسی فیصد عورتیں تھیں (یعنی نوے لاکھ مقتولوں میں اَسّی (80) فیصد عورتیں تھیں)۔

جاگیرداری دور میں عورت Serf یعنی زرعی باندی، صنعتی دور میں جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے یومیہ کارخانوں میں کام کرنے والی مزدور اور دورِ جدید میں مرد کے مساوی ہونے کے وہم میں مبتلا ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد، مرد کی سچی محبت سے محروم محض شہوت رانی کا آلہ بن گئی ہے۔

جارج برنارڈ شاہ ماورس اور ابسن جیسے مصنفین نے حقوقِ نسواں کی جنگ لڑی اور صنفِ نازک کو ہر اعتبار سے مرد کے مساوی مان لیا گیا جس کا خمیازہ سارا یورپ بھگت رہا ہے۔ عائلی زندگی کا نظام چوپٹ اور مقدس رشتوں کا تقدس بہت بری طرح پامال ہو گیا۔

ظہورِ اسلام سے قبل پوری دنیا میں عورت کے ساتھ انتہائی شرمناک سلوک روا رکھا گیا۔ ایران میں بہن بھائی کا نکاح رائج تھا اور ہندوستان میں ایک عورت پانچ پانچ مردوں سے بیاہی جاتی تھی (7) اور ستی جیسی ظالمانہ رسم کا شکار بنتی تھی۔ چین میں عورت ایسا جانور سمجھی جاتی تھی جسے چابک سے ہی قابو رکھا جا سکتا تھا۔ الغرض دنیا بھر میں عورت مرد کے ظلم کی چکی میں پستی رہی۔

دنیا کے دیگر خطوں کی طرح عرب میں بھی عورت کو کوئی وقعت حاصل نہ تھی بعض قبائل جیسے مُضر، بنو خزاعہ اور بنو تمیم بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے کیونکہ انکے خیالِ فاسد میں بیٹی باپ پر محض بوجھ اور اسکے لیئے غربت و افلاس کا باعث تھی اور اس غربت و افلاس کی وجہ سے چھوٹے گھرانوں کے مردوں کو اسکے ساتھ نکاح کی جرأت پیدا ہوتی تھی جو کہ عربوں کیلیئے انتہائی ننگ و عار کی بات تھی۔

بعض قبائل میں دستور تھا کہ اگر باپ بیٹی کو زندہ رکھنا چاہتا تو اُسے اُونی جبہ پہنا کر

جانوروں کی خدمت پر مامور کر دیتا اور اگر قتل کرنا چاہتا تو چھ سال تک زندہ رہنے دیتا جب وہ چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں سے کہتا کہ اسے بنا سنوار کر تیار کر دے۔ پھر اسے جنگل میں لے جاتا جہاں پہلے سے گڑھا کھود رکھا ہوتا۔ بچی سے کہتا ذرا دیکھ تو گڑھے میں کیا ہے۔ بچی جب گڑھے میں جھانکتی، شقی القلب باپ دھکا دے کر اُسے گڑھے میں گرا دیتا اور اُوپر سے مٹی ڈال کر گڑھا پاٹ دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل میں اس کا ذکر یوں فرمایا ہے:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ (النحل 59-58)

اور جب اُن میں سے کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خبر سنائی جاتی ہے تو سارا دن اس کا چہرہ بے رونق رہتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھلتا ہے اور جس کی خبر اس کو دی جاتی ہے اسکی عار سے لوگوں سے چھپ جاتا ہے (سوچتا ہے) اس ذلت کی حالت میں اسے رو کے رکھے یا مٹی میں دبا دے۔ خبردار کیا ہی برا حکم لگاتے ہیں!

اور سورۃ التکویر میں فرمایا:

﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ۝﴾ (التکویر 9-8)

اور جب زندہ دبائی ہوئی سے پوچھا جائے کس خطا پر ماری گئی۔

نجانے کتنی بیٹیاں سنگدل باپوں کے ہاتھوں زندہ درگور ہو چکی تھیں کہ رحمتِ عالمیاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خاکدانِ عالم کو قدومِ میمنت لزوم سے نوازا آپ کی رحمت سے پوری کائنات کی طرح عورت بھی فیضیاب ہوئی اور اسے وہ شرف حاصل ہوا جو کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ عورت کو جو کچھ محمد مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء نے عطا کیا' حقوقِ نسواں

کے بڑے بڑے چیمپین اس کے تصور سے بھی نا آشنا ہیں۔ یورپ میں حقوقِ نسواں کے سب سے بڑے علمبردار جارج برنارڈ شا نے محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

The Prophet Muhammad's (PBUH) teaching the status of women were far ahead of the western Christan thought even of modern thought.(8)

عورتوں کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات مغربی مسیحی افکار بلکہ جدید افکار سے بھی بہت آگے تھیں۔

انسانیت کی بنیاد پر شریعت مطہرہ عورت کو مرد کے برابر قرار دیتی اور عمومی انسانی حقوق میں اس کو اتنا ہی حق دیتی ہے جتنا مرد کو۔ مرد و زن کی اس مساوات کو سورۃ النساء میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً﴾ (النساء:1)

اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان سے بہت سے مرد عورت پھیلائے۔

یعنی مرد و زن کی اصل ایک ہے اس میں کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں۔

شریعت مطہرہ نے عورتوں کو جو حقوق عطا فرمائے ہیں اُن میں سے نمایاں حقوق یہ ہیں۔

نکاح میں ردو قبول کا حق

عورت کی آزاد حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام نے اسے اس کے مناسب حقوق عطا کیے ہیں۔ ازدواج کا مسئلہ مرد و زن ہر دو کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس عظیم و جلیل امر میں عورت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ اس کی رضا کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہوسکتا

خواہ ثیبہ ہو یا کنواری: بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

لاتنکح الایم حتی تستامر و لا تنکح البکر حتی تستاذن:(9)

کسی بیوہ کا نکاح نہ کیا جائے جبتک اس سے اجازت نہ لے لی جائے اور نہ کسی کنواری کا نکاح کیا جائے جب تک اس سے اجازت نہ لے لی جائے۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت خنساء بنت خذام رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"اِنَّ اَبَاھَا زَوَّجَھَا وَھِيَ ثَيِّبٌ فَكَرِهَتْ ذٰلِكَ فَاَتَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَدَّ نِكَاحَهُ"(10)

انکے باپ نے ان کا نکاح کر دیا جبکہ وہ ثیبہ تھیں اور اس نکاح کو ناپسند کرتی تھیں پس رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے باپ کا کیا ہوا نکاح رد کر دیا۔

مہر، نان نفقہ و سکنی کا حق

قرآن مقدس نے نکاح میں مہر کو لازم قرار دیا ہے جیسا کہ درج ذیل آیات سے واضح ہے:

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ. (الاحزاب:50)

تحقیق ہمیں معلوم ہے جو ہم نے مسلمانوں پر مقرر کیا انکی بیبیوں میں۔

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾(النساء:24)

جن عورتوں سے نکاح کرنا چاہو اُن کے مہر مقرر شدہ انہیں دو۔

مہر کو بوجھ سمجھ کر نہیں بلکہ خوشدلی سے دینے کا حکم ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾(النساء:4)

اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دو۔

جو مہر بندھ جائے لازم ہو جاتا ہے اگر شوہر بیوی کو طلاق دینا چاہے تو مہر سے کچھ واپس نہیں لے سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَإِنْ أَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا﴾ (النساء:20)

اور اگر تم ایک بی بی کے بدلے دوسری بی بی لانا چاہو اور اس کو بہت سارا مال دے چکے ہو تو اس سے کچھ واپس نہ لو۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو نکاح کرے اس نیت کے ساتھ کہ عورت کو مہر سے کچھ نہ دے گا تو جس دن مرے گا زانی مرے گا۔ (11)

مہر کی فرضیت سے عورت کی قدر و منزلت بڑھ گئی اگر مہر نکاح میں فرض نہ ہوتا تو عورت کو حقیر شے سمجھا جاتا اور اس کا رد و قبول ایک معمولی کام بن جاتا کہ مرد جب چاہتا عورت کو مفت میں نکاح میں لے آتا اور جب چاہتا طلاق دے کر فارغ کر دیتا۔

قرآن مقدس نے مہر کے علاوہ نان نفقہ بھی مرد کے ذمہ لگایا ہے:

﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (البقرۃ:233)

اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے عورتوں کا کھانا اور لباس حسب دستور۔

سورۃ الطلاق میں فرمایا:

﴿أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ﴾ (الطلاق:6)

عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہتے ہو اپنی طاقت بھر۔

قرآن مقدس نے ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ﴾ (البقرۃ:228) یعنی "اور عورتوں کا بھی حق ہے ایسا ہی جیسا ان پر ہے" کہہ کر مرد پر عورت کی طرف سے کچھ ذمہ

داریاں ڈال دی ہیں - یوں عورت کو خانگی زندگی میں بڑی عزت ملی ہے۔

ابوداوٗد شریف میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ رات بھر عبادت میں مصروف رہتے تھے جب نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینت اس پر مطلع ہوئے تو انہیں بلوا کر فرمایا: عثمان! اللہ سے ڈرو تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے۔ (12)

معلوم ہوا کہ مرد پر لازم ہے کہ عورت کی طرف سے غافل نہ رہے بلکہ اس پر توجہ دے اور اس کے پاس شب باش ہو۔ ساری رات نوافل میں گزار کر عورت کی حق تلفی نہ کرے۔

حق ملکیت

عورت کی اسی آزاد مستقل حیثیت کی بناء پر اسے حق ملکیت عطا ہوا ہے۔ عورت اپنے کمائے ہوئے مال کی خود مالک ہوتی ہے اسی طرح جو کچھ اسے ترکے سے یا بطریق ہدیہ و ہبہ حاصل ہو اس کا اپنا ہوتا ہے اور اسے اس میں تصرف کا پورا حق ہوتا ہے۔ اس کی خرید و فروخت، صدقہ و ہبہ، وغیرہ صحیح ہیں۔ اس کے ماں باپ، اولاد یا شوہر کو اس کے مال میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ خیر القرون میں دختران اسلام کو یہ حق حاصل ہوا اور اس حق کو انہوں نے آزادانہ استعمال کیا۔ قرآن مقدس میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ (النساء:32)

اور عورتوں کیلئے انکی کمائی سے حصہ ہے۔

حضرت زینب ثقفیہ زوجہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ"

عورتو! صدقہ کرو خواہ اپنے زیورات ہی میں سے۔

فرماتی ہیں، میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا آپ تنگدست ہیں اور ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ دینے کا حکم دیا ہے۔ آپ جا کر رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ آئیں آیا میں آپ کو صدقہ دے سکتی ہوں۔ اگر نہیں تو میں کسی اور کو دے دوں۔ انہوں نے فرمایا خود ہی جا کر پوچھ لو، پس میں درِ اقدس پر حاضر ہوئی تو ایک انصاری خاتون کو بھی اسی غرض سے موجود پایا لیکن وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہیبت کی وجہ سے کچھ عرض کرنے سے قاصر تھی۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ دروازے پر تشریف لائے اور ہمارا سوال پوچھ کر رسول اللہ ﷺ پر پیش کیا تو آپ نے فرمایا:

"لَهُمَآ أَجْرَانِ أَجْرًا لِقَرَابَةِ وَّأَجْرًا لِصَدَقَةِ" (13)

ان دونوں کے لیے دو ثواب ہیں ایک پاسِ قرابت کا، ایک صدقے کا

معلوم ہوا عورت اپنے مال کی آزادانہ مالک اور تصرف میں مرد کی طرح خود مختار ہے۔

میراث میں حق

اسلام نے عورت کو جو حقوق عطا کیے ہیں ان میں حقِ میراث بہت اہم ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل عورت کو میراث میں سے کچھ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود ہی ترکے میں بٹ کر اپنے شوہر کے کسی بیٹے کے حصے میں آجاتی تھی ایام جاہلیت میں عرب میں، ترکے سے صرف ان مردوں کو حصہ ملتا تھا جو میدانِ جنگ میں لڑنے کے قابل ہوتے تھے، عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کو محروم کر دیا جاتا تھا۔ طاقتور ورثاء ترکے پر قبضہ جمالیتے اور بیوائیں اور یتیم بچے دیکھتے رہ جاتے، جب محمد مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء گیتی نواز ہوئے تو یہی حال تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عورتوں کا میراث میں حق بیان فرمایا تو عورتوں کو میراث میں سے حصہ ملنا شروع ہوا۔

سیدنا اوس بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا انہوں نے ایک بیوہ اور تین بیٹیاں پیچھے چھوڑیں۔ آپ نے دو بندوں کو اپنے ترکے کی تقسیم کا کام سونپا تھا۔ انہوں نے

دورِ جاہلیت کے رواج کے مطابق سارا مال حضرت اوس رضی اللہ عنہ کے عم زادوں خالد اور عرفطہ کو دے دیا اور بیوہ اور بچیاں محروم ہوگئیں۔ بارگاہ بے کس پناہ علیہ التحیہ والثناء میں اس ظلم کے خلاف نالش کی تو آیت اتری:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا﴾ (النساء:7)

مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور اقرباء چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور اقرباء چھوڑ جائیں، ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ حصہ ہے مقرر کیا ہوا۔

اس حکم کے نزول سے معلوم ہوگیا کہ میراث پر صرف مردوں کا نہیں عورتوں کا بھی حق ہے لیکن تا حال انکے حصے کی مقدار معلوم نہ ہوسکی تھی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا اوس رضی اللہ عنہ کے وکیلوں سے فرمایا اللہ تعالی نے عورتوں کا حق میراث میں مقرر فرمادیا ہے تاہم ابھی اس کی مقدار مقرر نہیں فرمائی اس لئے اوس رضی اللہ عنہ کے ترکے کو ابھی روکے رکھو اس میں سے کچھ خرچ نہ کرو یہاں تک کہ اللہ تعالی اس کے متعلق کوئی حکم اتارے۔

ابھی یہ مسئلہ باقی تھا کی جنگِ اُحد میں سیدنا سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے۔ حسب دستور انکے بھائی نے انکا کل مال لے لیا اور انکی بیوہ اور دو بیٹیوں کو کچھ نہ دیا وہ بھی رحمت دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں نالشی ہوئیں آپ نے انہیں بھی یہ فرما کر رخصت فرمادیا کہ ابھی انتظار کریں یہاں تک کہ اللہ تعالی کوئی فیصلہ فرمادے۔ کچھ عرصہ صبر کیا لیکن پھر بارگاہِ بے کس پناہ علیہ التحیہ والثناء میں روتی ہوئی آئیں ان کا رونا رحمتِ الٰہی کے نزول کا سبب بن گیا اور اللہ تعالی نے آیت:

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾(البقرۃ:11)

تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ پاک تمہیں تاکید فرماتا ہے مرد کے لئے حصہ ہے دو عورتوں کے برابر۔

نازل کرکے زوجہ اور بیٹیوں اُور دیگر تمام وارثوں کے حصے مقرر فرمادئے۔

عورت کا حصہ مرد کے مقابلے میں آدھا اس لیے مقرر ہوا کہ اس پر وہ ذمہ داریاں عائد نہیں جو مرد پر ہیں۔ مہر، نان نفقہ، رہائش وغیرہ ضروریاتِ زندگی سب مرد کے ذمہ ہیں علاوہ ازیں دِیَت' ارش اور تاوان وغیرہ عورت کے ذمہ نہیں ہوتے بلکہ مرد کے ذمہ ہوتے ہیں اور اولاد کی ضروریات پوری کرنا بھی مرد ہی کی ذمہ داری ہے لہذا حصوں کا یہ تفاوت بالکل انصاف پر مبنی ہے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ حقوق فرائض کے مطابق ہوں۔

معاشرتی زندگی میں عورت کا مقام ومرتبہ

نبی اکرم شفیع اعظم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے مبارکہ میں ایک اسمِ گرامی "رَافِعُ الرُّتَبِ" ہے۔ آپ مراتب عالیہ عطا کرنے والے ہیں۔ آپ کی اس صفت وشان کا ظہور پوری آدمیت کا مقام ومرتبہ بڑھانے سے ہوا آپ نے مرد وزن ہر دو کا مقام ومرتبہ بلند کیا لیکن عورت پر خاص نظرِ عنایت فرمائی کیونکہ یہی صنف دنیا بھر میں بے چارگی وبے قدری کی زندگی بسر کررہی تھی بقول سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہم دورِ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی شے نہ سمجھتے تھے۔ جب اسلام آیا اور اللہ نے ان کا ذکر کیا تو ہمیں معلوم ہوا ہم پر عورتوں کا حق ہے۔ آقائے کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے عورت کی ہر حیثیت کو رفعت سے نوازا۔ بیٹی، بیوی، ماں تینوں حیثیتوں کو اسلامی معاشرے میں وہ مقام عطا کیا جو آج بھی غیر اسلامی معاشروں کی عورتوں کو نصیب نہیں۔

بیٹی کا مقام ومرتبہ

محمد مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء سے پہلے بیٹی کا باپ ہونا ہی لوگوں کو پسند نہ تھا بلکہ اس

نسبت سے انھیں شرم آتی تھی لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹیوں سے گھروں میں آنے والی برکات کی خبر دی اور خود اپنی بیٹیوں اور نواسیوں سے کمال محبت کا اظہار فرما کر قیامت تک جنم لینے والی ہر بیٹی کو اپنی چادر رحمت میں ڈھانپ لیا۔

ابوداؤد شریف کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جس کے گھر بیٹی پیدا ہوا اور وہ اسے زندہ دفن نہ کرے اور نہ ہی اسے حقیر سمجھے اور نہ بیٹوں کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالی اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (14)

مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم، شفیع اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَنَا وَهُوَ كَهَاتَيْنِ وَضَمَّ أَصَابِعَهُ" (15)

جس نے دو بچیوں کی پرورش کی، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں قیامت کے دن میرے ساتھ یوں ہوگا جیسے یہ دو انگلیاں (یوں فرماتے ہوئے دو انگلیوں کو ملایا)۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میرے پاس ایک عورت آئی اس کے ساتھ دو بچیاں تھیں اس نے مجھ سے کچھ مانگا میرے پاس سوائے ایک کھجور کے کچھ نہ تھا وہ کھجور ہی اُسے دے دی۔ اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور دونوں کو ایک ایک ٹکڑا کھلا دیا، خود نہ کھایا۔ پھر اُٹھ کر چلی گئی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو میں نے یہ بات آپ کو سنائی فرمایا:

"مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ" (16)

جو اِن بیٹیوں سے کچھ آزمایا گیا تو اس نے ان سے اچھا سلوک کیا،

بیٹیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوقَ الْاُمَّهَاتِ وَوَأْدَ الْبَنَاتِ" (17)

اللہ نے تم پر حرام فرمائی ماؤں کی نافرمانی اور بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا۔

حضور نبی کریم علیہ وعلی آلہ الصلوۃ والتسلیم عورتوں سے جن چیزوں کے نہ کرنے کی بیعت لیتے تھے ان میں ایک چیز اولاد کا قتل تھی۔ جیسا کہ سورۃ ممتحنہ میں ہے:

﴿وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ (الممتحنۃ:12)

اور اپنے بچوں کو قتل نہ کریں گی۔

بیٹیوں سے نبی مکرم ﷺ کا پیار

اللہ تعالی نے حضور نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چار بیٹیاں عطا فرمائیں۔ آپ نے ہر بیٹی کی ولادت پر مسرت کا یوں اظہار فرمایا۔ جیسے ہر بیٹی پہلی بیٹی ہو۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا آپ کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے حضور کریم علیہ وعلی آلہ الصلوۃ والتسلیم اور اسلام کی خاطر بڑی قربانیاں دیں اور بے حد ظلم برداشت کیا۔ ہجرت کے سفر میں اونٹ پر سوار تھیں کہ ہبار بن اسود نے آپ کو گرا دیا، چٹان پر گرنے سے سخت چوٹیں آئیں۔ وفات کے قریب یہی زخم تازہ ہو گئے اور آپ کو مرتبہ شہادت نصیب ہوا۔ آپ کے مصائب پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"هِيَ خَيْرُ بَنَاتِيْ اُصِيْبَتْ فِيَّ" (18)

میری بیٹیوں میں سب سے افضل زینب ہے جو میری وجہ سے ستائی گئی۔

سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری صاحبزادی ہیں۔ آپ کو دو ہجرتوں کا شرف حاصل ہوا۔ ہجرت حبشہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انکی فکر رہتی تھی جب آپ کو ایک قریشی خاتون نے انکی خیریت کی خبر سنائی تو آپ نے دعا کی

اے اللہ ان دونوں (عثمان ورقیہ رضی اللہ عنہا) کا مصاحب وحامی ہو۔ اور فرمایا:

"اِنَّ عُثْمَانَ أَوَّلَ مَنْ هَاجَرَ بِأَهْلِهٖ بَعْدَ لُوْطٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ"(19)

ترجمہ: لوط علیہ السلام کے بعد زوجہ کے ساتھ ہجرت کرنے میں عثمان (رضی اللہ عنہ) سب سے اول ہیں۔

حضور نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینت ابھی بدر کی مہم سے واپس تشریف نہیں لائے تھے کہ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں۔ آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان کی قبر پر گئے اور فرمایا:

"اَلْحِقِيْ بِسَلَفِنَا عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ"(20)

ہمارے سلف عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے جا ملو۔

نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تیسری صاحبزادی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہیں۔ آپ نے ان کا نکاح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے بحکمِ الٰہی کیا تھا۔ تاریخ کبیر میں امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے ام عیاش رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

"مَازَوَّجْتُ أُمَّ كَلْثُوْمٍ عُثْمَانَ اِلَّا بِوَحْيٍ مِّنَ السَّمَآءِ"(21)

میں نے ام کلثوم کا نکاح عثمان کے ساتھ وحیِ آسمانی کے حکم سے کیا ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا میں سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی تدفین کے وقت موجود تھا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر پر تشریف فرما تھے، میں نے دیکھا آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔(22)

سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا آپ کی سب سے چھوٹی اور سب سے پیاری صاحبزادی ہیں ان سے آپ نے اپنی محبت کا اظہار یوں فرمایا:

"فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّيْ فَمَنْ أَغْضَبَهَا فَقَدْ أَغْضَبَنِيْ"(23)

فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نبی کریم علیہ وعلی آلہ الصلوۃ والتسلیم کی وہ نواسی ہیں جو تاریخِ اسلام میں شانِ یکتا کی مالک ہیں۔ واقعاتِ کربلا میں ان کا کردار اہلبیت رضی اللہ عنہم اجمعین کیلئے مایۂ افتخار ہے۔ انکی ولادت کے وقت نبی کریم علیہ وعلی آلہ الصلوۃ والتسلیم مدینہ منورہ میں نہ تھے تین دن بعد تشریف لائے تو سیدھے سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے گھر تشریف لے گئے نومولود بچی کو اُٹھا کر پیار کیا اور چشمانِ مبارک سے خوب آنسو برسائے، پھر کھجور چبا کر ان کے تالو سے چپکائی اور "زینب" نام تجویز فرمایا۔ (24)

سیدہ اُمامہ بنت ابو العاص حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی بیٹی تھیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کو اٹھا کر نماز پڑھی جب رکوع میں جاتے، اتار دیتے جب قیام میں آتے پھر اُٹھا لیتے۔ (25)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک یمنی ہار آیا۔ آپ نے فرمایا میں یہ ہار اسے دوں گا جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ پھر آپ نے وہ ہار سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کے گلے میں ڈال دیا۔ (26)

اسلامی معاشرے میں زوجہ کا مقام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ اور ارشاداتِ عالیہ سے ازواج کا مقام و مرتبہ واضح فرمایا اور ان سے حسنِ سلوک کی بہت تاکید فرمائی۔ حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا:

"اَلَا وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَیْرًا" (27)

خبردار عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی نصیحت قبول کرو۔

مسلم شریف میں ہے کہ فرمایا:

"اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّخَيْرُ مَتَاعِهَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ" (28)

دنیا متاع ہے اور اس دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔

امت کے مردوں کو عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کی تاکید کے ساتھ ساتھ حضور کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم خود اپنی ازواج مطہرات رضوان اللہ عنہن کے ساتھ بہت محبت اور انصاف کا برتاؤ کرتے۔ ان کے ساتھ خوش طبعی بھی فرماتے اور انکے مشورے بھی قبول فرماتے تھے۔ آپ نے نزولِ وحی کی خبر بھی سب سے پہلے حضرت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ہی سنائی تھی اور اُنہی کے مشورے پر حضرت ورقہ بن نوفل کے ہاں بھی تشریف لے گئے تھے۔ (29)

ام المومنین سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا قبیلہ بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں غزوہ بنو مصطلق کے چھ سو قیدیوں میں سے تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم کی خدمت میں عرض گزار ہوئیں کہ میں مصیبت زدہ ہوں آزادی چاہتی ہوں میری مدد کیجیے۔ آپ نے فرمایا: میں تمھاری طرف سے زرِ فدیہ ادا کر دیتا ہوں اس پر کہ تم مجھ سے نکاح کرلو۔ وہ راضی ہوگئیں آپ نے انھیں اپنے حرم میں داخل فرمالیا۔ یہ دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بنو مصطلق کے سب قیدی رہا کر دیے۔ (30)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ نبی کریم علیہ وعلی آلہ الصلوۃ والتسلیم ازواجِ مطہرات کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے مقام و مرتبہ کو کس قدر تسلیم کرتے تھے۔

اسلامی معاشرے میں ماں کا مقام و مرتبہ

ایامِ جاہلیت میں ماں کے لیے احترام کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ ماں جنہیں جنم دیتی اور پالتی، باپ کے مرنے کے بعد ماں کے حاکم بن بیٹھتے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے حسنِ سلوک کے حوالے سے ماں کا درجہ باپ سے بھی زیادہ بتایا۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم سے عرض کیا میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے فرمایا: " تیری ماں" بولا: پھر، فرمایا" تیری ماں" بولا: پھر، فرمایا: "تیری ماں" پھر عرض کیا" اس کے بعد" فرمایا" تیرا باپ" (31)

سیدہ اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں میرے پاس میری ماں آئی جبکہ ابھی مشرکہ تھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم سے پوچھا کیا میں ماں سے صلہ رحمی کروں فرمایا! ہاں اپنی ماں سے نیک سلوک کرو۔ (32)

نسائی شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے جہاد پر جانے کی اجازت مانگی تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تمھاری ماں زندہ ہے؟ عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: ماں کی خدمت کرو کیونکہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ (33)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا آپ کے بچپنے میں ہی وصال فرما گئیں تھیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ جب مقام ابواء سے گزرے تو والدہ کریمہ رضی اللہ عنہا کی قبر انور پر تشریف لائے اسے درست کیا اور بہت دیر تک اشکباری فرمائی۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان بھی روتے رہے۔ (34)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رضاعی ماں کی بھی بہت عزت کرتے تھے۔ سیدہ حلیمہ رضی اللہ عنہا جب بھی آتیں آپ ان کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے اور انکی خاطر اپنی چادر مبارک بچھا دیتے۔ (35)

سیدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا کو سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے لے کر وصال تک خدمت کی سعادت حاصل رہی آپ نے ان کے لئے فرمایا:

"اُمُّ اَیْمَنَ اُمِّیْ بَعْدَ اُمِّیْ" (36)

ام ایمن میری ماں کے بعد میری ماں ہے۔

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال بعد شیخین رضی اللہ عنہما بھی ام ایمن رضی اللہ عنہا کے پاس ملاقات کے لیے آتے تھے۔

معاشی پیش رفت میں عورتوں کا کردار

اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کے اٹل اصولوں کے مطابق اپنے افراد کو حقوق عطا کرتا اور فرائض ذمہ لگاتا ہے یعنی جو جس کام کے لیے جسمانی، ذہنی، نفسیاتی اور روحانی اعتبار سے موزوں ہے اس کے ذمہ وہی کام لگاتا ہے۔ مرد جسمانی اعتبار سے زیادہ مضبوط اور زیادہ مشقت کے کام کرنے کیلئے موزوں ہے تو اس کے ذمہ کسب معاش کا کام لگایا گیا ہے جبکہ عورت نرم ونازک، حساس اور رقیق القلب ہے اس کے ذمہ امورِ خانہ داری اور بچوں کی پرورش لگائی گئی ہے اس کا کام بظاہر مرد کے مقابل آسان لیکن حقیقتاً زیادہ مشکل اور کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

اپنے بنیادی فرائض کی ادائیگی کے بعد اگر عورت کے پاس کچھ وقت بچ جائے تو اس میں اپنی صلاحیت کے مطابق معاشی میدان میں خدمات سرانجام دے سکتی ہے۔ دورِ رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دخترانِ اسلام کئی طرح سے ملت کی خدمت کرتی تھیں۔ بچوں کو لکھنا، پڑھنا سکھاتی اور اپنی صناعی سے مختلف کارآمد اشیاء بناتی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر میدانِ جنگ میں اترتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے اور انھیں پانی پلانے کی خدمت سرانجام دیتی تھیں۔

سیدہ شفاء بنت عبداللہ عدویہ رضی اللہ عنہا ایک قریشی خاتون تھیں جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور مریضوں کا علاج روحانی طریقے سے کرتی تھیں۔ قبولِ اسلام کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم) میں ایام جاہلیت میں نملہ یعنی پھوڑے کا دم کرتی تھی کیا میں اس کام کو جاری رکھوں یا ترک کر دوں۔ حضور نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں اجازت دے دی اور فرمایا حفصہ (رضی اللہ عنہا) کو بھی یہ منتر سکھادو جس طرح انھیں کتابت سکھائی ہے۔ (37)

حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا طب و جراحت کا فن جانتی تھیں جنگِ خندق میں ان کا خیمہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے خیمے کے قریب لگایا گیا جس میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے تو انھیں آپ کے حکم سے سیدہ رفیدہ رضی اللہ عنہا کے خیمے میں (بغرضِ علاج) داخل کیا گیا۔ (38)

بخاری شریف میں سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک خاتون نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک چادر یہ کہہ کر پیش کی کہ یہ خود میں نے بُنی ہے تاکہ آپ کو اوڑھاؤں۔ آپ نے چادر قبول کر کے ازار کے طور پر اوڑھ لی۔ (39)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ کسب معاش کیلئے مختلف ہنر سیکھنا اور انھیں کام میں لانا عورتوں کیلئے شجرِ ممنوعہ نہیں بلکہ جائز اور مفید ہے۔

روپیہ کمانا مرد کا کام لیکن اس کو گھر کا نظام چلانے کے لئے استعمال کرنا عورت کا کام ہے اگر عورت قناعت پسند، سادگی پسند اور کفایت شعار ہو تو سراپا برکت ہے۔ دورِ حاضر میں عورتوں کو ہر وہ کام کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے جو مرد کرتے ہیں مردوں سے برابری کی اس خواہش نے عورت کو گھریلو زندگی کی بہت ساری خوشیوں اور برکتوں سے محروم کر دیا ہے وہ گھر میں رہ کر شوہر کی کمائی کو صحیح طرح استعمال کرنا سیکھ لے تو اسے نوکری کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

بناتِ اسلام کیلئے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کا طرز زندگی بہترین نمونہ ہے انھیں جو کچھ میسر ہوتا اسی پر قناعت کرتیں۔ زندگی عسرت و تنگدستی سے بسر کرتیں لیکن ناسپاسی کا کوئی کلمہ منہ سے نہ نکالتیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ مِنْ خُبْزِ شَعِيرٍ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتّٰى قُبِضَ۔ (40)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم کے گھر والوں نے جو کی روٹی بھی دو دن لگاتار پیٹ بھر کر کبھی نہیں کھائی، یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا۔

ہماری اس بحث کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں کبھی کسی حال میں گھروں سے باہر نہ نکلیں حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے شعبہ تعلیم اور شعبہ طب میں آسکتی ہیں بشرطیکہ اولاد کی اخلاقی وروحانی تعلیم وتربیت کا کام متاثر نہ ہونے پائے اور گھریلو زندگی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہو جائے ان دو شعبوں میں عورتوں کا آنا بہت ضروری ہے تاکہ عورتیں تعلیم اور علاج معالجے میں مردوں کی محتاج نہ رہیں۔

تعلیمی کاوشوں میں عورتوں کے فرائض

جزیرہ نمائے عرب امیوں کا وطن تھا جو لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ اعلانِ نبوت کے وقت گنتی کے افراد لکھ پڑھ سکتے تھے۔ ایسے ماحول میں عورتوں کی تعلیم کا تو کوئی تصور ہی نہ تھا سوائے شفاء بنت عبداللہ کے کوئی عورت فن کتابت سے آشنا نہ تھی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے عالم بشریت کو نورِ ہدایت سے جگمگا دینے کا ارادہ فرمایا تو انہی امیوں میں نکتہ دان عالم ﷺ کو مبعوث فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ﴾ (الجمعہ:2)

وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔

اس نبی امی ﷺ کا منصب یوں بیان فرمایا:

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعہ:2)

اور انھیں کتاب اور حکمت کا علم عطا کرتا ہے۔

خود معلمِ کائنات ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" (41)

میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

پس تعلیم دینا آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔اب آپ کو متعلمین درکار تھے تو آپ نے فرمایا:

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ" (42)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

پس نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معلم اور امت کے تمام مرد وزن متعلم بن گئے یوں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی علم حاصل کر کے فکری وروحانی ترقی کا موقع میسر آیا۔ نبی پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمومی خطبات سماعت کرنے کے علاوہ خواتین اپنی مخصوص مجالس میں بھی آپ سے علم حاصل کرتی تھیں۔

بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بعض صحابیات نے عرض کیا "یارسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم) مردوں کی وجہ سے ہمیں آپ سے سیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ ہمارے لیے ایک دن مقرر کر دیں"۔تو آپ نے عورتوں کیلئے ہفتہ میں ایک دن مقرر کر دیا' جس میں وہ فیض نبوت سے اپنے کاسے بھرا کرتیں۔ (43)

حضور نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینت کی فیض بخشی سے کئی صحابیاتؓ معلمات بن گئیں اور خواتین کی علمی مجالس منعقد ہونے لگیں۔ان میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا علمی پایہ سب سے بلند اور آپ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ترمذی شریف میں روایت ہے:

"مَا أَشْكَلَ عَلَيْنَا أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا إِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا" (44)

ہم اصحاب رسول ﷺ پر جب بھی کوئی حدیث مشکل ہوتی ہم حضرت عائشہؓ سے پوچھتے تو آپ کے پاس اس کا علم موجود پاتے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا قرآن وسنت کے علاوہ تاریخ، ادب ولغت' علم الانساب

بھی جانتی تھیں اور فن طب سے بھی واقف تھیں۔ آپ ان علوم کا باقاعدہ درس دیتی تھیں، بچے، بچیاں، عورتیں اور آپکے وہ رشتہ دار جن سے پردہ نہ تھا آپ کے حجرہ مبارکہ میں آتے اور دوسرے لوگ پسِ پردہ بیٹھ کر آپ کے خرمنِ علم سے خوشہ چینی کرتے تھے۔ سیرۃ عائشہ صدیقہ میں سید سلیمان ندوی نے آپ کے طریق تدریس کو یوں بیان کیا ہے:

لوگ سوال کرتے یہ جواب دیتیں۔ کبھی کوئی سلسلہ بحث چھڑ جاتا اور استاد شاگرد اس خاص موضوع پر گفتگو کرتے۔ کبھی خود کسی مسئلہ کو چھیڑ کر بیان کرتیں اور لوگ خاموشی کے ساتھ سنتے، اپنے شاگردوں کی زبان، طرز ادا اور صحت تلفظ کی بھی سخت نگرانی کرتی تھیں، وہ خاندانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اور شہر کے یتیم بچوں کو اپنے آغوش تربیت میں لیتی تھیں اور انکی تعلیم و تربیت کرتی تھیں۔ (45)

ام المومنین رضی اللہ عنہا سے کثیر تعداد میں عورتوں اور مردوں نے کسب فیض کیا۔ دور خلفاء میں آپ مسند افتاء پر فائز رہیں بقول فاضل بریلویؒ۔

تیرے جلوے سے رہی مسندِ افتاء روشن
عہدِ صدیق سے تا دورِ جناب حیدر
تیری تدقیق پہ غش حیدر و نخلِ ہاشم
تیری تحقیق کے قائل عمر و اِبن عمر (46)

حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کو عورتوں کی تعلیم کا اس قدر احساس تھا کہ جب اہلِ مدینہ کی تعلیم و تربیت کیلیے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ بھیجا تو وہاں عورتوں کو تعلیم دینے کے لیے مشہور غازیہ و مجاہدہ' سیدہ اُمّ عمارہ اور اسماء بنت عمرو کو مقرر فرمایا۔

حضور کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے لوگوں میں عورتوں کی تعلیم کا شوق پیدا کرنے

کے لیے بشارت سنائی کہ جس کے پاس کوئی باندی ہو وہ اسے تعلیم دے پھر اسے آزاد کر کے نکاح میں لائے تو اس کے لیے دُگنا اجر ہے۔ (47)

اس بحث سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ عورتوں کو تعلیم دینا ضروری ہے لیکن آج عالمِ اسلام کی عورتوں کی بہت بھاری اکثریت علمی میدان میں مردوں سے بہت پیچھے ہے اکثر خواتین تو بطور مسلمان اپنے حقوق و فرائض ہی سے آگاہ نہیں انھیں علم دینا کہ وہ بحیثیت مسلمان کامیاب زندگی گزار سکیں بہت ضروری بلکہ امت کی ذمہ داری ہے۔

غیر تعلیم یافتہ خواتین اسلامی معاشرے میں اپنا کردار ادا نہیں کر سکتیں وہ اپنے بچوں کی اخلاقی تربیت کرنے میں ناکام رہتی ہیں آج ہمارے معاشرے میں نوجوانوں کی بے راہروی کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ ماؤں کا غیر تعلیم یافتہ ہونا ہے۔ لہذا خواتین کو تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے لیکن وہ تعلیم جس کا مقصد محض حصولِ معاش نہ ہو بلکہ اللہ کی رضا اور مخلوق کی فلاح ہو۔ عورتوں کو صرف انہی شعبوں تک محدود رہنا چاہیے جو انکے بغیر چل ہی نہیں سکتے۔ بچیوں کو تعلیم دینے کیلئے اور اپنی صنف کے علاج معالجے کیلئے تعلیم حاصل کرنا انکے لیئے بہت ضروری ہے لیکن ان شعبوں میں بھی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ضرورت کے مطابق ہی خواتین کو آنا چاہیے تاکہ گھریلو زندگی کا نظام درہم برہم نہ ہو جیسا کہ یورپ میں ہوا ہے۔

خواتین کو ہر شعبے میں لانا اور مردوں کے ساتھ مقابلے کی دوڑ پر لگا دینا صرف خواتین کے ساتھ نہیں پورے معاشرے کے ساتھ ظلم ہے۔ خواتین کا ہر شعبے میں آنا بہت پیچیدگیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے مردوں میں بے روزگاری کی شرح بڑھ جاتی ہے اور بچے ماں کی بھرپور توجہ اور شفقت سے محروم رہ کر مختلف طرح کی نفسیاتی بیماریوں اور اخلاقی کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

نئی روشنی کی طرف پراونہ وار بڑھنے والی خواتین جتنا آگے بڑھتی ہیں اتنا ہی اپنی

منزل سے دور ہو جاتی ہیں۔ تہذیب نو نے عورتوں کو مردوں کے مساوی لا کران پر احسان کے پردے میں ظلم کیا ہے۔ مسلمان عورت کی بہتری اسی میں ہے کہ حضرت اقبال کے اس شعر پر پورے خلوص سے عمل پیرا ہو:

بتولے باش و پنہاں شواز یں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

عصری تقاضوں کے حوالے سے عورتوں کے مسائل اور ان کا حل

عصر حاضر میں دنیا میں طرح طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئی اور ہو رہی ہیں۔ جدید میڈیا کے اثر سے دنیا سمٹ گئی ہے اب جو کچھ یورپ و امریکہ میں ہو رہا ہے دنیا بھر میں دیکھا جا رہا ہے اور اس کے اثرات ساری دنیا پر مرتب ہو رہے ہیں وہاں کی عورتوں کا طرز زندگی مشرق کی عورتوں کو بھی متاثر کر رہا ہے اور انہوں نے بھی غیروں کی اندھی تقلید میں وہی روش اپنانی شروع کر دی ہے اب ہر کام اور ہر بات میں یورپ و امریکہ کی نقالی شائستہ و باشعور ہونے کی علامت سمجھی جانے لگی ہے ایسی تنظیمیں وجود میں آچکی ہیں جنکے وابستگان ہر وقت خواتین کی پسماندگی کا رونا روتے اور انکے حقوق کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔

حقوق نسواں کے ان علمبرداروں سے یہ تو پوچھا جائے کہ وہ کون سا حق ہے جو عورتوں کو اسلام نے نہیں دیا اور وہ دلانا چاہتے ہیں ان کے گمراہ کن پروپیگنڈا سے متاثر ہو کر بعض خواتین انھیں اپنا خیر خواہ سمجھنے لگی اور ان کے پروگرام کے مطابق عمل کرنے لگی ہیں حقوق نسواں کی تنظیموں کے زیر اثر خواتین میں مردوں کے ساتھ مساوات مطلقہ اور مسابقت کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔

جہاں تک انسانی ضروریات کا تعلق ہے عورتوں کو مردوں کے مساوی سمجھنا چاہیے اسلام کی یہی تعلیم ہے لیکن اللہ تعالے نے مرد و زن میں جو فرق رکھا ہے اسے نظر انداز کرنا گمراہی اور عاقبت نا اندیشی ہے۔ حقوق نسواں کے چیمپین اگر انھیں تعلیم دنیا چاہتے ہیں تو یہ

بات بنیادی طور پر درست اور اسلام کے مطابق ہے اور امت کو اشد ضرورت ہے کہ خواتین زیور تعلیم سے آراستہ ہوں لیکن حدود شریعت پامال نہ ہونے پائیں۔ جو تعلیم اسلام سے دور لے جائے اس کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے۔

عورتوں کی ناخواندگی آج کا سنگین مسئلہ ہے۔ ناخواندہ عورتیں بچوں کی صحیح تربیت نہیں کرسکتیں نہ اپنے رویے درست کرسکتی ہیں انہیں نہ اپنے حقوق کا علم ہوتا ہے نہ فرائض کا۔ اس لیے وہ ظلم کا ارتکاب کرتی اور ظلم کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔

جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے اس کے بغیر کوئی بندہ کامل مسلمان بن ہی نہیں سکتا لہٰذا عورتوں کو قرآن وسنت کی تعلیم سے آراستہ کرنا سب سے مقدم ہے۔ رہی دنیاوی تعلیم تو وہ عورتوں کو حسب ضرورت ہی دینی چاہیے لیکن عام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو علوم پڑھائے جارہے ہیں ان میں سے ہر علم عورتوں کو پڑھانا ضروری نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں مردوں کی تعداد میں کمی نہیں کہ عورتوں پر مردوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالیں۔ علاوہ ازیں خواتین کے لئے الگ تعلیمی اداروں کا قیام ضروری ہے مرد وزن کا آزادانہ اختلاط لاتعداد مفاسد کا سبب بنتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ پردہ جو عورت کا محافظ ہے اِس سے محرومی ہوجاتی ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی جیسے ادارے بھی یہ خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔

تعلیم کے حصول کے ساتھ روزگار کے حصول کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے آج خواتین روزگار حاصل کرنے کیلئے بہت بے تابی کا مظاہرہ کررہی ہیں اس کی کئی وجوہات ہیں خواتین گھر کی آمدن میں اضافے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے روزگار حاصل کرنے کی خواہاں ہوتی ہیں جبکہ بعض صرف عزت وشہرت کی خواہش کے تحت اور مرد کی حاکمیت سے آزادی حاصل کرنے کے جذبے سے نوکری تلاش کرتی ہیں۔ پہلا جذبہ مثبت جبکہ دوسرا منفی ہے۔ مشرق کے بیشتر ممالک پس ماندہ اور غریب ہیں ایک فرد کی کمائی سے ضروریات زندگی پوری

نہیں ہوتیں ناچار عورتیں روزگار تلاش کرتی ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست لیکن مسئلے کا حل نہیں بلکہ مسائل کا موجب ہے۔ اگر ساری عورتیں روزگار حاصل کرلیں تو عائلی زندگی کا نظام ختم ہو جائے۔ یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں۔ اس سے مردوں میں بے روزگاری بڑھتی اور اس سے اخلاقی برائیاں جنم لیتی ہیں اس لیئے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ عورتوں کو ضروری تعلیم دی جائے اور صرف انہی شعبوں میں عورتوں کو ملازمت دی جائے جہاں انکے بغیر کام چل نہیں سکتا۔ غربت وافلاس کا جو حقیقی علاج ہے وہ کیا جائے اس کا علاج قرآن وسنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی معاشرے کے قیام اور اسلام کے مطابق دولت کی تقسیم میں مضمر ہے۔

روزگار عزت وشہرت کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرنا پست ذہنیت کی علامت ہے۔ عزت کا معیار تقویٰ اور اصولِ شریعت کی پاسداری ہے۔ عورت کا کام بڑے عہدے حاصل کر کے نام پیدا کرنا نہیں بلکہ ایسے بیٹوں کو جنم دینا اور پالنا ہے جو ملت کی خدمت کر سکیں۔

دولت کما کر مرد کی قید سے آزادی کا خواب دیکھنا یورپی میڈیا کی نحوست اور آئین شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ مرد اگر عورتوں کو اسلام کے مطابق انکے حقوق ادا نہ کریں تو عورتیں شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اپنے حقوق وصول کر سکتی ہیں۔ انہیں بغاوت کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

عورتوں پر مردوں کے ظلم کے واقعات کی خبریں اخبارات میں آتی رہتی ہیں بعض اتنی بھیانک ہوتی ہیں کہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کئی مرد حق طلاق کو غلط استعمال کرتے ہیں، کئی عورتوں کو محبت اور توجہ سے محروم رکھتے ہیں۔ ان مسائل کا حل قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کے پاس نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات عام کرنے، ان پر عمل پیرا ہونے اور سیرتِ طیبہ کی روشنی میں اپنے کردار اور رویوں کو درست کرنے میں پوشیدہ ہے۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کو چاہیے

کہ اسلام میں پوری طرح داخل ہو جائیں تو ان کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

مصادر و مراجع

(1) ترمذی شریف' مجتبائی پریس دہلی' جلد 2 صفحہ 159

(2) ابن ماجہ' مجتبائی پریس دہلی' صفحہ 134

(3) ترمذی شریف' مجتبائی پریس دہلی' جلد 1 صفحہ 138

(4) ابوداؤد' مجتبائی پریس دہلی' جلد 1 صفحہ 298

(5) The Webster Family Encyclopedia Vol.19, P-434

(6) Lexican Universal Encyclopedia Vol.20, P-192

(7) Samraj by Elaine Aron

(8) The Glory of Muhammad by Mian Abid Ahmed, Searat International Pakistan, P-44

(9) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 2' ص 771

(10) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 2' ص 771

(11) فتاویٰ رضویہ' امام احمد رضا خان بریلوی" رضا فاؤنڈیشن لاہور' جلد 12' ص 173

(12) ابوداؤد' مجتبائی پریس دہلی' جلد 12 صفحہ 201

(13) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 1' ص 198

(14) ابوداؤد' مجتبائی پریس دہلی' جلد 2 صفحہ 353

(15) مسلم شریف' اصح المطابع، کراچی' جلد 2' ص 330

(16) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 1' ص 190

(17) مشکوٰۃ شریف' مطبع اسلامی' لاہور' ص 419

(18) بناتِ اربع' مولانا محمد نافع' تخلیقات لاہور' ص 119

(19) بناتِ اربع' مولانا محمد نافع' تخلیقات لاہور' ص 187

(20) بناتِ اربع' مولانا محمد نافع' تخلیقات لاہور' ص 205

(21) بناتِ اربع' مولانا محمد نافع' تخلیقات لاہور' ص 234

(22) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 1' ص 179

(23) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 1' ص 532

(24) تذکارِ صحابیات' طالب ہاشمی' البدر پبلی کیشنز' لاہور' ص 495

(25) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 1' ص 74
(26) تذکارِ صحابیات' طالب ہاشمی' البدر پبلی کیشنز لاہور' ص 520
(27) ابن ماجہ' مجتبائی پریس دہلی' صفحہ 134
(28) مسلم شریف' اصح المطابع، کراچی' جلد 1' ص 475
(29) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 2' ص 740
(30) تذکارِ صحابیات' طالب ہاشمی' البدر پبلی کیشنز لاہور' ص 94
(31) مسلم شریف' اصح المطابع، کراچی' جلد 2' ص 312
(32) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 2' ص 884
(33) نسائی شریف' اصح المطابع، کراچی' جلد 2' ص 53
(34) مشکوٰۃ شریف' مطبع اسلامی' لاہور' ص 154
(35) تذکارِ صحابیات' طالب ہاشمی' البدر پبلی کیشنز لاہور' ص 356
(36) ریاض الصالحین' امجد اکیڈمی' اردو بازار' لاہور' ص 170
(37) مشکوٰۃ شریف' مطبع اسلامی' لاہور' ص 390
(38) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' محمد رضا مصری' دارالقلم بیروت' ص 260
(39) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 2' ص 865
(40) مسلم شریف' اصح المطابع، کراچی' جلد 2' ص 409
(41) ابن ماجہ' مجتبائی پریس دہلی' صفحہ 21
(42) ابن ماجہ' مجتبائی پریس دہلی' صفحہ 21
(43) بخاری شریف' قدیمی کتب خانہ، کراچی' جلد 1' ص 120
(44) ترمذی شریف' مجتبائی پریس دہلی' جلد 2 صفحہ 228
(45) سیرت عائشہؓ ' سید سلیمان ندوی' شوکت بک ڈپو گجرات' ص 259
(46) حدائق بخشش' امام احمد رضا خان بریلویؒ رضوی کتب خانہ، بریلی' جلد 3' ص 27
(47) ترمذی شریف' مجتبائی پریس دہلی' جلد 1 ص 133

عورتوں کے مسائل اور ان کا حل

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج

استاذ الفقہ والتفسیر، شعبہ علوم اسلامیہ،

جامعہ کراچی

عورتوں کے مسائل اوران کا حل

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج

(ا) بیواؤں کی شادی کا مسئلہ

جس معاشرہ میں کنواری لڑکیاں اپنے رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہوں، وہاں بیوہ عورتیں اپنے مقدروں کو نہ روئیں تو کیا کریں۔ کنواریوں میں تو پھر بھی کنوار پن کی کشش ہوتی ہے۔ جس میں اکثر جہیز آڑے آجاتا ہے۔ بیوہ عورتوں میں بیوگی کا ''عیب'' ہی انکی غیر مقبولیت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اِلّا یہ کہ ان کا عیب، ان کی مالداری میں چھپ جائے تو یہ بات دیگر ہے۔ اور یہ بھی صرف ان بیواؤں کے لئے ہے جو خوبصورت، جوان اور پرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لاحقے سے محفوظ ہوں۔ بچوں کے ساتھ، بیوہ عورتوں سے شادی کرنا ہمارے معاشرے کا چلن ہی نہیں۔

حالانکہ قرآن مجید نے مردوں کو دوسری تیسری اور چوتھی شادی کی اجازت اسی تناظر میں دی ہے۔ یہ اجازت انہی بیواؤں کی مرہونِ منت ہے مگر حیرت ہے کہ جن بیواؤں کے دم قدم سے مردوں کو یہ سہولت (Opportunity) دی گئی تھی، وہی عورتیں مردوں کے اس فیض صحبت سے محروم ہیں۔ گویا

ع پردہ ہمارے نام سے اٹھا عید منائی لوگوں نے

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً......﴾ (النساء:3)

ترجمہ: اگر تم اس اندیشے میں ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو تو ان (یتیموں کی) ماؤں سے نکاح کر لینا جو تمہیں مرغوب ہوں۔ دو دو، تین تین، چار چار.........اور اگر تمہیں ان کے مابین عدل نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرنا۔

گویا ایک سے زائد شادیوں کی اجازت عدل کی شرط پر موقوف ہے اور جہاں ادائی شرط کی استطاعت نہ پائی جائے وہاں یہ حکم ہے کہ دوسری شادی سے گریز کیا جائے۔ اس لئے کہ شادی صرف وظیفہ زوجیت کی ادائیگی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ فریق ثانی کی تمام تر سماجی و معاشی ضرورتوں کی کفالت بھی اس میں شامل ہے۔

بیوہ عورتیں اپنے نکاح میں خود مختار بنائی گئی ہیں۔ وہ اپنے نکاح میں کسی ولی کی اجازت کی محتاج نہیں ہیں۔ اس مقام پر بیوہ عورتیں، کنواریوں سے ایک درجہ اونچی معلوم ہوتی ہیں۔ کنواری عورتوں سے نکاح کے باب میں، پورے قرآن مجید میں کسی ایک مقام پر بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ وہ اپنے نکاح منعقد کرنے میں خود مختار بنائی گئی ہیں۔ البتہ نکاح کرنے میں انکی آزاد مرضی کا عمل دخل سو فیصد تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اس آزاد مرضی کو ان کے اولیاء کی اجازت پر موقوف کیا گیا ہے۔ یہ گھریلو معاملات میں اسلام کا حسن انتظام ہے۔ تاہم اگر کسی کنواری کے حق میں یہ مبدّل بہ سوئے انتظام ہو جائے تو اسے اولیاء کی مرضی سے ہٹ کر از خود نکاح کرنے کی یقیناً اجازت ہوتی ہے۔ مگر یہ استثنائی صورت حال ہے۔ عمومی صورتحال وہی ہے۔ جو اوپر مذکور ہوئی۔

مگر بیوہ عورتوں کو قرآن مجید کی رو سے یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنا معاملہ از خود طے

کریں اوران کے اولیاء انہیں سہولیات فراہم کریں۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط﴾ (البقرہ 234)

ترجمہ: اور جب بیوہ عورتیں اپنی عدت پوری کرلیں تو وہ اپنی ذات کے بارے میں معروف طریق پر جو چاہیں فیصلہ کریں، اس کا تم پر کوئی بار نہیں ہے۔

اپنے حق میں پسندیدہ طریق پر کچھ کرنے سے مراد بالعموم نکاح کو لیا جاتا ہے، تاہم اس سے مراد نکاح ثانی کی غرض سے زینت وغیرہ کرنا بھی مراد ہوسکتا ہے۔ بہر دوصورت بیوہ عورت اپنے معاملات میں خود مختار کردی گئی ہے۔ اگلی آیت کو دیکھتے ہوئے اول الذکر مراد زیادہ صحیح اور برمحل دکھائی دیتی ہے۔ بالمعروف کی قید سے پتہ چلتا ہے کہ یہ امرِ مشروع پسندیدہ طریق پر ہونا چاہئے۔ قرآن مجید نے طریق نکاح کو معروف کے لفظ سے بیان کر کے خود نکاح کے ''امر معروف'' ہونے کو واضح کردیا ہے۔

مطلب یہ کہ قرآن کی رو سے بیوہ عورت کا نکاح ''امر معروف'' ہے۔ جو لوگ اسے عار سمجھتے ہیں وہ قرآن کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دراصل بیوہ عورتوں سے نکاح، ہندو معاشرت کے اثر سے ہمارے کلچر میں بطور عار کے داخل ہوا ہے' حالانکہ اسلامی معاشرت میں اسے امر معروف قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں مردوں کو بیوہ عورتوں سے نکاح پر ابھارا گیا ہے:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ط عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ط وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ط﴾ (البقرۃ:235)

ترجمہ: اس پر تمہارا کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ جو تم اشارۃً (بیوہ) عورتوں کو نکاح کا

پیغام دو یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ان کا خیال رکھو گے لیکن ان سے خفیہ وعدہ مت کرو۔ ہاں پسندیدہ بات بیشک کہو اور نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو، یہاں تک کہ مقرر کیا ہوا وقت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔

اس آیت سے جو نکات سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

1- بیوہ عورتوں کو ایام عدت میں نکاح کا اشارہ دیا جا سکتا ہے۔ اس اشارہ سے مقصود، بیوہ عورتوں کی دلجوئی ہے تاکہ وہ اپنے شوہر کے صدمے سے خود کو ہلاک نہ کر لیں۔ تمہارے پیام نکاح سے ان میں توانائی اور ایک نئی امنگ پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بچوں کے لئے نئی زندگی کا ذریعہ ثابت ہو گی۔ ہندو معاشرت میں مرحوم شوہر کے ساتھ بیوہ کو ستی کرنے کا رواج تھا۔ جبکہ معاشرت میں بیوہ کو پیغام نکاح سے نئی زندگی کی نوید سنائی گئی ہے۔

2- بیوہ عورتوں سے کسی خفیہ وعدہ کو منع کیا گیا ہے کیونکہ خفیہ وعدہ انہیں کسی غلط راہ پر ڈال سکتا ہے۔

3- حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتَابُ اَجَلَهٗ میں کتاب سے مراد عدّت ہے۔ جو فرض کی گئی ہے۔ مطلوب یہ کہ بیوہ جب تک عدّت میں ہو، اس وقت تک نکاح کا صراحتاً ذکر ممنوع ہے۔

4- وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّکَاحِ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقدۂ نکاح کا فاعل مرد ہوتا ہے۔ اس لئے اسے ناکح کہا جاتا ہے اور عورت کو منکوحہ۔

بیوہ عورت سے نکاح صرف عمل مسنون ہی نہیں، ایک سماجی ضرورت بھی ہے۔ سماجی ضرورت یوں کہ شوہر دیدہ اور لذت آشنا عورت کا مرد کے بغیر رہنا، کنواری کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اگر بیوہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے تو اس کے خراب ہونے کا امکان کنواری کے مقابلے میں زیادہ

ہوتا ہے۔اس لئے اسلام کی معاشرت میں بیوہ عورتوں سے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ خود بیواؤں کو ان کے اپنے نکاح کا خود مختار بنادیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی آزاد مرضی سے خود اپنے شوہر منتخب کریں۔ یہاں تک کہ اگر اس کے مرحوم شوہر نے اس کے لئے وصیت کردی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ کو ایک سال تک نان نفقہ اور سکنیٰ فراہم کیا جائے۔ یعنی عدت کے بعد بھی سات ماہ بیس دن تک اس کی معاشی ضروریات کی کفالت کا ذمہ لیا جائے۔ تب بھی وہ اس امر کی مجاز ہے کہ بعد از عدت اپنی زندگی کا نیا ساتھی تلاش کرلے اور اپنا گھر بسالے، البتہ اس صورت میں اسے مرحوم شوہر کی وصیت والے نان و نفقہ سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ﴾ (البقرہ:240)

ترجمہ: اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے عورتیں چھوڑ جائیں (تو انہیں چاہئے کہ) اپنی عورتوں کے لئے وصیت کر جائیں کہ انہیں ایک سال تک گھر سے نکالے بغیر، انکی معاشی ضروریات پوری کی جائیں۔ ہاں اگر وہ خود (اپنے مرحوم شوہر کا) گھر چھوڑ دیں تو تم پر اس کا کوئی بار نہیں، جو انہوں نے بھلائی سے اپنے حق میں کیا ہے۔

آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی وصیت کو، عورت کی ضرورت کے پیش نظر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس میں عورت کو یہ اذن حاصل ہے کہ وہ اگر چاہے تو وصیت سے ایک سال تک فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ یوں قرآن مجید نے بیوہ عورت کو کم از کم ایک

سال تک کی معاشی کفالت کا انتظام، مرحوم شوہر کے دیگر ورثاء کے ذمہ لگا دیا ہے اور اس عرصہ میں باقی زندگی کے لئے کسی نئے "کفیل" کو ڈھونڈنے کی اجازت بھی دے دی ہے۔

سورۃ النساء کی آیت نمبر 4 میں مسلمان مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بیوہ عورتوں کو اپنا شریک حیات بنائیں۔ سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 141 اور 235 میں خود بیوہ عورتوں کو اپنے نکاح کا خود مختار و مجاز بنایا گیا ہے اور سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 235 میں مردوں کو، بیواؤں سے نکاح کرنے پر ابھارا گیا ہے اور اب وہ آیت دیکھئے جس میں معاشرہ کے اجتماعی ضمیر کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ وہ تمام بے نکاحوں کے نکاح کرانے کی فکر کریں۔

﴿وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ......﴾ (النور:32)

ترجمہ: اور جو تم میں بے نکاحے ہوں، تم ان کے نکاح کراؤ۔

آیت میں ایامیٰ کا لفظ آیا ہے۔ یہ لفظ بہت جامع ہے۔ ایامیٰ، ایم کی جمع ہے اور ایم کا لفظ ہر مجرد یعنی بے نکاح شخص کو بولا جاتا ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مجرد کی دو قسمیں ہیں:

1- جس نے ابھی تک نکاح نہ کیا ہو۔

2- نکاح تو کیا ہو مگر اب وہ اپنا زوج کھو چکا ہو۔

جو لوگ بیوہ عورتوں کو نکاح ثانی سے روکتے ہیں انہیں غور کرنا چاہئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن تو اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری یہ قرار دے رہا ہے کہ وہ تمام بے نکاحوں کے نکاح کی سبیل پیدا کریں نہ کہ رکاوٹ۔ سبیعہ بنت الحارث الاسلمیہ اپنے شوہر کے انتقال کے وقت حاملہ تھیں۔ وضع حمل کی مدت بہ اختلاف روایات چالیس دنوں پر مشتمل تھی۔ وضع حمل کے بعد جب انہوں نے نکاح کا ارادہ کیا تو اسے برا سمجھا گیا چنانچہ انہوں نے نبی رحمت علیہ التحیہ والسکینت سے مسئلہ دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگر تو نکاح ثانی کرنا چاہتی ہے تو کر، کیونکہ وضع حمل سے تیری عدت پوری ہو چکی ہے۔ (یعنی چار ماہ دس دن مکمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے)۔ گو اس روایت میں بنیادی

طور پر تعین عدت میں اختلاف کی صورت کا بیان پایا جاتا ہے۔ تاہم اس سے بیوہ عورت کے نکاح ثانی کی تعجیل کا بھی پتہ چلتا ہے۔

بیواؤں سے نکاح کرنے کی فضیلت اور اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے آقا و مولا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کا پہلا نکاح جس خاتون سے کیا تھا وہ بیوہ ہی تھیں۔ اور وفات ام المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد بھی آپ نے بیشتر نکاح، جن عورتوں سے کیے وہ بیوائیں تھیں۔

کم سنی کی شادی، بچوں سے زیادتی

نکاح دو ایسے افراد کے مابین سماجی معاہدہ کا نام ہے۔ جو عاقل و بالغ ہوں۔ اور برضا و رغبت ایک دوسرے کو قبول کریں۔ مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ ہمارے معاشرے میں یہ وہ سماجی معاہدہ ہے کہ جو دو غیر عاقل و بالغ افراد کے لئے کوئی تیسرا فرد بھی انجام دے سکتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جن کے بارے میں یہ معاہدہ کیا گیا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اپنی صغر سنی اور بے عقلی کی وجہ سے انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ ان کی آئندہ کی زندگی کا فیصلہ ان کے بزرگوں نے اپنے اختیار سے کر دیا ہے اور اب ان کے لئے اس فیصلے پر آمنا وصدقنا کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

پاکستان کے دیہی علاقوں بالخصوص سندھ، پنجاب اور بلوچستان میں اس طرح کے نکاحوں کا رواج بہت زیادہ ہے۔ شاید اسی لئے وہاں کے مرد، جب جوان اور سمجھدار ہو کر اپنی عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو اپنی پسند کی ایک شادی اور کرتے ہیں اور یوں پہلی بیوی کو عضو معطل بنا کر رکھ چھوڑتے ہیں جب کہ تلافی (Compensation) کے طور پر اپنی جائیداد غیر منقولہ میں بالعموم اسی کو شریک بنا دیتے ہیں۔ اس طرح اپنی دوسری بیوی کو چاہتوں میں شریک کرتے ہیں لیکن عموماً اپنی جائیداد میں عضو معطل بنا دیتے ہیں۔ یوں دونوں بیویاں ہی مرد کے ظلم کا شکار ہوتی ہیں۔

اس ضمن میں اسلامی تعلیم یہ ہے کہ ایسے نکاحوں کو روکا جائے۔ کیونکہ عمر نکاح، بلوغ کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور یہ بلوغ، جہاں جسمانی ہوتا ہے وہیں عقلی بھی ہوتا ہے۔ جب تک یہ دونوں بلوغ اکٹھے نہ ہو جائیں تو اس وقت تک یہ رشتہ قائم نہیں ہونا چاہیے (استثنائی صورتیں، اس عموم سے خارج ہیں)۔

قرآن کی رو سے نکاح کا تعلق بلوغ سے ہے:

﴿وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ.﴾ (النساء:6)

ترجمہ: اور یتیموں کی جانچ کرتے رہو، یہاں تک کہ وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں۔

آیت میں بلوغ کے بجائے ''نکاح'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ نکاح، بلوغ کو مستلزم ہے۔ لہٰذا کم عمری کی شادی، از روئے قرآن صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لڑکے کا سن بلوغ کامل طور پر اٹھارہ اور لڑکی کا سترہ سال ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک پندرہ سال ہے۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ شادی کے لئے فقط جسمانی بلوغ ہی کافی نہیں ہوتا، عقلی بلوغ بھی لازم ہوتا ہے، جیسا کہ حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ کے ساتھ آیا ہے۔

﴿فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ.﴾ (النساء:6)

ترجمہ: اور اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔

اس فقرہ میں عمر نکاح کو رشد (عقلی بلوغ) کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ ویسے تو یہ قرآنی حکم مال کی حوالگی یعنی قبضہ و تصرف کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے۔ مگر اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جب مال کی اہمیت اس قدر ہے کہ وہ بغیر رشد کے ''بالغوں'' کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تو کسی ''جان'' کو فقط جسمانی بلوغ کے ثبوت پر کیسے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ کیا ہماری نگاہ میں کسی کا ''وجود'' مال سے بھی کم تر ہے کہ جسے حوالے کرنے کیلئے کسی رشد (عقلی پختگی)

کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی دوسرے یہ کہ جس طرح بعض صورتوں میں بلوغ کی علامات ظاہر نہیں ہو پاتیں مگر عمر ہو جاتی ہے تو اس صورت میں ہمارے پاس عقلی بلوغ (رشد) وہ واحد پیمانہ ہوتا ہے کہ جس سے حقیقی طور پر جواز نکاح کو ناپا جاسکتا ہے۔ اس لئے بتقاضائے نص نکاح کے لئے جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ، عقلی صلاحیت بھی اس درجہ کی درکار ہونی چاہیئے جس درجہ کی حوالۂ مال میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔

ازدواجی زندگی کے قیام واستحکام، مسرت وشادمانی اور ذہنی مطابقت وموافقت کا راز، دراصل ان دونوں صلاحیتوں کی یکساں موجودگی میں ہی ممکن ہے اور ان میں سے کسی ایک بھی صلاحیت کا مفقود ہو جانا، شادی کی لازوال مسرتوں کو، حسرت ویاس اور زوال شادمانی میں تبدیل کر دینے کے مترادف ہے۔

والدین بالعموم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی جلد از جلد شادیاں کر دیں۔ اس فرض کو نبھانے میں وہ اس قدر تیزی اور مستعدی دکھاتے ہیں بچوں کو بڑا بھی نہیں ہونے دیتے کہ کسی کے پلے باندھ دیتے ہیں یا کم از کم منسوب کر دیتے ہیں اور اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا فرض منصبی ادا کر دیا ہے حالانکہ والدین کا اولین فرض یہ بنتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی بہتر سے بہتر تعلیم وتربیت کریں۔ ان کے اندر نیکی کا جوہر پیدا کریں اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق انہیں معاش پیدا کرنے کے قابل بنائیں تا کہ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو سکیں۔ جہاں تک شادی کا تعلق ہے یہ خود ان بچوں کا حق ہے، جسے استعمال کرنے کا موقع انہی کو ملنا چاہیئے۔ البتہ اس سلسلے میں انکی رہنمائی ضرور کی جانی چاہیئے بچوں کو اس طرح تربیت دینے سے ان میں ذمہ دارانہ احساس پیدا ہوتا ہے۔ جو آگے چل کر ان کی ازدواجی زندگی کی بہتری اور ترقی کا سبب بنتا ہے۔

کم عمری میں شادی نہ ہونے کا ارشاد ہمیں اس آیت سے بھی ملتا ہے:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ.﴾ (النساء:3)

ترجمہ: پس تم ان عورتوں سے نکاح کرو، جو اچھی، عمدہ اور پاکیزہ ہوں۔

پہلی بات تو یہ کہ فَانْکِحُوْا صیغہ امر ہے، یعنی حکم شرعی ہے اور یہ حکم غیر مکلف کو نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ بچہ، اپنی طفولیت کے باعث، اس حکم کا مخاطب نہیں۔ اس لئے وہ نکاح بھی نہیں کرسکتا۔

دوسرے کہ اس آیت میں ''مَاطَابَ لَکُمْ'' بھی آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو ان عورتوں سے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو عمدہ اور پاکیزہ ہوں اور صغر سنی میں بچہ، عورت کی عمدگی اور پاکیزگی کو نہیں جان سکتا۔ اس لئے بھی چھوٹی عمر میں نکاح نہیں ہوسکتا۔

تیسرے یہ کہ آیت میں ''اَلنِّسَآءِ'' کا لفظ موجود ہے۔ جس کا مفہوم ''عورتیں'' ہیں نہ کہ بچیاں، چنانچہ النساء کا لفظ، خود انگلی رکھ کر بتا رہا ہے کہ شادی کے لئے فریق ثانی کا ''عورت'' ہونا ضروری ہے۔ غرض کہ یہ آیت بھرپور طریقے سے کم سنی کی شادی کی ممانعت کا اعلان کر رہی ہے۔

کم سنی کی شادی کے خلاف اس آیت میں بھی استدلال موجود ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْهًا﴾ (النساء19)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہاری لئے حلال نہیں ہے کہ عورتوں کے جبراً وارث بن جاؤ۔

جب بالغ عورتوں کے ساتھ زبردستی نکاح کرنے سے روکا گیا ہے تو نابالغ بچیوں سے نکاح کرنا، بدرجہ اولیٰ جبر میں آئے گا۔ اس لئے کہ کوئی نابالغ بچی اپنی پسند اور مرضی کے اظہار و بیان میں نااہل تصور کی جاتی ہے اور بالفرض اگر وہ اظہار بھی کردے تو بھی اس کا اظہار، شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً غیر معتبر قرار پائے گا۔ کیونکہ اظہار اور چیز ہے اور فریق ثانی کی حیثیت سے معاہد بننا اور۔ نکاح صرف اظہار پسندیدگی کا نام نہیں ہے بلکہ عملاً ایک معاہدہ کا نام ہے۔

کم سنی میں شادی کے خلاف یہ آیت بھی ہمارا مستدل بنتی ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ......﴾ (البقرہ:228)

ترجمہ: اور مطلقہ عورتیں تین حیض تک انتظار کریں۔

اس آیت میں مطلقہ مدخولہ کی عدت تین قروء (حیض یا پھر طہر) بتائی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ بچیوں سے نکاح صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بصورت طلاق مع ادخال ان کی عدت کا کوئی پیمانہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ عدم حیض کی وجہ سے ان پر حالت طہر کا بھی اطلاق نہیں ہوسکے گا کہ طہر کے لئے حیض کا ہونا بھی ضروری ہے اور کم سنی میں اس صفت کا ہونا مفقود ہے۔

مناسب ہوگا کہ یہاں قروء کی قدرے وضاحت کردوں، قروء، قرء کی جمع ہے اور قرء دراصل حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہونے کا نام ہے۔ بایں صورت یہ لفظ ذو معنیین ہے۔ اس لئے دونوں حالتوں کا جامع ہے۔ اس لئے بعض اوقات دونوں میں سے کسی ایک معنی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ خصوصیت صرف اسی لفظ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وہ اسم جو دو معنوں کے لئے وضع کیا گیا ہو وہ الگ الگ بھی ہر ایک کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ جیسے مائدہ کا لفظ، جو دسترخوان اور طعام دونوں کے لئے وضع کیا گیا ہے مگر دونوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ پس ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کا مطلب ہوگا۔ عورت کا تین دفعہ حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہونا۔ چنانچہ اس لفظ سے بھی پتہ چلا کہ حالت عموم کے تحت نابالغی کا نکاح ناقابل فہم ہے۔

صغر سنی کی شادی کی ممانعت پر، اس آیت سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے:

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ (البقرہ:223)

ترجمہ: تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، پس جب چاہو تم اپنی کھیتیوں میں جاؤ اور اپنے لئے (کچھ) آگے بھیجو۔

اس آیت میں بیویوں کو شوہروں کی کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں عورتوں کے بلوغ کی موجودگی بہت واضح اور نمایاں نظر آتی ہے۔ کیونکہ صحبت باہمی (جو نکاح کو مستلزم ہے) کا مقصود حقیقی نسل انسانی کو بڑھانا ہے اور ظاہر ہے کہ نابالغ لڑکی اپنے کاشت کار کے لئے کھیتی کا کردار ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اس لئے نسل انسانی کو بڑھانے کا سبب بھی نہیں بن سکتی۔

آیت حیض میں بھی نابالغی کے نکاح کی ممانعت پر صاف دلیل موجود ہے:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ط قُلْ هُوَ اَذًى ط فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ج فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ط﴾ (البقرہ:222)

ترجمہ: اور آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ بتا دیجئے کہ یہ ضرر رساں چیز ہے۔ پس حالت حیض میں بیویوں سے الگ رہو بلکہ (مقاربت کے لئے) ان کے نزدیک بھی نہ جاؤ۔ یہاں تک کہ وہ پاک وصاف ہو لیں۔ پھر جب خوب اچھی طرح نہا لیں تو (بغرض صحبت) ان کے پاس جاؤ۔ جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا۔

یہاں سوال کی نوعیت حالت حیض میں صحبت کرنے کی ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ جواب سے معلوم ہو رہا ہے؛ جس کے لئے ''اَذًى'' میں اشارہ صحبت کی طرف ہے نہ کہ حیض کی طرف۔ مطلب یہ کہ حیض میں بذات خود، کوئی ضرر نہیں، البتہ اس میں صحبت کرنا دونوں کے لئے ضرر رساں ہے تبھی تو مقاربت سے روکا گیا ہے۔

حالت حیض میں بیویوں کے پاس جانے کی ممانعت کا حکم اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ عورتیں مکمل طور پر بالغ ہو چکی ہیں۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نابالغی میں عورت کا نکاح، اسلام کو مطلوب نہیں ہے۔

کمسنی کی شادی پر مجوزین نے قرآن کی ایک آیت سے استدلال کیا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کو بھی سمجھ لیا جائے۔

﴿وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ﴾ (الطلاق:4)

ترجمہ: اور جو تمہاری عورتیں (بوجہ زیادتی عمر) حیض سے مایوس ہو چکیں، اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور ان کی عدت بھی تین ماہ ہے، جنہیں (کسی مرض کے سبب) حیض نہیں آیا۔

بالعموم ہمارے مفسرین نے لَمْ یَحِضْنَ سے مراد لڑکیوں کو لیا ہے جو نابالغ ہوتی ہیں۔ پھر اسی سے انہوں نے ''نابالغی میں نکاح'' کو ثابت کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ واضح ہو کہ عدت کا مسئلہ صحبت و مقاربت کے بعد متحقق ہوتا ہے۔ اس لئے نابالغی میں تین ماہ کی عدت کا مطلب یہ ہوا کہ بچی کے ساتھ، نابالغی میں ''صحبت'' بھی کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ عدم صحبت پر کوئی عدت نہیں ہے۔ ایسے نکاح کو آپ تصور میں لائیے اور بتائیے کہ کیا یہ لڑکی کے ساتھ ظلم نہیں ہے کہ قدرت نے ابھی اسے اس مقصد کے لئے تیار بھی نہیں کیا۔ اور ہم اسے اپنی جنسی خواہش کا نشانہ بنا رہے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے ''شریعت'' بھی سمجھ رہے ہیں۔ کیا کسی ایسے بچے کو گوشت کھلایا جاسکتا ہے جو ابھی تک صرف دودھ پیتا ہو؟ کیا کسی ایسے بچے کو دوڑایا جاسکتا ہے، جس نے ابھی صحیح طور پر چلنا بھی نہ سیکھا ہو؟ کیا کسی ایسی بچی کو صحبت کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے جو جنسی معاملات اور دوطرفہ ملاپ کی خبر بھی نہ رکھتی ہو اور نہ فریق مخالف کو جھیلنے کی سکت اپنے اندر پاتی ہو۔ کیا ہمارے علماء یہ فقہی مسئلہ بھول گئے کہ حرہ بالغہ کے ساتھ بغیر مرضی و رضامندی کے صحبت نہیں ہوسکتی۔ پھر کس قدر ظلم ہے کہ ایک طرف تو یہ مسئلہ ہو اور دوسری طرف اس نابالغ بچی سے زبردستی صحبت کرنے پر اصرار ہو۔ جو ابھی تک ضرورت نکاح کی تفہیم سے ہی عاری ہو۔ پھر ایسی بچی بھلا اس فعل پر اپنی

مرضی کیسے بتا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بچی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا وہ مکمل طور پر یک طرفہ اور بالجبر ہوگا اسلامی معاشرے کو چھوڑ یئے ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بھی انسانی معاشرے میں ایسے جبر کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے خیال میں یہاں "لَمْ يَحِضْنَ" سے مراد جو "صغیرہ" کو لیا گیا ہے۔ دراصل یہ اسی کا شاخسانہ ہے، حالانکہ ہمارے مفسرین نے صغیرہ کے ساتھ ایک مفہوم اور بھی اخذ کیا ہے اور ہمارے نزدیک وہ مفہوم درست بھی ہے، مگر افسوس کہ درست ہونے کے باوجود، وہ مفہوم ان کے ہاں سند قبولیت حاصل نہ کر سکا۔ تاہم یہ بھی بساغنیمت ہے کہ اسے ضمنی حیثیت کا درجہ تو مل گیا اگر یہ بھی نہ ملتا تو ہم کیا کر سکتے تھے۔

اسی موخرالذکر مفہوم کی وجہ ترجیح و تقدیم میں ہمارے پاس وہ قرآنی دلائل ہیں۔ جن سے کم سنی کی شادی کی ممانعت ہوتی ہے (اور جو اوپر مذکور ہوئے) جبکہ مجوزین کے پاس، سوائے اس مقام کے، کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے اور ان کے حق کو دلیل کی جو کچھ بھی حقیقت اور حیثیت ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

واضح رہے کہ جس طرح مرد کے بلوغ کا تعین احتلام یا پھر سن سے ہوتا ہے، اسی طرح عورت کے بلوغ کا تعین، حیض یا پھر عمر سے ہوتا ہے۔ اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوا کہ عورت کو حیض نہ آنا اس کے نابالغ ہونے کو مستلزم نہیں ہے۔ اس طرح کی عورتوں کو باعتبار حیض نہ سہی باعتبار عمر بالغ تصور کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس آیت میں ایسی ہی بالغ عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں تمام عمر حیض نہیں آتا۔ (4)

ذیل میں ہم ان مفسرین کے اقوال درج کئے دیتے ہیں جنہوں نے لَمْ يَحِضْنَ کی تفسیر دونوں طرح سے کی ہوئی ہے:-

1- مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یعنی وہ صغیرہ ہوں یا عمر تو بلوغ کی آ گئی مگر ابھی تک حیض نہ شروع ہوا، انکی عدت بھی تین ماہ ہے۔ (5)

2- مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حیض خواہ کم سنی کی وجہ سے نہ آیا ہو یا اس وجہ سے کہ بعض عورتوں کو بہت دیر میں حیض آنا شروع ہوتا ہے اور شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عورت کو عمر بھر نہیں آتا۔ (6)

3- پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وہ عورتیں جو ابھی نابالغ ہوں جن کو حیض تو نہیں آیا لیکن وہ عمر کے اعتبار سے بالغ ہو گئی ہوں۔ (7)

4- مولانا صلاح الدین یوسف فرماتے ہیں:

واضح رہے کہ نادر طور پر ایسا ہوتا ہے کہ عورت سن بلوغت کو پہنچ جاتی ہے اور اسے حیض نہیں آتا۔ (8)

مذکورہ بالا چاروں مفسرین نے لَمْ يَحِضْنَ کی دوسری تفسیر ان عورتوں سے کی ہے جو جسمانی طور پر اتنی پختہ ہوگئی ہیں کہ انہیں بالغ ہی تصور کیا جاتا ہے تاہم کسی سبب سے انہیں حیض نہیں آپاتا۔ اس لئے ایسی عورتیں اگر کسی کی منکوحہ بن جائیں تو ان پر ''صغیرہ'' کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ اور باعتبار عمر ایسی پختہ جسم کی بالغ لڑکیوں سے نکاح و صحبت دونوں جائز ہوں گے۔

اس مقام پر مولانا حافظ فرمان علی (اہل تشیع) کا حاشیہ قابل توجہ ہے' فرماتے ہیں:

''اس سے وہ عورتیں مراد نہیں جو ابھی بالغ نہیں ہوئیں، کیونکہ اس کے لئے عدت نہیں بلکہ وہ عورتیں مقصود ہیں جن کا سن حیض ہو چکا مگر کسی وجہ سے خون حیض نہ آیا، اس کا عدت تین مہینے ہے''۔ (9)

گویا اس مقام پر انہوں نے لَمْ یَحِضْنَ کی صرف ایک ہی تفسیر کی ہے اور یہ وہی تفسیر ہے جو ہمارا مختار بھی ہے۔ لَمْ یَحِضْنَ کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے بہت عمدہ اور علمی تجزیاتی بحث فرمائی ہے۔ میں چاہوں گا کہ یہ بحث انہیں کے الفاظ میں نقل کر دوں۔ ملاحظہ کیجئے:

واضح رہے کہ عربی زبان میں صرف سادہ نفی کے لئے "ما" اور "لا" کے الفاظ آتے ہیں اور "لم" کا لفظ نفی جحد کے لئے آتا ہے یعنی ایسی نفی کے لئے جو انکار اور جحود پر مشتمل ہو۔ یعنی "لم" کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مقابلے میں واقعی طور پر یا اقتضائے حال کے طور پر مخالف اڈعا پایا جاتا ہو۔ جس کا انکار مقصود ہو۔ ماحضن اور لم یحضن میں فرق ہی یہ ہے کہ ماحضن کے معنی ہیں کہ انہیں حیض نہیں آیا، جہاں کہیں حیض آنے کی نفی کرنی ہو وہاں آپ ماحضن کہہ سکتے ہیں لیکن لَمْ یَحِضْنَ اس وقت کہہ سکتے ہیں جب آپ کا مخاطب یہ دعویٰ کر رہا ہو کہ حیض آ چکا ہے لیکن آیا نہیں ہے اسے انکار و جحود کی نفی کہتے ہیں۔ ماحضن میں وہ شدت نہیں ہے جو لَمْ یَحِضْنَ میں ہے۔ جو لڑکیاں بالغ ہو چکی ہیں وہاں اقتضائے حال کا یہ تقاضا بلکہ اڈعا ہوتا ہے کہ انہیں ماہواری ایام ہوتے ہیں۔ اس اڈعا کی تردید ماحضن کے لفظ سے نہیں ہو سکتی اس کے انکار و جحود کے لئے لَمْ یَحِضْنَ کہنا ضروری ہوگا اس کے برعکس جو لڑکیاں کمسن اور نابالغ ہیں ان کے سلسلے میں نہ کوئی دعویٰ موجود ہے کہ انہیں ماہواری ایام آتے ہیں اور نہ ہی اقتضائے حال کا یہ تقاضا اور اڈعا ہے۔ لہٰذا ان کے لئے لَمْ یَحِضْنَ کہنا اصولی طور پر غلط اور وضاحت کے خلاف ہے۔ وہاں ماحضن ہی کہنا ہوگا۔ وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ کو

کمسن اور نابالغ لڑکیوں پر چسپاں کرنا اصول فصاحت کے لحاظ سے بھی غلط ہے۔(10)

روایات کی رو سے کمسنی کی شادی کے جواز پر ایک بڑی دلیل سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عمر سے بھی دی جاتی ہے، جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق چھ سال اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق سات سال کی عمر میں ہوئی اور رخصتی نو سال کی عمر میں، اس سلسلہ میں کئی جوابات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

1- ہمارے خیال میں یہ شادی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائص میں سے ہے کیونکہ نکاح وطلاق میں آپ کے لئے احکام جداگانہ معلوم ہوتے ہیں اور یہ امر بجائے خود کسی تفصیلی مضمون کا متقاضی ہے۔

2- یہ شادی نکاح کے سلسلہ میں قرآنی احکام نازل ہونے سے بہت پہلے واقع ہوئی، مطلب یہ کہ شادی مکہ میں ہوئی تھی اور نکاح کے سارے احکام مدینہ میں اترے، اس لئے یہ نکاح الا ماقد سلف کے تحت درست قرار پاتا ہے۔

3- بخاری و مسلم کی روایات پر تفصیلی محاکمہ علمائے کرام نے لکھے ہوئے ہیں، اس سلسلے میں علامہ نیاز احمد کی کشف الغمۃ عن عمرام الامۃ (2 جلدیں) علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ القرآن دیکھی جاسکتی ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد موقعوں پر ارشاد فرمایا ہے کہ باکرہ کا نکاح اس کی اجازت اور مرضی سے کیا جائے۔(11)

ظاہر ہے کہ نابالغی میں بچیوں کے نکاح اس ضمن میں نہیں آسکتے پس ایسے نکاحوں سے فرمان رسول کی بھی مخالفت لازم آتی ہے جس سے احتراز لازم ہے۔

(ب) پسند کی شادی ایک سماجی ضرورت

ہر عاقل و بالغ فرد کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی پسند کی شادی کرے۔ انسان کے بنیادی حقوق میں یہ انتہائی اہم حق ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے معاشرے میں اس کا چلن پسندیدہ قرار نہیں دیا جاتا۔ بالخصوص خواتین اس ظلم کا شکار ہوتی ہیں۔ انہیں بعض خاندانی مجبوریوں اور رسم و رواج کے تحت اس ظلم کا شکار کیا جاتا ہے اور اگر کبھی وہ اپنے اس حق کو استعمال کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں تو بطور سزا پورے خاندان سے کاٹ دی جاتی ہیں، انہیں عاق کر دیا جاتا ہے۔ بعض حالات میں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ خود ان کا باپ یا بھائی یا کوئی رشتہ داران کا تعاقب کرتا رہتا ہے اور اس طرح وہ اپنی تمام عمر، خوف اور بے گانگی کے سائے میں بسر کرتی ہیں۔ پسند کی شادی چونکہ انسان کی حریت فکر و عمل کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اس لئے جس معاشرہ میں لوگوں کو پسند کی شادی کی اجازت نہ ہو اسے آزاد اسلامی معاشرہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قرآن مجید نے مردوں کو پسند کی شادی کا حکم دیا ہے:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ.﴾ (النساء:3)

ترجمہ: پس تم ان عورتوں سے نکاح کرو، جو اچھی، عمدہ اور پاکیزہ ہوں۔

طاب کے معنی کسی چیز کے عمدہ اور پاکیزہ ہونے کے ہیں، (لسان العرب) اسی سے طیب بنا ہے۔ طیب وہ چیز ہے جس سے حواس اور نفس دونوں کو لذت حاصل ہو۔ (1) اس لئے مَا طَابَ لَكُمْ سے مراد وہ عورتیں ہوں گی جن کی عمدگی اور پاکیزگی کی طرف انسانی نفس اس طرح مائل ہو کہ ان سے حصول لذت کا طالب نظر آئے۔

مَا طَابَ لَكُمْ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے لئے پسندیدگی شرط ہے اور ظاہر ہے کہ پسندیدگی کے لئے دیکھنا بھی لازمی ہے۔ اس لئے اسلامی شریعت کی رو سے شادی کے لئے عورت کو نہ صرف دیکھنے کی اجازت ہے بلکہ نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک

انصاری صحابی کو باقاعدہ دیکھنے کا حکم دیا تھا۔ (2)

سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا، یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! میں مدینہ منورہ کی ایک لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں، آپ نے پوچھا کیا تم نے اس لڑکی کو دیکھ لیا ہے۔ مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: جی نہیں' یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! اس پر آپ نے فرمایا۔ شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لو، کیونکہ یہ اس سے بہتر ہے کہ بعد میں پچھتاوا ہو۔

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور صحابی نے خود اپنا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا کہ اس نے ایک لڑکی کو علم ہوئے بغیر چوری چھپے دیکھا اور پھر اسے شادی کی پیشکش کی۔ (3)

اسی لئے علماء جمہور نے نکاح سے پہلے عورت کو دیکھنے کے جواز کا فتویٰ صادر کیا ہے، البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ دیکھنا عورت کی رضا مندی سے ہونا چاہئے یا بغیر رضا مندی کے، مگر اس اختلاف سے نفس مسئلہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس سے یہ مسئلہ ضرور مستنبط ہوتا ہے کہ اگر عورت کو اس کی رضا مندی کے ساتھ دیکھا جائے گا تو یہ ناممکن ہے کہ مرد کا دیکھنا یک طرفہ ہو۔ یقیناً یہ دیکھنا دو طرفہ ہوگا۔ ہمارے خیال میں جس طرح مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے اسی طرح عورت بھی مرد کو دیکھ سکتی ہے۔ مگر ہمارے اکثر مذہبی گھرانوں میں اس پر عمل نہیں ہوتا۔ نکاح عموماً مرد یا عورت کو دیکھے بغیر ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ، شادی کے بعد اکثر باہمی اختلافات کی صورت میں نظر آتا ہے۔

پسند کی شادی جس طرح مرد کا حق ہے وہیں مرد کی پسند پر قبولیت اور عدم قبولیت کا انحصار بہرحال عورتوں کی آزاد مرضی پر منحصر ہے۔

﴿لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ (النساء:19)

ترجمہ: تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ عورتوں پر زبردستی قبضہ کرلو اور نہ انہیں جبرا اس غرض کے لئے روک رکھو کہ جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ واپس مل جائے، سوائے اس کے کہ وہ کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوئی ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی میں مرد کی پسند کے ساتھ ساتھ عورت کی پسند کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں عورت کی پسند اور ناپسند کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا۔ صرف مردوں کی پسند کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

شوہر کے انتخاب میں عورتوں کی پسند کی اہمیت کا اندازہ ان احادیث سے لگایا جاسکتا ہے، جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کو لڑکی کی اجازت پر موقوف کیا ہے۔

وَالْبِكْرُ تُسْتَأْذَنُ فِيْ نَفْسِهَا وَاِذْنُهَا صَمَاتُهَا(3)

ترجمہ: اور کنواری سے اس کے نکاح کے بارے میں اجازت لینی چاہئے اور اس کی خاموشی کو اجازت پر محمول کرنا چاہئے۔

اسی طرح نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑکیوں کے باپوں کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ وہ باپ ہونے کا فائدہ نہ اٹھائیں بلکہ نکاح کے سلسلے میں اپنی بیٹیوں کی پسند کا پورا پورا لحاظ رکھیں۔

وَالْبِكْرُ يَسْتَأْذِنُهَا اَبُوْهَا فِيْ نَفْسِهَا وَاِذْنُهَا صَمَاتُهَا۔ (4)

اور کنواری سے بھی اس کا باپ اجازت لے، اگر وہ خاموش رہے تو اسے اجازت سمجھا جائے۔

سیدہ خنساء بنت حزام انصاری رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ان کے والد نے انکی مرضی کے خلاف کہیں اور نکاح کر دیا تھا وہ شوہر دیدہ تھیں اور انہیں یہ نکاح پسند نہ تھا وہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ نے وہ نکاح رد فرما دیا۔ (5)

سیدنا ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک عورت نے آکر عرض کیا، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! میرے دیور نے مجھے نکاح کا پیغام دیا تھا جسے میرے باپ نے مسترد کر دیا ہے اور میرا نکاح وہاں کر دیا ہے جہاں مجھے پسند نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے والد کو بلوایا اور اس سے صورتحال معلوم کی، عورت کے باپ نے کہا کہ میں نے اس کے نکاح میں کسی اچھائی کو ترک نہیں کیا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ نکاح نہیں ہوا۔ اور (عورت سے فرمایا) جاؤ، جس سے چاہو نکاح کر لو۔ (6)

اگر کوئی نکاح لڑکی کی مرضی کے مطابق ہوا ہو اور اس نکاح میں لڑکی کے باپ کا مشورہ شامل نہ ہو۔ تب بھی اس نکاح کو نکاح صحیح سمجھا جائے گا۔ اس مسئلہ کو درج ذیل روایت کی روشنی میں دیکھیے:

> سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی بیٹی (یعنی اپنی بھتیجی) کا نکاح منذر بن الزبیر سے کر دیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن موجود نہیں تھے۔ جب وہ آئے تو انہوں نے ناراض ہو کر کہا کہ اے خدا کے بندو! کیا مجھ ایسے شخص کی بیٹی کا نکاح اس کے مشورے کے بغیر کیا جاسکتا ہے؟ اس پر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خفگی کے لہجے میں فرمایا کیا تمہیں منذر پسند نہیں؟ (7)

مذکورہ بالا روایت میں جس طرح لڑکی کی مرضی کا لحاظ کرتے ہوئے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے لڑکی کا نکاح فرمایا۔ اسی طرح ایک ماں نے بھی اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر کر دیا تھا جسے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے درست قرار دیا۔ ذیل میں وہ روایت ملاحظہ کیجیے:

عَنْ عَلِيٍّ اَنَّهُ اَجَازَ نِكَاحَ امْرَأَةٍ بِغَيْرِ وَلِيٍّ اَنْكَحَتْهَا اُمُّهَا بِرِضَاهَا. (8)

ترجمہ: سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک ایسی عورت کے نکاح کو جائز قرار دیا جس کا نکاح بغیر اذن ولی کے اس کی ماں نے اس کی مرضی سے کر دیا تھا۔

ان تمام روایات میں جو چیز مشترک ہے۔ وہ لڑکی کی پسند اور مرضی ہے جسے ہر حال میں اولیت دی گئی ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں یہ چیز اجنبی بن کر رہ گئی ہے اس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

نکاح میں ''ایجاب وقبول'' کے صیغے اس امر کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ مرد وعورت دونوں اپنی اپنی پسند میں کاملاً خود مختار بنائے گئے ہیں۔ مگر ہمارے غیر اسلامی کلچر نے نکاح کی جوہریت کو فنا کر کے رکھ دیا ہے۔ کتنی خواتین ایسی ہیں جو بھیڑ بکریوں کی طرح کسی بھی کھونٹے سے باندھ دی جاتی ہیں اور جو اس طرح نہیں بندھنا چاہتیں انہیں بے حیاء، بدچلن اور آوارہ منش قرار دے دیا جاتا ہے۔

باب نکاح میں عورت کے انتخاب کا مسئلہ بھی اتنا ہی زیادہ اہم ہے جتنا مرد کے انتخاب کا۔ قرآن نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ (البقرہ: 187) لباس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ جسم کے مطابق ہو اور جو لباس بدن کے مطابق نہ ہوا سے نہیں پہنتے، تاکہ شخصیت غیر متوازن نہ ہو۔ ''هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ'' کا مطلب یہی ہے کہ عورتیں مردوں کا ذوق انتخاب ہیں اور ''وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ'' کا مطلب یہ ہے کہ مرد، عورتوں کا ذوق انتخاب ہیں۔ یوں مرد وعورت دونوں ایک دوسرے کے پسند فرمودہ ہوتے ہیں۔ چاہتوں کے اٹوٹ انگ بن کر تمام زندگی محبتیں بکھیرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے دلچسپی کا سامان بنے رہتے ہیں۔ ذہنی آسودگی کا یہ سفر دونوں کو تازیست خوش وخرم

رکھتا ہے۔ میاں بیوی کی یہ محبتیں اور پسندیدگیاں ان کے بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ ایسے جوڑوں کے بچے نفسیاتی اور اخلاقی الجھنوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ غربتوں میں بھی خوشحال نظر آتے ہیں۔ مقابلتہً ان جوڑوں کے جو مارے باندھے کے زندگی گزار رہے ہوتے ہیں' باوجود مالدار ہونے کے بیمار اور پریشان نظر آتے ہیں۔ باہمی نفرتوں اور عدم محبتوں میں اپنی زندگی کے دن پورے کرے رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ وقت سے پہلے بوڑھے اور مضمحل ہوجاتے ہیں ان کی عائلی زندگی کا زہر، ان کے بچوں میں تلخیاں گھول دیتا ہے۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوکر اخلاقی اور نفسیاتی مفاسد کا شکار ہوجاتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ اس طرح کے جوڑے معاشرہ کو اچھی پروڈکشن دینے سے قاصر ہوتے ہیں اس لئے دوطرفہ پسند کی شادی صرف مرد وعورت کی ہی ضرورت نہیں بلکہ ہمارے سماج کی بھی ضرورت ہے۔

(ج) جہیز، ایک معاشرتی بوجھ

جہیز سے مراد وہ سامان ہے جو شادی کے وقت لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے والوں کو دیا جاتا ہے۔ اس سامان کو شادی کا لازمہ تصور کیا جاتا ہے۔ جو یہ سامان نہ دے یا نہ دے سکتا ہو تو وہاں شادی کا تصور تک نہیں کیا جاتا۔ یہ سامان جہیز ایک طول طویل فہرست پر مشتمل ہوتا ہے' جو ضروریات اور تحسینیات سے بڑھ کر تعیشات تک جا پہنچتا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ سامان بالکل فرمائشی نوعیت کا ہوتا ہے جسے پورا کرنا لڑکی والوں کی ذمہ داری قرار دیا جاتا ہے اور جہاں یہ فرمائشی نہیں ہوتا وہاں بھی بالعموم فرمائشی جیسا ہوتا ہے۔ اور اس اہتمام کو لڑکے والوں کی خاموش فرمائش تصور کرلیا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر غریب خاندان کی لڑکیاں اس لعنت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں اور متوسط گھرانے کی لڑکیاں سامان جہیز میں خوب سے خوب تر کی جستجو میں برباد ہوجاتی ہیں۔ جہیز کی طلب اور رسد نے ''نکاح'' جیسے ضروری، فطری' پاکیزہ اور حلال عمل کو پابہ زنجیر کررکھا ہے۔ اس لئے جہیز کی پابندی نے بعض لڑکیوں کو شرم

وحیا سے آزاد کر دیا ہے کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ان میں غربت وافلاس کی وجہ سے "منکوحہ" بننے کی شرط مفقود ہو چکی ہے۔ نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی۔ چاہے جانے کی فطری اور منہ زور خواہش نیز جنسی عمل کی تحریک بالآخر انہیں بد اطواری کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس راہ کا مسافر تمام زندگی تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی بھٹکاتا رہتا ہے۔

جہیز کے فرض، واجب یا سنت ہونے کا کوئی تصور ہماری شریعت میں موجود نہیں ہے۔ شادی کے وقت گھر والوں کی طرف سے بہ طیب خاطر، اگر کوئی تحفہ یا ہدیہ پیش کر دیا جائے تو وہ جہیز کے ضمن میں نہیں آتا۔ پھر یہ کہ تحفہ کی شرعی حیثیت اس لزوم کے ساتھ بھی بہر حال نہ تو فرض بنتی ہے نہ واجب اور نہ سنت، زیادہ سے زیادہ اسے مستحب کے زمرہ میں لیا جا سکتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی فعل استحباب کو اپنے اوپر لازم کر لیا جائے تو وہ بدعت بن جاتا ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارا معاشرہ اسی بدعت میں مبتلا ہے۔ شریف بیٹیاں اپنے باپوں کی دہلیز پر زندہ درگور ہو گئی ہیں۔

﴿وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝﴾ (التکویر:8-9)

ترجمہ: اور جب زندہ درگور سے پوچھا جائے گا کہ کس جرم پر ماری گئی۔

ہمارے خیال میں جہیز وہ معاشرتی آلۂ قتل ہے جس سے ہماری بیٹیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ معاشرے کا اجتماعی ضمیر اس قتل عام کو روکنے میں اپنا مؤثر کردار ادا کرے۔

جہیز کا لفظ آج جس معنی میں بولا جاتا ہے عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس معنی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ جہیز کے سنت ہونے کی غلط فہمی جس روایت سے اخذ ہوئی ہے۔ پہلے ہم وہ روایت درج کرتے ہیں اور بعد میں اس کی تفصیل پیش کریں گے:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ جَهَّزَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ فِيْ خَمِيْلٍ وَّقِرْبَةٍ وَّوِسَادَةٍ حَشْوُهَا اِذْخِرٌ۔ (1)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نکاح کے لئے تیار کیا اور انہیں ایک چادر، ایک مشکیزہ اور ایک ایسے تکیے کے ساتھ جس میں گھاس بھری ہوئی تھی روانہ کیا۔

یہ روایت جس عنوان کے تحت آئی ہے وہ یہ ہے جھاز الرجل ابنتہ اور اس کا ترجمہ یہ کر دیا گیا ہے۔ اپنی بیٹی کو جہیز دینے کا بیان۔ (2) ظاہر ہے کہ جب جہاز کا ترجمہ جہیز سے کر دیا جائے گا تو پھر اسے سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماننے کی سبیل پیدا ہو جائیگی۔ اس طرح روایت میں جہز کا ترجمہ بھی مذکورہ مترجمین نے ''جہیز'' کے لفظ سے کیا ہے۔ اور جہیز چونکہ ہمارے ہاں ایک خاص مفہوم میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس غلط فہمی کا پیدا ہونا بھی قدرتی امر ہے۔ حالانکہ از روئے لغت، الجہاز، سفری سامان کو کہا جاتا ہے۔ سفری سامان چونکہ مسافر کی ضرورت ہوتا ہے۔ اس لئے آگے چل کر ہر اس سامان کو کہا جانے لگا جو کسی کی ضرورت ہو اور تجہیز کا لفظ سامان سفر کے اٹھانے یا بھیجنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کی تائید کے لئے آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ﴾ (یوسف:59)

ترجمہ: اور جب انہیں، ان کے سامان سے تیار کر دیا۔

اس معنی کے رو سے بوقت نکاح سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کچھ ضروری سامان کا بھیجنا' ہمارے معاشرہ کے روز مرہ میں استعمال ہونے والے ''جہیز'' سے کسی طرح بھی لگا نہیں کھاتا۔ کیونکہ اس مفہوم کی ایک روایت سنن ابن ماجہ میں جو آئی ہے، اس میں اس سامان کی نسبت صیغۂ مفرد کے بجائے صیغۂ تثنیہ میں کی گئی ہے۔ اور تثنیہ کے صیغے سے جو مفہوم بنتا ہے وہ علی اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں کو دینے کا بنتا ہے اور ظاہر ہے کہ ''جہیز'' کی نسبت مرد کی طرف نہیں کی جاتی، روایت ملاحظہ ہو۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جاء الی علیا

وفاطمة وهما في خميل لها والخميل القطيفة البيضاء عن الصوف قد كان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم جهز هما بها ووسادة محشوة اذخرا وقربة.(3)

ترجمہ: روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما کے پاس تشریف لائے اور وہ دونوں ایک چادر میں تھے۔ یہ وہ چادر تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کو دی تھی اور یہ سفید اونی چادر تھی۔ نیز ایک تکیہ بھی دیا تھا، جس میں گھاس بھری ہوئی تھی اور ایک مشکیزہ بھی دیا تھا۔

اس روایت میں ''جہیز'' کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں جہز اپنے لغوی معنی میں ہے نہ کہ اردو زبان کے اصطلاحی معنی میں۔

پھر اس جہیز کی حقیقت یہ ہے کہ وہ سامان، جو سیدہ فاطمہ رضی اللہ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس مہر کی رقم سے خریدا گیا تھا' جو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مقرر ہوا تھا۔ ایک روایت کی رو سے نبی محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حطمی زرہ کو مہر قرار دے دیا تھا۔ (4) اور اس سامان کے لئے اس زرہ کو بیچا گیا تھا۔ اس لئے اس سامان کو ہم عرفی جہیز سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

دراصل اس سامان کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ شادی کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما کو ایک نئے مکان میں شفٹ کرنا تھا۔ جو انہیں ان کے ایک صحابی سیدنا نعمان بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اسی مقصد کے لئے گفٹ کیا تھا۔ چنانچہ نئے مکان میں شفٹ ہونے کے لئے ضروری اشیاء کا ہونا بھی ضرور تھا۔ اس سامان کی علت بس یہی تھی۔ اس لئے اسے کسی طرح بھی ''جہیز'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر یہ جہیز ہوتا تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح کا سامان اپنی دوسری بیٹیوں

کو بھی دیتے۔ آپ کی ازواج مطہرات بھی اپنے ساتھ ایسا کچھ سامان ضرور لاتیں۔ آپ نے اپنی بیٹی کو جو کچھ دیا تھا وہ چونکہ علی رضی اللہ عنہ کے مہر کی رقم سے خریدوا کر دیا تھا۔ بایں صورت اسے ''بری'' کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مقابلۃً جہیز کے۔

ہمارے یہاں بری اس سامان کو کہا جاتا ہے جو لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی ڈالوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں دلہن کے ملبوسات، زیوارات، بناؤ سنگھار کا سامان اور خشک میوہ جات وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اسی ''بری'' کو لڑکی کا مہر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کوئی ہے جو سوچے اور سمجھے؟

مصادر ومراجع

(ا)

1-عن الامام الاعظم ان اسن للغلام تمام ثمانی عشرۃ سنة واللجارية تمام سبع عشرۃ سنة. سید محمد آلوسی بغدادی (متوفی 1270ھ) الجزء الرابع ص204، مکتبہ امدادیہ، ملتان، سنۂ اشاعت درج نہیں ہے۔

2- سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آدمی کی عقل اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب وہ پچیس سال کا ہو جاتا ہے اور اطباء کا کہنا ہے کہ جو پچیس سال کو ہو گیا وہ اپنی عقل کی انتہا کو پہنچ گیا۔ یہاں انتہا سے مراد "رشد" کو لیا گیا ہے۔ (دیکھئے تفسیر روح المعانی، الجزء الرابع، صفحہ 206)

3-امام راغب اصفہانی (متوفی 502ھ) المفردات فی غریب القرآن، کتاب القاف، صفحہ 402، نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی، سنۂ اشاعت درج نہیں۔

4-بعض النساء يعشن الى ان يمتن ولا يحضن (الجزالثامن والعشرون، صفحہ 137)

5-خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، طابع وناشر الجد داحمد رضا اکیڈمی، کراچی (حاشیہ، بر متعلقہ آیت، سورۃ طلاق) سنۂ اشاعت درج نہیں۔

6- تفہیم القرآن، جلد پنجم، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، طبع چہارم 1974ء، حاشیہ نمبر 13، سورۃ الطلاق۔

7-ضیاء القرآن، جلد پنجم، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ لاہور، 1400ھ، حاشیہ نمبر 13، سورۃ الطلاق۔

8- قرآن کریم مع اردو ترجمہ وتفسیر، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب، حاشیہ زیر آیت، سورۃ الطلاق۔

9- قرآن مجید مترجم، پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ کراچی نمبر 5، سنہ اشاعت درج نہیں، حاشیہ بر آیت متعلقہ، سورۃ الطلاق۔

10-فقہ القرآن، خاندانی معاملات (نکاح وطلاق وغیرہ) ادارۂ فکر اسلامی، کاشانہ حفیظ،

240، ایسرداس اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ، کراچی نمبر 3 طبع دوم 2002ء صفحہ 113-112۔

11-والبکر تستاذن فی نفسها اذنها صماتها. الصحیح المسلم، رقم الحدیث 3362، 3373 والبکر یستاذنها ابوها فی نفسها واذنها صماتها. الصحیح المسلم، رقم الحدیث 3374.

(ب)

(1) امام راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، واصل الطیب ماتستلذہ الحواس وما تستلذہ النفس۔

(2) الصحیح المسلم، رقم الحدیث 3381، باب ندب من اراد نکاح امراۃ الی ان ینظر الی وجهها وکفیها قبل خطبتها.

(3) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ترجمہ پروفیسر خالد عزیز، 292، بیکن بکس، قذافی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، اشاعت دوم 2005ء۔

(4) الصحیح المسلم، رقم الحدیث 3372، قدرے تغیر لفظی کے ساتھ ایک اور حدیث متصل ہے۔ (3373)

(5) ایضاً 3374

(6) الصحیح البخاری، جلد اول ص 478-477، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی۔ 1381ھ

(7) امام ابوبکر بن ابی شیبہ (متوفی 235ھ) المصنف جلد 4-2، صفحہ 134-133، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی 1406ھ۔

(8) ایضاً صفحہ 134

(9) ایضاً صفحہ 133

(ج)

(1) سنن نسائی، جلد 2۔ رقم الحدیث 3388۔

(2) سنن نسائی مترجم، دوست محمد شاکر، محمد عبدالستار قادری، جلد 3، صفحہ 425، فرید بک اسٹال،

اردو بازار لاہور، بار دوم 2000ء۔

(3) سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد باب ضجاع ال محمد، جلد 2 رقم الحدیث، 1953، صفحہ 547، بار اول 1983ء فرید بک اسٹال اردو بازار لاہور۔

(4) امام یوسف زرقانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1122ھ) مصابیح السیر المحمدیہ (فی شرح کتاب المواہب الدنیہ) مطبوعہ ازہریہ، مصر، 1335ھ، میر خواند محمد بن خاوند بن محمود ہروی (متوفی 903ھ)۔ روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء۔ مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ 1891ء (بحوالہ فقہ القرآن، حقوق نسواں اور باہمی تعلقات، مولانا عمر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، طبع سوم 2003ء صفحہ 438۔440، ادارۂ فکر اسلامی، گارڈن ایسٹ، کراچی نمبر 3)

سماجی برائیوں کے انسداد کے لئے
خواتین کا کردار
(تعلیمات نبوی کی روشنی میں)

ڈاکٹر محمد سجاد
شعبہ اسلامی فکر، تاریخ وتہذیب
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

سماجی برائیوں کے انسداد کے لئے خواتین کا کردار

(تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں)

ڈاکٹر محمد سجاد

وہ آفتاب رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کی کرنوں نے تاریکی عالم کو روشنی میں بدل دیا، وہ ہادی کامل جس کی ہدایت و رہنمائی میں نسل انسانی اپنی منزل پر پہنچی، وہ محسن انسانیت رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین کی ذات مقدس ہے کہ جس کا نام نامی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ آفتاب رسالت (ﷺ) کی نورانی کرنوں نے پہلے ریگزارِ عرب کو منور کیا پھر کائنات انسانی کی تاریکیوں کو مٹانے کے اسباب پیدا کئے۔ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسان کو اس کی حقیقی اور سچی قدروں سے آگاہ کیا۔ وہ سبق یاد دلایا جو انبیاء اور مصلحین دیتے رہے۔ ان کو اس جاہلیت سے نکالنے کا عزم کیا جس نے انہیں انسانیت کے عظیم مقام و مرتبہ سے نکال کر حیوانیت کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ آپ نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح فرمائی اور معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہ رہا جس تک آپ کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔

دنیا کی تاریخ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثال ایک منفرد مثال ہے کہ آپ نے دنیا کے سب سے زیادہ بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کر کے اسے قیامت تک کے لئے دنیا کا سب سے زیادہ اصلاح یافتہ معاشرہ بنا دیا۔ ''وادی غیر ذی زرع'' کو جس نے گلشن بنا دیا۔ اور سرزمین حجاز کے صحرائی کلاس روم میں معلم صدق و صفا سے درس

لینے والی تہذیب نا آشنا قوم دیکھتے ہی دیکھتے اقوام عالم کیلئے عدل و انصاف، اخوات و مساوات امن و آشتی، الفت و محبت کی علمبردار بن گئی۔ جو رہزن تھے وہ رہبر بن گئے۔ جو امی محض تھے وہ متعدد علوم و فنون کے موجد بن گئے۔ جو بے شمار رذائل اخلاق میں مبتلا اور ان کے خوگر تھے وہ مکارم اخلاق کے معلم و داعی بن گئے۔ جو بدعمل اور نفس پرست تھے وہ عصمت و عفت کے محافظ بن گئے۔ جو بے قید حصول معاش کے عادی اور اسراف و تبذیر کے خوگر تھے۔ وہ مال و دولت کے امین بن گئے۔ یہ تھا وہ عظیم سماجی و معاشرتی انقلاب جو محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن تربیت کی بدولت برپا ہوا۔ آپ (ﷺ) نے معاشرہ کے ہر فرد کی تربیت فرمائی اور معاشرہ انسانی کی بنیادی اکائی یعنی عورت کی تربیت اور مقام و مرتبہ کا خصوصاً اہتمام کیا۔ کیونکہ یہی وہ شخصیت ہے جس کی زیر تربیت معاشرہ کی نوخیز نسلیں پروان چڑھتی ہیں اور معاشرہ اسی کے وجود کے سائے میں صلاح و فلاح کی منزلیں طے کرتا ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کو بحیثیت ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے معاشرہ میں ممتاز مقام دیا۔ اور انہیں حیثیات کی بدولت ایک عورت معاشرہ میں جو اصلاح اور فلاح کا کام کر سکتی ہے اسے اس کی ذمہ داری اور فرائض میں شامل کر دیا۔

سماجی اصلاح میں خواتین کے کردار کی اہمیت

معاشرہ کی اصلاح کی ذمہ داری جس طرح مرد پر ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر عورت پر بھی ہے۔ عورت پوری انسانیت کا نصف ہے۔ ہر سوسائٹی اور معاشرے میں اس کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے بھی اور آئندہ نسل کو تیار کرنے کے لحاظ سے بھی، عورت نسل انسانی کا کوئی معمولی جزو نہیں کہ جسے نظر انداز کر دیا جائے اور تعمیر و تشکیل معاشرہ کا کوئی قابل ذکر کام ہو سکے۔ جس طرح ایک پہیہ کی گاڑی کا تصور ممکن نہیں ہے اسی طرح عورت کے بغیر معاشرہ کا تصور بھی مضحکہ خیز ہے دراصل یہی وہ شخصیت ہے جو قومی تعمیر

اور اصلاح کا بنیادی اور اہم ترین کام کر رہی ہے۔ جس کے بغیر معاشرہ اور اقوام کی اصلاح ناممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصلاح معاشرہ کے کام میں باشعور خواتین بہت عمدگی سے اپنا حصہ ادا کر سکتی ہیں۔ بلکہ معاشرے میں نمودار ہونے والے مختلف غلط رجحانات اور بے شمار سماجی برائیاں ایسی ہیں جنہیں خواتین اوّل قدم پر ہی انفرادی کوششوں سے روکنے کا سب سے زیادہ اور مؤثر کام کر سکتی ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے خواتین کی مومنانہ صفات کو تفصیل سے بیان کیا ہے تاکہ ہر خاتون پہلے انفرادی سطح پر قرآن حکیم کے بتائے ہوئے ان خدوخال کو سروپا میں جذب کر لے اور پھر اپنے حسن عمل اور سیرت و کردار سے پورے معاشرے کی اصلاح کر لے۔ تاکہ ایک ایسی ہستی اور معاشرہ وجود میں آئے جو تمام برائیوں سے پاک و مبرا ہو۔ وہ مومنانہ صفات مندرجہ ذیل ہیں۔

مسلمات

وہ خدا کی فرمانبرداری کرنے والی اور اس کے غصے سے بچنے کی کوشش کرنے والی ہوتی ہیں۔

مومنات

وہ اللہ پر، اللہ کے رسولوں پر، آخرت پر ایمان لانے والی اور اپنے اعمال میں اس ایمان پر قائم رہنے والی ہیں۔

قانتات

وہ اپنی زندگی کے سارے معاملات میں خدا کی طرف جھکنے والی، اس سے اپنی حاجت طلب کرنے والی اور اس پر توکل باندھنے والی ہوتی ہیں۔

صادقات

وہ صاف گو، راست باز اور صادقہ ہوتی ہیں اور جھوٹ سے محفوظ رہتی ہیں۔

صابرات

وہ مشکلات آنے پر راہ حق پر ثابت قدم رہنے والی اور مالک کی مرضی پر مصائب برداشت کرنے والی ہوتی ہیں۔

خاشعات

وہ خدا کے حضور میں پست، اس کے احکام کے تابع اور اس کی مرضی کی پابند ہوتی ہیں۔

متصدقات

وہ اپنے مال میں سے مساکین کا حصہ نکالنے والی، عزیز و اقارب کے حقوق ادا کرنے والی اور صدقہ و خیرات کا اہتمام کرنے والی ہوتی ہیں۔

صائمات

وہ روزہ رکھنے والی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے والی ہوتی ہیں۔

حافظات

وہ اپنی عزت و آبرو کی محافظ، شرم وحیا کی پتلیاں اور باعفت ہوتی ہیں۔

ذاکرات

وہ پیہم اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والی، اس سے لو لگانے والی ہوتی ہیں۔ وہ نیکوکار، پرہیز گار، پاک دامن اور معصوم ہوتی ہیں۔ وہ بھولی بھالی، صاف دل اور نیک طینت ہوتی ہیں۔(1)

انفرادی اور اجتماعی سطح پر خواتین ان آیات کی روشنی میں اپنی سیرت و کردار کی تشکیل کریں تو اس کا پرتو اور اثر اولاد سے لے کر پورے معاشرے پر پڑے اور معاشرہ میں ہر قسم کی اخلاقی، معاشرتی، معاشی و سیاسی برائیاں دور ہو جائیں۔

اہم سماجی برائیاں

حقیقت یہ ہے کہ سماجی سطح پر فرائض اور ذمہ داریوں سے کوتاہی برتنے سے غیر اخلاقی مفاسد کی صورت میں کئی ایک الجھنیں پیدا ہوتی ہیں جن کی وجہ سے معاشرتی برائیاں نمودار

ہوتی ہیں۔قرآن حکیم اور سنت نبوی میں ان برائیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو معاسرہ میں بگاڑ کا باعث بنتی ہیں اور اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو پھر پورے معاشرے کو تباہ برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔ان میں چیدہ چیدہ یہ ہیں:

ناانصافی،رشوت،لین دین کے معاملہ میں بدعنوانیاں،تجارتی اور مقررہ قاعدہ کی کنجوسی اس حدتک کہ اپنے نفس کے علاوہ دوسروں کے لئے کچھ نہ چھوڑنا،اللہ کے راستے میں کچھ نہ دینا، بدچلنی، بدکاری، میاں بیوی کے تعلقات میں موافقت نہ ہونا، طلاق کی کثرت، مختلف طریقوں سے عصمت فروشی، کسی کی بے جا بدنامی اور رسوائی کر کے اس کی دل آزاری کرنا، قمار بازی، چوری، ڈاکہ زنی،قتل،منافقت،غیبت،عیب جوئی، بہتان طرازی، بدگمانی، کسی کو برے القاب سے پکارنا،دوسروں سے فحش اور غیر مہذب انداز میں مخاطب ہونا، جھوٹ بولنا،توہم پرستی،عریانی، فحاشی، جہیز کی لعنت،اس طرز کی بے شمار سماجی برائیاں ہیں جو آج ہمارے میں موجود ہیں۔

سماجی برائیوں کے انسداد میں خواتین کا کردار

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے سماجی برائیاں تو بے شمار ہیں جنہیں ختم کئے بغیر ایک مثالی اور صالح معاشرہ کا وجود ممکن نہیں۔مگر ہم یہاں ان سماجی برائیوں کا خصوصاً تذکرہ کریں گے جو خواتین کے دائرہ کار میں آتی ہیں اور خواتین ہی اوّل قدم پر انہیں ختم کر سکتی ہیں' خواتین شریعت اسلامیہ اور سیرت ازواجِ مطہرات کی روشنی میں ان برائیوں پر قابو پا سکتی ہیں۔چنانچہ ہم تفصیل سے پہلے مختلف سماجی برائیوں اور ان کے اثرات کو بیان کریں گے اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں،ان کو خواتین کس طرح ختم کر سکتی ہیں ان کا ذکر کریں گے۔

1- بے پردگی اور بے حیائی کے اثرات

اسلام جو ضابطہ قدرت ہے اور فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اور اپنے اصولوں

کے مطابق جس معاشرے کی تعمیر کرتا ہے۔اس میں عورت اور مرد کے لئے اس نے الگ الگ دائرہ عمل مقرر کر دیا ہے۔کام کے ان دائروں کو علیحدہ علیحدہ قائم رکھنے کے لئے اس نے مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط کو ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ اس سے معاشرہ میں انتشار اور بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔مگر آج ہمارے معاشرے میں بے پردگی اور بے حیائی عام ہوگئی ہے۔مغربی تہذیب وثقافت کی نقالی کرتے ہوئے خواتین انتہائی باریک اور معمولی لباس زیب تن کرتی ہیں۔زیبائش وآرائش کا اہتمام کیا جاتا ہےاور پھراس کی نمائش کی جاتی ہیں۔اس بے پردگی کے نتیجے میں بے حیائی عریانی وفحاشی جیسی سماجی برائیاں جنم لے رہی ہیں بے پردگی کی وجہ سے لباس اور بناؤ سنگار کے اخراجات بڑھ گئے ہیں۔آمدنیاں پوری نہیں ہوتیں تو ناجائز آمدنیاں پیدا کرنی پڑتی ہیں۔خواتین کا باپردہ ہونا معاسرہ سے کئی ایک سماجی اور اخلاقی برائیوں سے نجات دلا سکتا ہے۔اسی لئے قرآن حکیم نے خواتین کو باپردہ رہنے کی تلقین کی ہے۔

﴿يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ط﴾ (2)

ترجمہ:"اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کے (باہر نکلا کریں تو) اپنے چہروں پر چادر لٹکا (گھونگھٹ نکال) لیا کریں۔یہ چیزیں ان کیلئے موجب شناخت ہوگی اور انہیں کوئی ایذا نہ دے گا"۔

پردہ کا مقصد اخلاق کی بلندی اور معاشرے کی بداخلاقی سے حفاظت ہے معاشرے کی خرابی یا اچھائی پر ہی کسی قوم کی ترقی وتنزلی کا انحصار ہے۔اس مقصد کے پیش نظر پردے کے احکام دئے گئے۔اس کے علاوہ غض بصر اور نمود ونمائش سے بچنے کی تلقین کی گئی۔ارشاد

ہوتا ہے:

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ﴾ (3)

ترجمہ: ''آپ مومن عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی آرائش کو ظاہر نہ ہونے دیں''۔

مگر ان اسلامی تعلیمات کے برعکس نمود و نمائش اور بے پردگی کا رجحان غالب ہے۔ بناؤ سنگھار اور آرائش و زیبائش سے بن سنور کر نکلنے والی خواتین نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کیلئے بھی برائی اور غرق ایمان کا سبب بنتی ہیں۔ ایسی خواتین کی مذمت کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

نِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيْلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُءُوْسُهُنَّ كَاَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيْحَهَا. (4)

ترجمہ: ''جو عورتیں کپڑے میں بھی ننگی ہیں اور دوسروں کو رجھائیں خود دوسروں پر رجھیں اور بختی اونٹ کی طرح ناز سے گردن ٹیڑھی کر کے چلیں وہ جنت میں ہرگز داخل نہ ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پائیں گی''۔

الغرض خواتین کو چاہئے کہ وہ تعلیمات اسلامیہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے ہاں پردہ کو رواج دیں اور اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کریں تاکہ معاشرہ میں جو برائیاں بے پردگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں ختم ہوں۔ اس سماجی برائی کو صرف اور صرف خواتین ہی ختم کر سکتی ہیں۔

2- شہوانیت و عصمت فروشی

سماجی برائیوں میں سب سے بری اور گندی برائی شہوانیت اور بدکاری ہے۔ یہ معاشرہ میں فواحش کی کثرت اور مقبولیت کے سبب سے ہوتی ہے۔ زنا کاری اور

عصمت فروشی سے بہت سی سماجی اور اخلاقی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ معاشرہ کی اخلاقی گروٹ، انتشار اور ذہنی پراگندگی اس کا نتیجہ ہے۔ امراض خبیثہ میں تو ہر زانی اور زانیہ کا مبتلا ہو جانا یقینی تو نہیں مگر ان اخلاقی کمزوریوں سے بچنا کسی کیلئے ممکن نہیں۔ جو فعل قبیح سے لازماً تعلق رکھتی ہیں۔ بے حیائی، بدنیتی اور خود غرضی، خواہشات کی غلامی، ضبط نفس کی کمی، خیالات کی آوارگی، طبیعت میں روانی اور ہرجائی پن یہ سب زناء کے وہ اثرات ہیں جو زانی کے نفس پر مرتب ہوتے ہیں اور یہ سب اثرات اس کی انفرادی زندگی تک محدود نہیں رہتے بلکہ پورا معاشرہ ان اثرات بد سے متاثر ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ عصمت فروشی، بے حیائی، شراب نوشی اور رنگ بو کی یہ محفلیں سماج اور ملک ملت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہوتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے ایسی اخلاق سوز برائیوں کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا﴾ (5)

آج ہمارے معاشرے میں زنا کاری اور گینگ ریپ جیسے سماجی جرائم بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اس میں جہاں مرد شریک ہیں وہاں خواتین بھی ذرائع اور حالات مہیا کرتی ہیں جن کی وجہ سے یہ برائی عام ہو رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس برائی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لم تظهر الفاحشة في قوم قط حتى يعلنوا بها الا فشا فيهم الطاعون ولاوجاع التي لم تكن مضت في اسلافهم الذين مضوا. (6)

ترجمہ: ''جب کسی قوم میں فحاشی کا رواج بڑھتا ہے یہاں تک کہ وہ کھلم کھلا بے حیائی کرنے لگے ہیں تو ایسے لوگوں کے درمیان طاعون اور دیگر بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان کے گزرے ہوئے اسلاف کے زمانہ میں موجود نہیں تھیں''۔

چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ انسانی ایسی ہی بیماریوں سے دو چار ہے مثلاً ایڈز سے ہر معاشرہ خوف زدہ ہے۔ اس کی وجہ بھی شہوانی اور جنسی آوارگی ہے۔ الغرض یہ سماجی اور اخلاقی برائی خواتین اپنے حسن کردار اور پاکیزہ اطوار سے ختم کر سکتی ہیں۔ خواتین کو اپنی اولاد کی تربیت اچھے طریقے سے کرنا ہے، پردہ کو رواج دینا ہے اور عفت و عصمت کی حفاظت کرنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس معاشرہ کی تعمیر فرمائی اس کی اساس میں ایک اہم چیز عفت و عصمت بھی ہے۔ آپ نے مرد و خواتین سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

مَنْ یَضْمَنْ لِیْ مَابَیْنَ لَحْیَیْہِ وَمَا بَیْنَ رِجْلَیْہِ اَضْمَنْ لَہُ الْجَنَّۃَ (7)

ترجمہ: ”جو کوئی مجھے اپنے جبڑوں کے درمیان (زبان) اور اپنی ٹانگوں کے درمیان والی چیز (شرمگاہ) کی ضمانت دے میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں“۔

خواتین کو تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ضبط نفس و تزکیہ نفس سے کام لینا ہے اور ہر اس کام سے بچنا ہے جو اس برائی کا سبب بنتے ہیں۔

3- غیبت و عیب جوئی

ہمارے معاشرہ میں جہاں اور سینکڑوں غیر اخلاقی قباحتیں پیدا ہو چکی ہیں وہاں ایک اور برائی غیبت بھی عام ہے یعنی کسی کی پیٹھ کے پیچھے اس کے عیوب کا تذکرہ کرنا کہ اگر وہ شخص سن یا دیکھ پائے تو برا محسوس کرے۔ غیبت اور عیب جوئی کا چلن جہاں مردوں میں ہے وہاں یہ سماجی برائی عورتوں میں بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ خواتین جہاں بھی اکٹھی ہوتی ہیں ایک دوسرے کے عیوب و نقائص کا تذکرہ شروع کر دیتی ہیں۔ یہ ایسی سماجی برائی ہے جس سے معاشرہ میں تشکیک اور ظن و گمان کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

معاشرے سے الفت محبت، اتحاد واتفاق اور اعتبار واعتماد کی فضا ختم ہو جاتی ہے۔ شریعت اسلامیہ نے اس گناہ کو گناہ عظیم قرار دیا ہے اور غیبت کرنے والے کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے والا قرار دیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ﴾ (8)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سماجی برائی کی سنگینی اور اس کے اثرات کے پیش نظر اس کی مذمت یوں فرمائی۔

الغيبة اشد من الزنا (9)

ترجمہ: ''غیبت زنا سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے''۔

ہمیں چاہیے کہ تعلیمات نبوی پر عمل کرتے ہوئے اس سماجی برائے کے خلاف جہاد کریں۔ پہلے خود اس برائی سے بچیں پھر دوسروں کو اس سے منع کریں۔

4- بدگمانی وتجسّس

دنیا میں انسان مل جل کر معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ اس معاشرے کی اجتماعی زندگی میں بے شمار نفسیاتی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن میں ایک نفسیاتی الجھن بدگمانی ہے جن لوگوں میں یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے وہ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی بے بنیاد چیزوں پر اپنی بدگمانی پر عظیم عمارت تعمیر کر لیتے ہیں۔ اس وہم اور بدگمانی کی بنا پر معاشرے میں بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اعتماد و بھروسہ، حسن نیت جیسی صفات ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ برائی بھی خواتین میں مردوں کے برعکس کچھ زیادہ ہی ہے اور ظاہر ہے خواتین ہی اس سماجی برائی کو ختم کر سکتی ہیں۔ قرآن حکیم نے اس سماجی برائی کے مفاسد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾ (10)

ترجمہ: اے ایمان والو بہت سی بدگمانیوں سے بچا کرو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے اور تجسس نہ کیا کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسی برائی سے منع فرمایا ہے۔

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تجسسوا (11)

الغرض بدگمانی، تجسس، غیبت وعیب جوئی جیسی سماجی برائیاں خواتین ہی ختم کرسکتی ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم میں سے ہر ایک ان برائیوں سے بچے اور پھر پورے معاشرے سے ان کا تدارک کرے۔

5-ذات پات اور برادری ازم

ہمارے معاشرے میں دیگر سماجی برائیوں کی طرح ایک اہم سماجی برائی ذات پات اور برادری کی تفریق ہے۔ جو بڑی شدت سے پائی جاتی ہے۔ ہر علاقے اور طبقے میں ذات پات کی تقسیم کی جاتی ہے۔ ذات برادری سے باہر شادی کرنا نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ اگر مرد اپنے سے کم ذات والی عورت سے شادی کرتا ہے تو اس کو خاندان اور برادری والے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اس نہایت بری اور قبیح رسم کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی موزوں رشتہ نہ مل سکے تو لڑکے اور لڑکی کی شادی نہیں ہوسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ غیر اسلامی اثرات اور اسلامی تعلیمات سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے اسلام نے رنگ ونسل، ذات پات، علاقہ، قبیلہ کی تفریق کو ختم کردیا اور اسلامی مساوات پر عالمگیر معاشرے کی بنیاد رکھی جس میں ہر قسم کے تفرقات وتعصبات کے بتوں کو پاش پاش کردیا گیا۔ بنی نوع انسان کو وحدت نسل کا پیغام دیا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (12)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لَافَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ وَّلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ (13)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے نکاح میں ذات برادری کی بجائے حسن وسیرت کو دیکھا جائے انہی ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں خواتین کو ان تعصبات کے خلاف جہاد کرنا ہے اوران معاشرتی ناہموار عورتوں کو جو معاشرے میں اتحاد واتفاق اوارالفت ومحبت کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں ختم کرنا ہے۔

6- جہیز

جہیز دینے کی رسم اتنی عام اور ضروری ہوگئی ہے کہ لوگ جہیز کے بغیر شادی مکمل ہی نہیں سمجھتے اور اس رسم نے ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ ایک پریشان کن معاشرتی مسئلہ اور اقتصادی خرابی بن گئی ہے لوگ یہ تو محسوس کرتے ہیں کہ یہ رسم کس قدر برے نتائج کی ذمہ دار ہے اور اسکی اصلاح کرنا ضروری ہے لیکن معاشرتی دباؤ اور عزت وآبرو کے غلط تصور کی بنا پر سب اس رسم کی تقلید کرتے ہیں حالانکہ یہ ایک بری رسم ہے جو مقامی اثرات اور معاشرتی حالات کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے اور اندھی تقلید کی وجہ سے برقرار ہے۔ ورنہ قرآن حکیم، احادیث مبارکہ اور فقہ میں جہیز کا کوئی ذکر نہیں۔ نام ونمود کی خاطر جہیز دینے والے لوگ نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کیلئے بھی مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔ غریب والدین کی لڑکیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے شادی نہیں کر پاتیں۔ اس رسم بد کی بدولت معاشرہ اخلاقی اور مالی اعتبار سے بدحال ہو جاتا ہے۔ جہیز جیسی سماجی برائی کو کوئی قانون ختم نہیں کر سکتا۔ یہ سماجی برائی خالصتاً خواتین ختم کر سکتی ہیں۔ ذہنی طور پر خواتین کو ان خیالات کی پابندی کرنا ہوگی جو جہیز نہ لانے کی صورت میں ساس بن کر، نند بنکر، بھاوج بن کر تنگ کرتی ہیں اس کے ساتھ ظلم کرتی ہیں۔ اگر ساس بن کر سوچیں تو اس کی بھی بیٹیاں ہیں۔ ظاہر ہے جیسا سلوک کیا جائے گا اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ والدین اپنی بیٹی کو اپنی اپنی بساط کے مطابق جہیز دیں لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ جہیز قرض لے کر دیا جاتا ہے۔ اسی سماجی اور

معاشرتی برائی کے خاتمے میں بھی خواتین ہی اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

7- غیر شرعی رسم ورواج

ہمارے معاشرے میں غیر شرعی رسم ورواج کی کافی تعداد موجود ہے جو غیر اسلامی اثرات جہالت اور خوش فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ رسمیں اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں اور ان میں اکثر اخلاقی اور مالی اعتبار سے معاشرے پر بہت برے اثرات مرتب کرتی ہیں اور معاشرے کی اصلاح و ترقی کیلئے ان بدنما داغوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ غیر شرعی رسم ورواج کو خواتین ہی زیادہ بہتر اور مؤثر طریقے سے ختم کر سکتی ہیں کیونکہ خواتین ہی ان رسموں کی زیادہ پابند ہوتی ہیں مثلاً شادی کے موقع پر منگنی، مہندی، ڈھولک، ناچ، گانا، کھانے کے موقع پر بے دریغ فضول خرچی، جہیز اور دیگر برائیاں ایسی ہیں کہ ان کے بغیر شادی مکمل ہی نہیں سمجھی جاتی۔ یہ تمام خواتین کے دم قدم سے ہیں۔ خواتین اگر ان رسموں کو چھوڑ دیں تو معاشرہ اسراف و تبذیر سے بچ سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مقدسہ پر عمل کرتے ہوئے خواتین کو سادگی اختیار کرنی چاہئے اور ان تمام غیر شرعی رسم رواج سے خود بھی بچنا چاہئے پھر ان کو پورے معاشرے سے ختم کرنا ہے۔

8- فضول خرچی اور نمود ونمائش

ایک اہم سماجی برائی اسراف و تبذیر اور فضول خرچی ہے۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین کچھ زیادہ ہی فضول خرچی کرتی ہیں جس سے معاشرہ میں کساد بازاری اور معاشرتی ناہمواریوں کیلئے جگہ ہموار ہوتی ہے۔ خواتین زیب وزینت اور زیبائش و آرائش کی خاطر بے دریغ خرچ کرتی ہیں اور اس کیلئے طرح طرح کی فرمائش کی جاتی ہیں۔ ان سب کا مقصد ایک دوسرے کو نیچا دکھانا، اور تکبر وغرور کرنا ہوتا ہے اور ضرورت سے زیادہ نمائش بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سماجی برائی ہمارے معاشرے میں عام ہو چکی ہے خواتین کو چاہئے کہ وہ کفایت شعاری پر عمل کریں تاکہ نہ صرف اپنی اور اپنے خاندان کی بلکہ پوری قوم ان کی

کفایت شعاری پر عمل کریں تا کہ نہ صرف اپنی اور اپنے خاندان کی بلکہ پوری قوم ان کی کفایت شعاری سے مستفید ہو سکے۔ قرآن حکیم میں اس سماجی برائی کی یوں مذمت کی گئی۔

﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ﴾ (14)

''اور فضول خرچی نہ کرو بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں''

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فضول خرچی، نمود و نمائش، عیش و عشرت سے منع فرمایا اور ایسی زندگی کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم اِيَّاکَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَيْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ. (15)

''عیش کوشی سے اجتناب کرو کیونکہ اللہ کے بندے عیش کوش نہیں ہوتے الغرض خواتین کو ضرورت سے زائد خرچ نہیں کرنا چاہئے تا کہ معاشرے میں کساد بازاری اور اکتناز و احتکار کا خاتمہ ہو سکے۔

9- رشوت

اسلامی معاشرہ کو تباہ کرنے اور اس کی بنیادیں ہلا دینے والی ایک سماجی برائی رشوت ہے۔ رشوت خوری کے اسباب محرکات پر قابو پانا ضروری ہے۔ رشوت خور ضروریات سے زائد اخراجات اور خواہشات کی کثرت کی وجہ سے اس ذلیل، کمینے فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ خواتین اس سماجی برائی کو یوں ختم کر سکتی ہیں کہ وہ خاندان کے کفیل پر کم سے کم معاشی دباؤ ڈالیں۔ مثلاً وہ نمود و نمائش اور فضول خرچی سے بچیں، ایسی فرمائش نہ کریں جو اس کی استطاعت میں نہ ہو تا کہ کمانے والے پر کوئی معاشی دباؤ نہ ہو کہ وہ ناجائز ذرائع سے ان فرمائشوں کو پورا کرے۔ اس کے علاوہ خواتین کو خاندان کے سربراہ کی آمدنی و اخراجات کو چیک کرنا چاہئے اور حرام مال سے پرورش پانے والی اولاد اطاعت شعار اور سعادت مند نہیں ہو سکتی۔ ماں کی حیثیت سے خواتین کو اپنی اولاد کی تربیت میں اکل حلال کی فضیلت

سے آگاہ کرنا چاہیئے اور حرام سے بچنے کی تلقین کرنی چاہیے۔ نبی کریم (ﷺ) کے ارشادات کی روشنی میں راشی و مرتشی دونوں گناہگار ہیں۔ چنانچہ آپ (ﷺ) نے فرما:

قَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ اَلرَّاشِیُ فِیْ النَّارِ. (16)

ایک اور حدیث مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَعَنَ رَّسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ اَلرَّاشِیُ وَالْمُرْتَشِیُ. (17)

الغرض رشوت ختم کرنیکا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خواتین اپنی ضروریات زندگی محدود کریں، فضول رسمیں و رواج چھوڑ دیں۔ جہیز کی لعنت کا خاتمہ کریں، لباس میں سادگی اختیار کریں، کھانے پینے میں سادگی برتیں، نمود و نمائش چھوڑ دیں، تا کہ خاندان کے کفیل کو مزید آمدنیاں پیدا کرنے کیلئے رشوت جیسے قبیح و مذموم فعل کا ارتکاب نہ کرنا پڑے۔

10- جہالت اور توہم پرستی

توہم پرستی سے مراد دین کی اصل باتوں سے انحراف کر کے خیالی باتوں کی پیروی کرنا اور ان کو اس قدر اہمیت دینا کہ گویا یہ دین ہی کی اصل ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ برائی یعنی توہم پرستی، جادو و کہانت، منتر وغیرہ کی شکل میں بدرجہ اتم موجود ہے اکثر ان میں کم تعلیم یافتہ خواتین مبتلا ہیں، خواتین اس سماجی برائی کے خاتمے کیلئے اس طرح کوشش کریں کہ وہ تعلیم کو عام کریں، بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں خواتین کی اکثریت ناخواندہ ہے، جس کی وجہ سے معاشرتی مسائل کے حل میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتیں، اسلام نے مرد و زن دونوں پر حصول علم فرض قرار دیا ہے۔ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ. (18)

ترجمہ: "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"۔

چنانچہ اگر ہم دین و دنیا میں فلاح و ترقی چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی اولاد خصوصاً بچوں کی تعلیم و تربیت

پر توجہ دینی ہوگی۔ پھر ہی ہم بہترین معاشرہ اور قوم پیدا کر سکتے ہیں۔

11- مغربی سامراج کی اندھی تقلید

کسی معاشرہ میں تہذیب، ثقافت اور بنیادی عقائد و نظریات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ پورے معاشے کی فکری تربیت اسی تہذیب و ثقافت پر ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے کی اپنی تہذیب و ثقافت ہے جس میں اخلاق و کردار، طہارت و پاکیزگی، شرم و حیا، بنیادی اوصاف ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں بڑی تیزی سے جو تبدیلی آ رہی ہے وہ مغربی سامراج کی اندھی تقلید ہے، ہماری نوجوان نسل، شکل و صورت، اخلاق و کردار، رہن سہن، چال چلن، لباس و زیبائش میں اسی تہذیب کی نقالی کر رہی ہے۔ اس ناپائیدار اور اخلاق سوز تہذیب کو ہمارے معاشرے میں رواج دینے اور عام کرنے میں ٹی وی، فلم، اور ذرائع ابلاغ اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مغربی تہذیب و ثقافت کی واضح جھلک خواتین میں نظر آتی ہے۔ آزادی نسواں کا نعرہ لگا کر مادر پدر آزادی کا تصور دیا جاتا ہے۔ سرعام نمود و نمائش اور بے پردگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور ان سب کو ترقی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ مغربی تہذیب کی اس آزادی نے عورت سے اس کی نسوانیت چھین لی ہے، والدین سے ان کی اولاد چھین لی ہے۔ ایسے حالات میں خواتین کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ خواتین کو اس فرنگی تہذیب سے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو بچانا ہے۔ اسوۂ حسنہ میں پناہ لینی ہے۔ اسوۂ ازواج مطہرات کے نقش قدم پر چلنا ہے اور اہل بیت کی پاکیزگی اور طہارت کو اپنانا ہے۔ تاکہ نسل نو کا ہر بچہ محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر، شیخ عبدالقادر جیلانی، الغزالی، ابن رشد اور اقبال بن سکے۔

الغرض اسلام کے عالمگیر و آفاقی پیغام کو پوری دنیا میں پھیلانا اور ظلمت کردہ عالم کو تاریکیوں سے نکالنا، فلاح و سعادت اور ہدایت کی راہ دکھانا امت مسلمہ کی بنیادی ذمہ داری ہے اور اس امت کو پیدا کرنے اور خیر الامم قرار دینے کا مقصد یہی بیان کیا کہ:

﴿کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف
وتنھون عن المنکر﴾ (19)

ترجمہ: ”تم بہترین امت ہو، تمہیں لوگوں کیلئے پیدا کیا گیا، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو“۔

اور یہ اصلاح وفلاح کی ذمہ داریاں مرد وعورت دونوں پر ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرہ کار اور حدود میں دعوت وتبلیغ اور اصلاح کا فریضہ سرانجام دے۔ خواتین جو اس وقت کردار ادا کرسکتی ہیں اسی کی پیش نظر قرآن حکیم میں ان سے مخاطب ہوکر حکم دیا گیا:

وَالْمُؤْمِنٰتِ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.﴾ (20)

ترجمہ: ”مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں“۔

آخر میں ہم درخواست کرتے ہیں اس ماں سے جس کی مقدس آغوش میں معاشرہ پروان چڑھتا ہے۔ جس کی تربیت سے نوخیز نسلیں مستفید ہوتی ہیں۔ اس بہن سے جس کی عفت وعصمت، حیاداری و پاکبازی معاشرہ کی تعمیر وتشکیل میں ممد ومعاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس بیٹی سے جس کی چادر تطہیر سے معاشرہ اخلاق عالیہ سے مزین ہوتا ہے۔ اس زوجہ سے کہ جس کی حسن معاشرت اور خاندان کی تعمیر سے معاشرہ ہر قسم کی سماجی برائیوں سے بچ جاتا ہے کہ وہ اپنے اپنے فرائض کو بخوبی سمجھیں اور ان ذمہ داریوں کو جو دین اسلام اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ذمہ لگائی ہیں ان کو ادا کریں کیونکہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ. (21)

ترجمہ: تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے

بارے میں پوچھا جائے گا''۔

ہمیں چاہئے کہ تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسوہ ازواج مطہرات سے مستفید و مستنیر ہو کر سماجی برائیوں کے انسداد کیلئے کام کریں۔ خود بھی ان برائیوں سے بچیں اور دوسروں کو بھی ان سے بچنے کی تلقین کریں تاکہ معاشرہ امن و سکون، الفت و محبت، اتحاد و یگانگت، حسن عمل و کردار کا بہترین گہوارہ بن جائے۔ (آمین)

مصادرومراجع

1-الاحزاب 25:33

2-الاحزاب59:33

3-النور31:24

4-امام مسلم بن الحجاج،الجامع الصحیح، کتاب الباس والزینة باب النساء الکاسیات العاریات حدیث نمبر3971۔

5-بنی اسرائیل32:16

6-ابن ماجہ،السنن کتاب الفتن باب العقوبات حدیث نمبر4009.

7-البخاری الجامع الصحیح کتاب الرقاق باب حفظ اللسان حدیث نمبر5993۔

8-الحجرات12:49

9-الطبرانی، معجم الاوسط باب العین حدیث نمبر6778

10-الحجرات13:49

11-البخاری الجامع الصحیح کتاب النکاح باب لا یخطب علی خطبة حدیث نمبر4747۔

12-الحجرات23:49

13-امام احمد بن حنبل،المسند،باقی مسند الانصار حدیث نمبر22391

14-بنی اسرائیل26:16

15-امام احمد بن حنبل، المسند، الانصار، حدیث معاذ بن جبل حدیث نمبر221089

16-الطبرانی، معجم الکبیر،حدیث نمبر1400

17-الترمذی السنن، کتاب الاحکام عن رسول اللہ باب ماجاء فی

الراشی والمرتشی۔

18-ابن ماجہ السنن مقدمہ فضل العلماء والحث علی طلب العطلم۔

19- آل عمران 110:3

20-التوبہ 71:9

21- مسلم الجامع الصحیح کتاب الامارۃ باب فضیلۃ الامام العادل حدیث نمبر 3408

زیرِ اہتمام: مرکز تحقیق ۔۔۔ فیصل آباد